اردو ادب (سہ ماہی)

شمارہ (۱، ۲) ۱۹۹۵ء

اردو ادب

(خاص نمبر)

اڈیٹر

خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلی

۱۹۹۵ء شمارہ (۱، ۲)

سالانہ قیمت	۷۵ روپے
فی شمارہ	۲۰ روپے

پرنٹر پبلشر ایم. حبیب خاں، اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) نے ثمر آفسیٹ پرنٹرس
نئی دلی میں چھپوا کر اردو گھر راؤز ایونیو نئی دلی سے شائع کیا۔

فہرست

حرف آغاز

ہماری کوشش رہی ہے کہ اہم موضوعات پر 'اردو ادب' کے خاص شمارے شائع کیے جائیں۔ لیکن کبھی کبھی عام شمارہ بھی ضروری ہے تاکہ اس طرح کے شماروں میں اہم مضامین شائع کیے جا سکیں۔ زیر نظر شمارہ بھی ایسا ہی ایک عام شمارہ ہے۔ اس میں چار مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون ویریندر پرشاد سکسینہ صاحب کا "اردو کے چند کرشن بھگت شعرا" کے موضوع پر ہے۔ اردو ادب اور خاص طور سے اردو شاعری میں کرشن جی کو بہت مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو اردو میں ہندو اوتاروں میں سب سے زیادہ کرشن جی ہی پر شعر کہے گئے ہیں۔ بقول سکسینہ صاحب:

"اردو کے پانچ سو سے زائد شاعروں نے غزل، قصیدے، رباعی اور مثنوی جیسی اصناف سخن میں کرشن جی کی مدح کی ہے۔"

کرشن جی کے مدح کرنے والوں میں ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی سب ہی شامل ہیں۔ اس کی غالباً وجہ کرشن جی کی 'گیتا' ہے۔ جس میں انسانی تاریخ کے عظیم فلسفے بیان کیے گئے ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے پاکستان کے ایک ممتاز ترین شاعر شان الحق حقی صاحب کا گیتا کا منظوم ترجمہ شائع کیا ہے۔ سکسینہ صاحب نے گیتا کے ترجموں اور کرشن جی کے مدح میں کہے گئے اشعار کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے اردو کے ہندو شاعروں کے ساتھ مسلمان شاعروں کے بھی وہ اشعار پیش کیے ہیں جو کرشن جی کی مدح میں کہے گئے تھے۔ مسلمان شاعروں میں نظیر اکبر آبادی، حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، آغا حشر کاشمیری، جعفر علی خاں، اثر لکھنوی اور سید محمود علی عرشی کا ذکر خاص طور سے کیا گیا ہے۔

دوسرا مضمون ڈاکٹر خلیل اللہ خاں کا "ریاض خیرآبادی کے اخبارات" ہے۔ ریاض خیرآبادی نے چار اخبارات جاری کیے تھے۔ اردو صحافت کی تاریخ میں ان اخباروں کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ افسوس ہے کہ ان میں سے بیشتر نام ہمارے ذہنوں میں محفوظ نہیں رہے۔ خلیل صاحب نے ان چاروں اخباروں کا خاصی تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور اس حیثیت سے انھیں غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ ان کی شخصیت کے کچھ اور بھی پہلو ہیں جن پر بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ وہ ایک فعّال اور مخلص انسان تھے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جیسے اہم ترین ادارے سے ان کا بہت گہرا تعلق تھا۔ انھوں نے اس ادارے کی میٹنگوں میں اکثر اہم تجویزیں پیش کیں، جن پر عمل کیا گیا۔ بعض اہم جلسوں کی صدارتیں کیں۔ اس کے علاوہ وہ دس گیارہ سال تک کانفرنس کے صدر رہے۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی نے ضیاء الدین صاحب کی ان خدمات کا بھرپور جائزہ لیا ہے جو انھوں نے کانفرنس کے لیے انجام دیں۔

ڈاکٹر شمس بدایونی نے جوش ملسیانی مرحوم کی کتاب "اقبال کی خامیاں" کا تعارف کرایا ہے اور اس کتاب پر اپنی رائے بھی پیش کی ہے۔ اس کتاب کا دلچسپ قصّہ ہے۔ یہ کتاب لکھی نہیں گئی تھی لکھوائی گئی تھی۔ اور اس کے لکھوانے والے جوش ملسیانی مرحوم کے شاگرد درد نکودری تھے۔ پہلے یہ کتاب قسط وار ہفت روزہ اخبار "پارس" لاہور میں شائع ہوئی۔ اور پھر جوش صاحب کی ہی زندگی میں چھپی۔ اس کا دوسرا اڈیشن ان کی وفات کے بعد ،، ۱۹ء میں اور تیسرا ۱۹۹۴ء میں چھپا۔ شمس صاحب نے غیر جانب دارانہ اور بہت عالمانہ انداز میں اس کتاب کا جائزہ لیا ہے۔

رفیعہ منظور الامین اردو کی مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ پچھلے دنوں ان کا ناول "فرمان" کے نام سے ٹی وی پر قسط وار پیش کیا گیا تھا اور اسے ایک بہت کامیاب سیریل سمجھا گیا تھا۔ یہ دراصل ٹی وی ہی کے لیے لکھا گیا ہے۔ آج کل اس کی فلم بنائی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے بہت ہی معقول انداز میں اس پورے ناول پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ تبصرہ گوڑ صاحب کے گہرے تنقیدی شعور اور ادب فہمی کا اعلا ثبوت ہے۔

خلیق انجم

ویریندر پرشاد سکسینہ

اردو کے چند کرشن بھگت شعرا

اردو میں کرشن بھگت شعرا کی تعداد نعت گو شعرا سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے لیکن ہمارے تذکرہ نگاروں اور ادبی مورخوں نے اب تک کرشن بھگت شعرا پر کوئی تحقیقی کام نہیں کیا ہے۔ اگر کرشن بھگت شعرا کی فہرست مرتب کی جائے جنھوں نے مرلی والے کی بھگتی میں مثنوی، غزل، قصیدہ اور رباعیات لکھی ہیں تو ان شعرا کی تعداد پانچ سو (۵۰۰) سے زیادہ ہو جائے گی۔ اردو کے تذکرے کرشن بھگت شعرا کے ذکر سے خالی ہیں۔ کیوں کہ جن بزرگوں نے یہ تذکرے لکھے تھے، ان کا کرشن بھگتی پر کوئی مطالعہ نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے کرشن بھگت شعرا کی خدمات کو فراموش کر دیا۔ اردو کی مقبولیت کا اندازہ کیجیے کہ منشی بنواری لال شعلہ کی "بزم بندرابن" "منشی گورسہائے ملتجی کا سُدامایرتر منظوم" اور کرشٹ نواز مرتبہ بابو اقبال بہادر اقبال ایڈوکیٹ اور دوسرے اردو شعرا کی نظمیں اب تک لاکھوں کی تعداد میں کرشن بھگت مندروں اور گھروں میں روزانہ پاٹھ کرتے ہیں۔ کرشن بھگتی پر اردو میں ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی سبھی نے نظمیں لکھی ہیں اور عقیدت کے پھول چڑھائے ہیں گیتا کے کم سے کم پچاس منظوم اور نثر میں ترجمے ہو چکے ہوں گے۔ ہندو ہی نہیں مسلمان شعرا میں الم مظفر نگری، اثر لکھنوی اور خواجہ دل محمد دل نے گیتا کے منظوم ترجمے کیے ہیں۔ جو شائع ہو چکے ہیں۔ گیتا کا ترجمہ نثر میں محمد اجمل خاں مرحوم نے کیا۔ جو شایع ہو چکا ہے۔ کرشن بھگتی کے سلسلے میں سنسکرت اور ہندی شاعری کی آواز سارے بھارت میں گونج رہی ہے لیکن اردو کی آواز بھی اس سلسلے میں کسی طرح ہندی اور سنسکرت سے کم نہیں ہے۔ جو حضرات اردو پر اکثر یہ اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ اردو میں ہندو کلچر نہیں ہے وہ اس وقت میرا یہ مقالہ ملاحظہ فرمائیں۔

کرشن بھگت شعرا میں منشی بنواری لال شعلہ کی شاہکار مثنوی "بزم بندرا بن" اردو ادب میں ایک یادگار کارنامہ ہے۔ اس مثنوی میں شعلہ کے وہ شاعرانہ نغمے ہیں جو انھوں نے مرلی والے کی بھگتی میں میرا بائی اور سورداس کے رنگ میں لکھے ہیں اس میں گوپیوں کے ہجر و غم، داس منڈل کی دل فریبیوں اور بنسی کی شیریں نوائیوں کے تذکرے ہیں جن کو پڑھ کر وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے لاکھوں کی تعداد میں کرشن بھگت اس مثنوی کا پاٹھ صبح و شام مندروں اور گھروں میں کرتے ہیں۔ "بزم بندرا بن" اردو مثنوی نگاری میں بھگتی اسکول کا آغاز کرتی ہے جس کے نمائندے برقؔ دہلوی، قہرؔ دہلوی، جگرؔ بریلوی، منورؔ لکھنوی وغیرہ ہیں۔ سورگیہ جگر بریلوی "یادرفتگاں" میں اس مثنوی کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں،

"شری کرشن جی کی بھگتی میں بالکل رنگ گئے۔ ڈوب ڈوب کے قلبی کیفیتوں اور حسن عالم افروز کی کرشمہ سازیوں کے ترانے سنانے لگے وہ ترانے جن پر روح وجد کرتی ہے اس رنگ کی آپ کی ایک مستقل تصنیف "بزم بندرا بن" ہے جسے پریم سے ہماری حرز جان بنائے رکھتے ہیں اور اس کے بعض حصوں کا بڑی عقیدت سے روزانہ پاٹھ کرتے ہیں۔ شاعری کے تمام جوہر اصلی آب و تاب کے ساتھ اس تصنیف میں نمایاں ہیں۔ جوش، رنگینی، مصوری برجستگی شدت و لطافت جذبات سبھی کچھ ہے۔ البتہ زبان میں ہندی کی آمیزش زیادہ ہے۔ "بزم بندرابن" کی ابتدا اس جوش سے ہوتی ہے جیسے پہاڑ سے آبشار ابلتا ہے۔"

اس مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں،

شری جگدیش بندرا بن بہاری	شری رادھا رمن مادھو مراری
شری گوبند رادھا کرشن گوپال	مدن موہن شری گھنشیام نند لال
شری مرلی منوہر شیام سندر	شری بھگوان گوپی ناتھ گردھر
شری جدوتپ شری بانکے بہاری	چتر بھج شیام مورت چکر دھاری
مکٹ دھاری مدن گوپال موہن	نول سندر چھبیلے لال موہن
تو ہی ہے حسن رخسار حقیقت	تو ہی ہے پردہ بردار حقیقت

تو ہی ہے جلوہ فرمائے دو عالم
تو ہی خود تماشائے دو عالم
تو ہی پروانہ تو ہی شمع محفل
تو ہی گلبن تو ہی شور عنادل
بت چت چور ماکھن کے لٹیرے
حیات و موت دونوں کھیل تیرے
نمود آفرینش ہے تجھی سے
وجود آفرینش ہے تجھی سے
الگ کب تجھ سے تیری گفتگو ہے
غرض اک تو ہی تو ہے تو ہی تو ہے

نظم جھانکی میں شعلہ نے مرلی والے سے درشن دینے کی تمنا اس صورت سے ظاہر کی ہے۔

کدم کی چھانو ہو جمنا کا تٹ ہو
ادھر مرلی ہو ماتھے پر مکٹ ہو
کھڑے ہوں آپ اک بانکی ادا سے
مکٹ جھونکوں میں ہو موج ہوا سے
کسی نازک کمر ہو کا چھن سے
بندھی بنی ہو جامہ کی تنی سے
بھری گجروں سے ہو نازک کلائی
بنے ہوں برگ گل دست حنائی
برابر ہوں شری رادھا کشوری
مدھر سُر بانس کی بجتی ہو پوری
تبسم ہو دم نظارہ باہم
عیاں اک چھب میں ہو حسن دوعالم
جدا ہوں گو برائے نام دونوں
بنے ہوں ایک رادھا شیام دونوں

بہم دیگر ہو عکس حسن زیبا
کنہیا رادھا ہوں رادھا کنہیا

منشی مہاراج بہادر برق دہلوی کا شمار بھی کرشن بھگت شعرا کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ انھوں نے کرشن بھگتی پر "کرشن درپن" جیسی شاہکار نظموں کا مجموعہ ۱۹۲۷ء میں شایع کرایا تھا۔ اس مجموعہ میں آٹھ نظمیں شامل ہیں جو کرشن بھگتی میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ برق کی یہ نظمیں کرشن بھگتی کے موضوع پر اعلیٰ نظموں کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور اپنے ایک مقالے "برق کی یاد میں" جو شعلہ و شبنم" کے مئی ۱۹۵۴ء کے شمارے میں شایع ہوا ہے اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"مگر کرشن جی پر برق کی جو نظمیں ہیں وہ اردو شاعری میں ایک بلند مقام رکھتی ہیں۔ نظیر سے لے کر اس دور تک کرشن جی پر بے شمار نظمیں کہی گئی ہیں مگر

مجھے ایک تو برق کی نظموں نے متاثر کیا اور دوسرے سیماب کی ایک نظم نے،
لطف یہ ہے کہ سیماب کی نظم پر برق کا صاف اثر محسوس ہوتا ہے۔ اول تو
وہ برق کی نظموں کے بعد کہی گئی ہے دوسرے اس میں برق کے اسلوب کا
تتبع بھی ہے۔"

"کرشن اوتار" نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مٹا نے ظلمت ہستی کو جلوہ بار آیا ۔۔۔ زمیں پہ حسن ازل ہو کے بیقرار آیا
نظر کو نور دلوں کو سرور دینے کو ۔۔۔ سحاب لطف و کرم برق در کنار آیا

مسرور عشق سے تھا ساقی ازل مسرور ۔۔۔ مے ظہور کا تھا دور حسن والوں میں
تجلی پاش تھا جھرمٹ میں گوپیوں کے وہی ۔۔۔ تھا ایک چاند کا جلوہ ہزار ہالوں میں

نوائے نے سے حقیقت کی ترجمانی کی ۔۔۔ کدم کی چھاؤں میں دی داد گلفشانی کی
فضائے دہر کو نغموں سے کردیا سرشار ۔۔۔ نسیم لطف چلی کیف جاودانی کی

بقدر ذوق دیا سب کو لطف جلوۂ دید ۔۔۔ نظر نوازئ تنویر روئے تاباں سے
جہان تازہ کو "گیتا" سے جلوہ زار کیا ۔۔۔ مٹائی تیرگئ جہل بزم امکاں سے

پنڈت یوگراج نظر سوہانوی مرلی والے کے وارد وشیدا تھے انھوں نے کرشن جی کے اپدیش کو عوام میں پھیلانے کے لیے براہ راست سنسکرت سے اردو نظم میں گیتا کا ترجمہ پنڈت مدن موہن مالویہ کی مدد سے مسلسل اٹھارہ ماہ کی ریاضت کے بعد "کلام ربانی" کے نام سے شایع کیا تھا۔ گیتا کے اٹھارہ ادھیائے ہیں اور نظر نے مثنوی کی بحر میں اٹھارہ ادھیائے ہی میں اس کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ پنجاب کے دیہاتوں، شہروں اور قصبوں میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے اشخاص اب بھی مل جائیں گے جو "کلام ربانی" کا پاٹھ باقاعدگی کے ساتھ کرتے ہیں۔ "کلام ربانی" کی اب تک پچاس ہزار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ "کلام ربانی" کے پہلے اڈیشن میں فارسیت کا زیادہ اثر تھا۔

اس ہے ہو گئے حضرت ہاشمی ملسیانی کے مشورہ سے نظر صاحب نے دوسرے اڈیشن میں خامیت کو دور کر دیا۔ نظر صاحب "کلام ربانی" میں ایک جگہ شری کرشن جی کے اپدیش کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

جان جاں جلوہ گر کون و مکاں — ہیں زبانِ پاک سے گوہر فشاں
صبر و بے خوفی و زہد و راستی — ضبط دل ضبط نفس ضبط خودی
پاک بازی پاک علمی راستی — رحم و بخشش عفو پر آمادگی
عاجزی و صلح و ترک خواہشات — ہمت و لطف و غنا و یاد ذات
نفس سنجیدہ مزاج بے ہمی — ترک دنیائے دلی و دشمنی
نیک ہندو کے یہی اوصاف ہیں — جن کے مثل آئینہ دل صاف ہیں

شری مد بھگوت گیتا کے ایک مشہور و معروف اشلوک کو نظر صاحب نے کس سلاست اور روانی کے ساتھ اردو نظم کے سانچے میں ڈھالا ہے۔

نیک بندوں کی بقا کے واسطے — خود پسندوں کی فنا کے واسطے
چاک کرنے کو لباس جور و کیں — پاک کرنے کو دل اہل یقیں
ہر زمن ہر دور میں اے حق نگر — قالب خاکی میں ہو کر جلوہ گر
رو نما ہوں گوہر انوار میں — کھولتا ہوں دھرم کے اسرار میں

حضرت جگر بریلوی کرشن بھگت تو نہیں تھے لیکن ان کے عقیدت مندوں میں تھے۔ ۱۹۴۰ء میں آپ نے ایک مثنوی "کرشن سداماں" لکھی جب آپ اپنے صاحبزادے پروفیسر من موہن رائے جاتی کے علاج کے سلسلے میں دہلی میں مقیم تھے۔ اس مثنوی میں بڑی سلاست اور روانی ہے اردو کی کوئی مثنوی کرشن سداماں کے قصہ پر اس کے مقابلے میں نہیں پیش کی جا سکتی۔ یہ مثنوی جگر بریلوی کے مثنویات کے مجموعہ "رنگ و بو" میں شامل ہے جو ۱۹۵۲ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا۔ مثنوی کرشن سداماں کی ابتدا مرلی والے کی یاد میں جگر بریلوی ان اشعار سے کرتے ہیں۔

ہے زباں پر کرشن کا نام آج — میں بھی گویا ہوں ایک صاحب تاج

پوچھنا کیا ہے بادشاہ ہوں میں — غیرت آفتاب و ماہ ہوں میں
دل میں صورت ہے مرلی والے کی — مے کی حاجت نہ اب پیالے کی
ہر قدم بے خودی کی راہ میں ہے — ہیچ عالم میری نگاہ میں ہے
ساتھ میخانہ سائے ہوں میں — مست و مخمور بے پیے ہوں میں
اب کہیں آسماں ہے نہ زمیں — کیف و مستی ہے اور کچھ بھی نہیں
زور پر اب کشش ہے منزل کی — کھل رہی ہے کلی کلی دل کی
زندگی ہو گئی مری مقبول — دامن دل ہے اور پھول ہی پھول
بانسری کی ہے گونج کانوں میں — زندگانی ہے میٹھی تانوں میں
سحر ہے سحر نغمۂ شیریں — وجد کرتے ہیں آسمان و زمیں
اور امرت سا پی رہا ہوں میں — آج سمجھا ہوں جی رہا ہوں میں
اس سعادت پہ کیا نثار کروں — آہ کیا نذر بارِ یار کروں
مال کیا شے ہے اور دولت کیا — میں بھی کیا اور مری حقیقت کیا
دل ہے کیا اور جان بھی کیا ہے — ساری دنیا جہان بھی کیا ہے

ہو کے خاموش سجدہ کرتا ہوں
دل میں رنگ نیاز بھرتا ہوں

سورگیہ چندر بھان کیفی کا شمار دہلی اسکول کے کرشن بھگت شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام "چمنستان کیفی" میں کئی نظمیں شری کرشن جی کے متعلق ہیں۔ شری کرشن جی کی یاد میں انھوں نے اپنی نظموں کا ایک مجموعہ ۱۹۳۸ء میں بھی شایع کرایا تھا لیکن وہ اب بالکل نایاب سا ہے۔ "بھگوان کرشن کے دربار میں" ایک چھوٹی سی نظم ملاحظہ فرمائیے۔

کیف زا ہے مدھ بھری آنکھوں میں پیمانہ ترا — بھر رہی ہے دم ازل سے بزم رندانہ ترا
ٹکٹکی باندھے ہوئے ہیں گوپیاں محو جمال — برج کی حیرت سرا ہے آئینہ خانہ ترا
تو ہے خود جس کا تماشا وہ تماشا گر ہے تو — اے فسوں گر کھیل ہے سب سے جداگانہ ترا
پردۂ پندار ان کے سامنے سے ہٹ گیا — حسن جن آنکھوں نے دیکھا بے حجابانہ ترا

وحدت وکثرت کی یکجائی ہے تیری ذات میں
کس قدر نیرنگ زا ہے حسن جانانہ تیرا
ہر مکھی کے ساتھ مجھ کو اس نے دکھلاس میں
یاد ہے کیفی کو اب تک رقص مستانہ ترا

سوریہ نند کشور اخگرؔ فیروز پوری نے "بھگوت گیتا کا منظوم اختصار، درس حیات" کے نام سے ۱۹۶۶ء میں شائع کرایا تھا۔ سوریہ اخگرؔ نے "بھگوت گیتا" کا منظوم اختصار اردو زبان میں پیش کر کے اردو داں طبقے اور اردو سے ذوق رکھنے والے گیتا پریمیوں کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کر دیا "درس حیات" میں دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ درس حیات میں "درس عمل" کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

رات دن شام و سحر جب تک ہے قائم زندگی
فرض کی تکمیل میں انساں نہ گھبرائے کبھی

یہ نہ لائے فکر دل میں اس کا کیا انجام ہے
فرض ادا کرتا رہے انساں کا اتنا کام ہے

راہِ حق میں ہر قدم پر ہمت مردانہ ہو
لاکھ طوفانِ الم اٹھیں کوئی پروا نہ ہو

جسم فانی ہے تو کیا غم روح مر سکتی نہیں
کوئی بھی طاقت اسے نابود کر سکتی نہیں

موت ہی ہے در حقیقت کاشفِ اسرارِ زیست
موت کا ڈر ہے عبث یہ ہے مآلِ کارِ زیست

کارزارِ دہر میں غافل نہ ہونا چاہیے
آفتوں کو دیکھ کر بے دل نہ ہونا چاہیے

فرض کی تکمیل میں خواہش نہ کچھ رکھے بشر
خلق کی خدمت گذاری ہی رہے مدِ نظر

جس بشر نے چھوڑ دی ہوں دل کی ساری خواہشات
دل ہی دل میں خوش رہے ہر وقت ہو کر محوِ ذات

دکھ سے گھبراہٹ نہیں سکھ سے جسے رغبت نہیں
دل میں کچھ خدشہ نہیں غصہ نہیں حسرت نہیں

نفس جس کے بس میں ہے جو خواہشوں سے دو نہیں
عقل پر قائم ہے وہ ہر حال میں مسرور ہے

بے غرض انسان جس کا دل ہوس سے ہے تہی
سب کو یکساں دیکھتا ہے دور ہے جس سے خودی

دل کی راحت اور اطمینان پا لیتا ہے وہ
ایشور کو جان کر نروان پا لیتا ہے وہ

حضرت لچھمن پرشاد صدر لکھنوی کا ذکر لکھنؤ اسکول کے کرسٹن بھگت شعرا میں قابل ذکر ہے۔ انھوں نے "سداماں" کے قصے کو مثنوی میں ۱۹۲۸ء میں نظم کیا۔ اس مثنوی کا ہر لفظ غیر منقوط ہے جو صفت غیر منقوط کا ایک شاہکار ہے۔ صدر مرحوم کی یہ مثنوی "سداماں" ادبی حلقوں میں مقبول ہے اس مثنوی کے علاوہ ۱۹۱۰ء میں صدر مرحوم نے دربار اکبری کے نورتن حضرت فیضی کے منظوم فارسی ترجمہ بھگوت گیتا کا اردو منظوم ترجمہ کیا جس کو ۱۹۶۲ء میں حضرت منور لکھنوی نے محبوب المطابع اردو بازار دہلی سے شایع کرایا۔ گیتا کے اس ترجمہ میں صدر مرحوم اتنے کامیاب ہوئے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے گیتا کے ادھیائے تیسرے کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمایئے :۔

لگے کہنے ارجن اگر ہے یہی
ہے تعلیم پھر کس لیے جنگ کی
یہ تاکید کیوں مجھ سے کرتے ہو آہ
کروں کوروؤں کی صفوں کو تباہ
پریشاں نہ مجھ کو کرو اے کرشن
خدارا خدا سے ڈرو اے کرشن
نہ ظاہر کرو مجھ سے خود مطلبی
کچھ اچھی نہیں گفتگو مکر کی
کچھ ایسی کرو رہنمائی مجھے
کر بخشے جو غم سے رہائی مجھے
کہا دو طرح کے ہیں فرقے یہاں
اک ارباب عرفاں اک اہل جہاں
ہیں اہل جہاں خود غرض لاکلام
بجز مکر جن کو نہیں کوئی کام
مگر عارفوں کو ہے اس کا خیال
سمجھتا ہے جس کا ہر اک کو محال

نہ جز نام حق ان کی پلٹے زباں — نہ جز یاد حق کچھ کریں ہر زماں
جہاں تک ہو مقدور کر نیک کام — حیات اپنی کر نیکیوں میں تمام
عمل سے ہوا آشکارا جہاں — عمل سے ہے دوزخ عمل سے جناں
عمل ہی سے بنتے ہیں اہل کمال — عمل ہی مٹاتا ہے سارے وبال
عمل چھوڑ جس وقت کاہل ہو تو — فراغت کر اعمال سے مو بمو
عمل کر عمل خام ہے تو ابھی — نہ چھوڑ اس کو ناکام ہے تو ابھی
کر اول عمل چھوڑ پھر سارے کام — میسر نجات اس سے ہو لاکلام
نہ کر ضبط جس کر سے ظاہرا — مگر دل سے کر صرف ہمت ذرا
خدا کے لیے ہو جو محو عمل — تو قرب اس کا پا جائے وہ بے دخل
کیا ہے عمل جس نے اپنے لیے — دل اپنا پھنسایا ہے اس شخص نے
ہے دشوار اس کو حصول مرام — کہ اس راہ سے دور ہے وہ مقام
عمل کر خدا کے لیے اختیار — جزائے عمل کا نہ ہو خواستگار

سرور جہاں آبادی نے بنسی والے کی یاد میں کئی شاہکار نظمیں لکھی ہیں لیکن کوئی نظم ان کے کسی مجموعۂ کلام میں شامل نہیں ہو سکی۔ اہل ذوق و ادب میں ان کی نظم "جمنا" بہت مقبول ہے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

یہ وہ جمنا ہے کہ رادھا سی حسین نے مدتوں — برج کی اک پاک دامن نازنیں نے مدتوں
بنسی والے کی جدائی میں اڑا کر سر پہ خاک — اپنے اشکوں سے کیا ہے دامن ساحل کو پاک
اب کہاں وہ کنج دلکش اب کہاں رادھا کا عیش — ہے بہ رنگ خندۂ گل بے بقا دنیا کا عیش
سوئے متھرا آہ لے چل میرے نالوں کے لیے — ارمغان عشق رادھا برج والوں کے لیے
تیرے دردانگیز نغمے ہیں جہاں گونجا کیے — سر کو ہیں دیوار قصر شہ سے ٹکرایا کیے
رو کے کہنا مرلی والے سے مرے سر کی قسم — تیرے غم میں اب بھی رادھا آہ ہے تصویر غم

پنڈت برج نرائن چکبست کی نظم "کرشن کنہیا" کرشن بھگتوں میں بہت مقبول ہے اس نظم کا ترجمہ ہندوستان کی ہر علاقائی زبان میں ہوا ہے۔ "کرشن کنہیا" نظم کے تین بند

ملاحظہ فرمایئے۔

آج کی رات کا دنیا کے لیے کیا ہے پیام — حسن قدرت کا سرِ شام سے ہے جلوۂ عام
نور برساتے ہیں تاروں کے چھلکتے ہوئے جام — بن گیا بزم طرب ہستیِ عالم کا نظام
فرشِ راحت پر اگر آنکھ جھپک جاتی ہے
بانسری کی میرے کانوں میں صدا آتی ہے

چھا گیا ابر برسنے کو ہیں مینہ کے جھالے — آپ ہی آپ ہوئے جاتے ہیں دل متوالے
آنکھ کہتی ہے یہ بادل نہیں کالے کالے — بال کھولے ہوئے ہیں سالونی صورت والے
کشتیٔ فکر بہی جاتی ہے جمنا کی طرف
دل مرا کھینچ رہا ہے مجھے متھرا کی طرف

راہ تاریک ہے اور سر پہ گرج بادل کی — ڈونگڑا مینہ کا ہے بوندیں نہیں ہلکی ہلکی
شوخ و طرار و حسین چھوکریاں گوکل کی — چلی آتی ہیں صراحی لیے جمنا جل کی
دل لڑکپن کی امنگوں پہ مچل جاتا ہے
کھلکھلا پڑتی ہیں جب پاؤں پھسل جاتا ہے

شریمتی کشن پیاری سورگیہ منشی رام سہائے تمنا لکھنوی کی اہلیہ تھیں۔ کرشن بھگتی اور رام بھگتی پر آپ کا مجموعۂ کلام "نغمۂ دل بہار" آپ کی حیات میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اتر پردیش میں استریاں آپ کی کرشن بھگتی پر غزلیں اور گیت اب بھی مرلی والے کی یاد میں گھروں اور مندروں میں گاتی ہیں۔ ایک غزل ملاحظہ ہو۔

کرشن جی میرے دل کی صدا سنو تو سہی — غم فراق کی بھی کچھ کتھا سنو تو سہی
سنا کیے ہو بہت گوپیوں کے تم شکوے — ہمارا حال بھی اے جاں ذرا سنو تو سہی
بٹھا کے گھر میں سدا ماں کا حال زار سنا — ہمارا دور ہی سے مدعا سنو تو سہی
کیا جو وعدہ وہ کرتے ہو کیوں نہیں پورا — دکھاتے کیوں نہیں بانکی ادا سنو تو سہی
دکھا دو آکے درس اپنا ہم کو راد ھے شیام
یہ کشن پیاری کی ہے التجا سنو تو سہی

سورگیہ پنڈت نندلال طالب کاشمیری کے مجموعہ "رشحات التخیل" اور "مرقع افکار" میں کرشن بھگتی پر کئی نظمیں شامل ہیں۔ یہ نظمیں ہمیشہ کرشن بھگتوں میں یادگار رہیں گی۔ "جنم اشٹمی" کی نظم کے دو بند سنیئے کیسی عقیدت مندانہ انداز میں کہتے ہیں۔

جنم اشٹمی

وہ آفتاب دوجہاں ظہور ذات پاک کا
وہ ماہتاب ضو فشاں شہو تاب ناک کا
وہ بیکسوں کا چارہ گر وہ گمرہوں کا رہنما
وہ رشک نور ہر سحر وہ شام دلربا ادا

جہاں میں جب ہوا عیاں

جہاں میں جب ہوا عیاں سرور بخش رات میں
ہوا ہوئیں سیاہیاں تمام کائنات میں
سحاب ظلم چھٹ گیا ضیائے حق چمک اٹھی
وفور شوق بڑھ چلا فضائے دل مہک اٹھی

جہاں میں جب ہوا عیاں
وہ دل نواز بے بدل

سورگیہ پنڈت میلارام وفا نے کرشن بھگتی پر کئی لاجواب نظمیں لکھی تھیں جو ان کے مجموعہ کلام "سوز وطن" اور "سنگِ میل" میں شامل ہیں۔ کرشن بھگتی پر وفا کی نظم "بھارت ماتا کی فریاد بھگوان کرشن کے دربار میں" ایک زمانہ میں بہت مقبول تھی۔ کاکوری کیس (CASE) کے شہید راجیندر لہری جس وقت جیل میں یہ نظم ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے۔ تو چاروں طرف قیدیوں کا ہجوم اکٹھا ہو جاتا تھا اور ان میں وطن پرستی کے جذبات پیدا ہو جاتے تھے نظم ملاحظہ فرمائیے۔

بھارت ماتا کی فریاد

(بھگوان کرشن کے دربار میں)

نمایاں بحر و بر میں، خشک و تر میں تیرے جلوے ہیں — دیا ہے نور تو نے چاند سورج اور تاروں کو
ترے پانے کو کرتے ہیں زمین و آسماں گردش — سکونِ قلب ملتا ہے تجھی سے بے قراروں کو
نظر آئی نہ جب آفاق میں امید کی صورت — تو ڈھارس دے گئی ہے تیری یاد آفت کے ماروں کو

معاون بیکسوں کا بے بسوں کا ہے سہارا تو
کہاں رکھتا ہے مظلوموں کی مظلومی گوارا تو

مجھے بھولا نہیں وہ منظرِ دربارِ دریودھن — در و دیوار سے جب ہر طرف حسرت ٹپکتی تھی
اتارے جا رہے تھے دروپدی کے جسم سے بستر* — وہ دل ہی دل میں کڑھتی تھی مگر کچھ کر نہ سکتی تھی
اٹھاتی تھی کبھی دستِ دعا گردوں کی جانب وہ — کبھی بھیم اور ارجن کی طرف حسرت سے تکتی تھی

کرم اس وقت اس بیکس کی حالت پر کیا تو نے
بھری محفل میں آخر اس کا پردہ رکھ لیا تو نے

مصیبت آپڑی ہے دروپدی کی طرح مجھ پر بھی — رہینِ کلفت و رنج و غم و افکار میں بھی ہوں
مری عزت پہ بھی اہلِ جفا نے ہاتھ ڈالا ہے — اسیرِ پنجۂ اعدائے ناہنجار میں بھی ہوں
محافظ کوئی میرا بھی نہیں اب آہ دنیا میں — بہت مجبور میں بھی ہوں بہت ناچار میں بھی ہوں

مری فریاد بھی سن پیکرِ فریاد ہوں میں بھی
مری امداد بھی کر طالبِ امداد ہوں میں بھی

سوز گیہ منور لکھنوی کرشن بھگت تو نہیں لیکن سوز گیہ جگر بریلوی کی طرح ان کے عقیدت مند ضرور تھے۔ آپ نے بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ مثنوی گلزار نسیم" کی بحر میں ۱۹۳۶ء میں پہلی بار شائع کیا اور ملک کے بلند پایہ ادیبوں نے اسے بھگوت گیتا کا سب سے بہترین ترجمہ قرار دیا۔ اس کا دوسرا اڈیشن ۱۹۵۵ء میں چھپا اور مشورہ بکڈپو والوں نے بھی اس کا ایک ستا اڈیشن شائع کیا۔ بھگوت گیتا کے ترجمہ کے علاوہ منور صاحب نے کرشن بھگت شاعر اعظم جے دیو کے گیت گو بند" کا بھی منظوم ترجمہ کیا جو شائع ہو چکا ہے۔ "بھگوت گیتا" کے ترجمہ کی طرح یہ منظوم ترجمہ بھی اردو ادب

---

* بستر: کپڑے

میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ سورگیہ منور لکھنوی کے مجموعۂ منظومات "کائناتِ دل" میں بھی کرشن بھگتی پر نظمیں ہیں۔ کرشن بھگتی پر منور صاحب کی ادبی خدمات کو اردو سے ذوق رکھنے والے کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ "نیم عرفان" کے سلسلہ میں علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی رقم طراز ہیں

"نیم عرفان کو ایک ہیرا ایک کوہِ نور پاتا ہوں۔"

"نیم عرفان" میں سے پہلا ادھیائے کے چند اشعار راجا دھرتراشٹر کا وزیر سنجے سے خطاب ملاحظہ فرمائیے۔

میرے لایق وزیر سنجے   میرے قابل مشیر سنجے
سجودِ انام ہے کورو کھشیتر   پاکیزہ مقام ہے کوروکھشیتر
پانڈو دل ہے جہاں صف آرا   لشکر ہے پڑا جہاں ہمارا
ہیں آپ تو مخزنِ کمالات   فرمائیے کچھ وہاں کے حالات

سنجے کا جواب پانڈو کی طاقت کے بارے میں یہ تھا۔

دریودھن فخر دودماں نے   شہزادہ منزلت نشاں نے
دیکھی پانڈو کی دل میں جب فوج   پایا اسے بحر موج در موج
درونا چاری کے پاس جاکر   سر پاؤں پہ عجز سے جھکا کر
لب تر کیے شربت سخن سے   جھڑنے لگے پھول یوں دہن سے
میرے مخدوم میرے سرتاج   پانڈو کی ملاحظہ ہوں افواج
فرزند درو پد کماندار   سرلشکر جاں سپار و جرّار
شاگرد حضور! آپ کا ہے   اس شمع میں نور آپ کا ہے
حامی ہو کر غنیم کا آج   ہے مائل انتظام افواج

بھیم و ارجن کی طرح جرّار   ہے فوج عدو کا ہر کماندار
بازو یہ یودھان کے قوی ہیں   آئینہ شانِ صفدری ہیں
ویراٹ جبری قوی توانا   پہنے ہے بہادری کا بانا

دروپد کا خاندان ممتاز　　مشہور ہے اک جہاں میں جانباز

دی مرتبہ دھرشٹ کیتد سردار　　ہے آگر فنِ حرب و پیکار
بے مثل ہے چیکتان کی شان　　کیا عرض ہو اس جوان کی شان
سلطان کاشی کا ہے وہ ذی جاہ　　ہیں شیر بھی اس کے آگے روباہ
ہیں پرجیت و شیبہ جنگ میں فرد　　کنتی بھوج ایک ہے جواں مرد

سردار جری یدھا منیو ہے　　جانباز دلیر جنگجو ہے
ہے مرد شجاع اتمو جس　　جس کے آگے ہے موت بے بس
ہیں خوب پسرِ سبھدرا کے　　چھکے جو چھڑا گئے ہیں قضا کے
چھوٹے والے بڑے دلاور　　بیٹے ہیں دروپدی کے صفدر

سور گیہ گو رسہائے ملتجی اردو کے ان کرشن بھگت شعرا میں سے ہیں جن کا ہمارے ادب میں خاص مرتبہ ہے اور کرشن بھگتی پر انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ خاص کیفیت کے ساتھ کہا ہے۔ ملتجی کا سلسلہ چرتر منظوم اور ان کی کرشن بھگتی پر نظمیں اور غزلیں سارے بھارت میں مقبول ہیں۔ ملتجی کے "سداماں چرتر" منظوم کا لوگ مندروں اور گھروں میں پاٹھ کرتے ہیں۔ اردو اور ہندی زبان میں کوئی "سداماں چرتر" منظوم کے مقابلہ میں نہیں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے کم سے کم پچاس سے زیادہ اڈیشن اردو اور ہندی میں شائع ہو چکے ہیں۔ ملتجی نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ متھرا، بندرابن، ماجودھیا، دوارکا، بنارس اور اڑیسہ کے علاقہ میں کرشن بھگتی کے پرچار میں لگا دیا اور یہ پرچار انھوں نے اردو نظم ہی کے ذریعہ کیا تھا مرلی والے کی بھگتی میں بالکل رنگ گئے تھے۔ میرا بائی اور سورداس کی طرح کرشن بھگت ان کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ اردو کے کرشن بھگت شعرا میں بنواری لال شعلہ زیادہ شہرت حاصل کر چکے ہیں لیکن ملتجی نے جس رنگ میں اردو و فارسی اور ہندی میں غزلیں لکھی ہیں۔ وہ ہمارے ادب میں ایک عمدہ اضافہ ہیں۔

جب سداماں جی دوارکا کے قریب پہنچتے ہیں تو ملتجی کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

صبا صبحِ سعادت ہے مسافر کو خبر کر دے
کہ اب شام غریبی پر فدا رخت سفر کر دے

بنا دے گوہر درج شرف اشک ندامت کو
جو اب خشک سے اپنے وہ جس کی چشم تر کر دے

زر گل سے خزانہ بھر دیا جس نے گلستاں کا
وہ منعم عندلیب بے نوا کو بہرہ ور کر دے

نہ ہو گردوں نشینوں سے کسی کو فیض دنیا میں
جو وہ خورشید ذروں کو نہ اپنے جلوہ گر کر دے

جمالِ یار آئینہ ہے جب دیکھے اسے دیکھے
ادھر سب کچھ نظر آئے وہ رخ اپنا جدھر کر دے

سداماں کی طرح ہو ملتجی بھی ہمدم عشرت
وہ شاہِ دوارکا جس دم ترحم کی نظر کر دے

سداماں کا اپنے مکان پر پہنچنا اور حیرت سے اس کے ساز و سامان کو دیکھنا اس وقت ملتجی نے جو غزل کہی ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

بسایا باغباں نے ہر طرف گل سے مکاں اپنا
چمن میں ڈھونڈھتا پھرتا ہے بلبل آشیاں اپنا

صبا بلبل سے کہہ دے گوش گل در پردہ سنتے ہیں
کرے گل غنچۂ منقار سے راز نہاں اپنا

نہ گذرے کامیابی سے جو پہنچے یار کے در تک
جہاں سے فیض کیا ہوتا نہیں کوئی جہاں اپنا

رعایت سر بلندوں کی روا ہے خاکساروں سے
برابر سایہ رکھتا ہے زمیں پر آسماں اپنا

جو ہر دم ہر جگہ پر ملتجی کی یاد کرتا ہے
اسی سے کام ہے ہم کو وہی ہے کامراں اپنا

موسیلا کا مجبور کرنا سداماں کو جانے اور بیان کرنا اوصاف سری کرشن چندر کے چند بند ملاحظہ فرمائیے۔

میں یہ سنتی ہوں کہ ہیں کرشن کنہیا داتی
کوئی داتا نہیں کونین میں ان کے ثانی

وہ مہاراج مہا لچھمی ہیں ان کی رانی
ان سے اور آپ سے ہے رابطۂ روحانی

ایسے غمخوار تمہارے وہ تم ایسے کنگال
کیوں نہ حیرت ہو بھلا اوروں کو اور مجھ کو ملال

سید کہتے ہیں کہ نردھن کے ہیں دھن گردھاری ... سچدانند شگن برمھ ہیں منگل کاری
چشمۂ فیض دو عالم میں ہے ان کا جاری ... سبزہ ہوتی ہے سخاوت کی سدا پھلواری

کوئی اس باغ سے محروم نہیں آتا ہے
پھول لینے کوئی جاتا ہے تو پھل پاتا ہے

کرشن بھگوان مجسم ہیں سراپا ہمہ نور ... نام جدونندن و جدناتھ ہے ان کا مشہور
صفت فیض عیاں ہے کہ بالطاف و نور ... دور و نزدیک خبر لیتے ہیں بھگتوں کی ضرور

آپ یہ حال زبوں ان کو جو دکھلائیں گے
جلد ایام مصیبت کے پلٹ جائیں گے

سورگیہ کھنولال تائب لکھنوی کا شمار اردو کے کرشن بھگت شعرا میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے انھوں نے بنسی والے کی بھگتی پر اردو نظم میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ پانچ سو صفحات کا ایک مجموعہ شایع کیا جا سکتا ہے۔ کرشن بھگتی پر ان کی نظموں کے چار چھوٹے چھوٹے مجموعے بھی شایع ہو چکے ہیں ایک غزل ملاحظہ فرمایئے۔

وہ اٹھانا انگلی پہ گر للا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو ... وہ گھمنڈ اندر کا توڑنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہمیں وہ ہی دن میں بھلا دیا نہیں تم میں یوگیٔ کچھ دیا ... ہمیں اب بھی وہ ہی مات تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
تمھیں لا کے گھر میں نچاتی تھی جو نہ ناچتے تھے کھجاتی تھی ... یہ ہے دو ہی دن کا معاملا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
للا مائی کھاتے تھے جب کبھی تمھیں مارتی تھیں جسوداجی ... اسے برج سارا جانتا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جراسندھ آ کے تھا جب لڑا تب ہی تو بسائی ہے دوارکا ... ہمیں یاد ہے وہ ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی نار تم کو بناتی تھی تمھیں اپنا ڈنڈیا اوڑھاتی تھی ... ہے وہ روپ آنکھوں میں پھر رہا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کسے شیام ناگ نے کاٹا تھا اسے کس نے جاتے ہی جھاڑا تھا ... کرے تائب اس کو بیاں کیا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سورگیہ گور سہائے آشنا بھی کرشن بھگت شاعر تھے اور تمام زندگی مرلی والے کی یاد میں لکھتے رہے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ان کو لینے گو پیاں جانے کو ہیں ... آج سنتے ہیں کہ ہر آنے کو ہیں
ہر بھجن میں جن کا من لگتا نہیں ... یہ سمجھ لو کچھ وہ دکھ پانے کو ہیں

کہیں کیا ہر کی مایا ہے کہاں تک — نظر آئی وہی دیکھا جہاں تک
ہے مانع کون ہر آئیں تو یاں تک — رہیں دل میں جگہ پائیں جہاں تک

اور دیوانہ بنا دیتی ہیں تانیں ان کی — یاد جب شیام کی آتی مدھر گانے کی
گوپیاں کہتی ہیں جمت سے نہ برجوان کو — بالکوں کی تو ہے عادت ہی مچل جانے کی

سورگیہ گردھاری لال استدانادی نے ہمت ۱۹۲۱ بکرمی میں "سداماں چرتر" کو "منظوم فرخ" کے نام سے اردو زبان میں نظم کیا تھا۔ ادبی حیثیت سے یہ مثنوی اردو ادب میں ایک کامیاب اضافہ ہے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

سداماں تھا حقیقت میں برہمن — برنگ گل جہاں سے پاک دامن
گلستاں قناعت کا تھا وہ گل — بہار گلشن صبر و توکل!
سراپا شکل سوزن تھا وہ عریاں — تعلق سے جہاں کے پاک داماں
یہاں تک پیرہن سے تھا شکستہ سار — کہ رکھتا تھا فقط ایک تار زنار

سورگیہ موہن لال حقیر شاہجہانپوری کا شمار بھارت کے صفِ اول کے اساتذۂ سخن میں ہوتا تھا۔ گیتا کا منظوم ترجمہ اردو مثنوی "گلزار نسیم" کی بحر میں کیا تھا ترجمہ سے استادانہ شان ٹپکتی ہے۔ سورگیہ جگر بریلوی کے کتب خانہ میں میرٹھ میں یہ نسخہ اب بھی محفوظ ہے۔

سورگیہ رائے بہادر شنکر دیال نگار لکھنوی نے بھگوت گیتا کو "گنجینۂ معرفت" کے نام سے اردو مسدس میں نظم کیا تھا یہ منظوم ترجمہ ۱۹۳۱ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا تھا نگار سے پہلے مسدس میں گیتا کو کسی نے منظوم نہیں کیا تھا۔ مناجات کے چند بند ملاحظہ فرمائیے۔

اے سری کرشن مہاراج مری ہے یہ دعا — دل میں ہو جوش طبیعت میں ہو وہ زور عطا
اور خامے میں مرے ہو وہ روانی پیدا — تاکہ اردو میں کروں نظم میں بھگوت گیتا

کاش ہو جائے مرے دل کا جو ارماں پورا
میں یہ سمجھوں مری قسمت کا ستارا چمکا

قالب و روح کا ہر مسئلہ کرتا ہے بیاں　　زیست و مرگ کے عقدہ کو بھی کرتا ہے عیاں
پردۂ غیب میں جو جو کہ ہیں راز پنہاں　　نظم میں ان کا بیاں ہو یہ نہیں ہے آساں

جو سداماں کی ہیں بگڑی کو بنانے والے
میری مشکل میں وہی کام میں آنے والے

اسی تمہید سے بھگوان اٹھاتا ہوں قلم　　آپ کے قدموں میں کرتا ہوں سرِ عجز کو خم
اسی قدر آپ سے ہے میری گذارش ہر دم　　لفظ نکلے جو زباں سے نہ ہو گوہر سے وہ کم

میرے لفظوں کے معانی میں ہوں پنہاں جوہر
سننے والوں کے جو دل پر کریں جادو کا اثر

شبِ تاریک میں جیسے ہو ستارہ روشن　　آتش گل سے بھڑک اٹھتا ہے جیسے گلشن
رات میں جس طرح پرتاپ ہوں لولوئے یمن　　ایسے ہی چمکیں جہاں میں میرے درہائے سخن

بانسری کی ہو وہ سُر راگ میں میرے پیدا
جس سے گوکل کے کنہیا پہ تھیں گوپی شیدا

مولانا حسرت موہانی مرحوم العشق ہو اللہ والحسن ہو الحق کے مسلکِ تصوف کے پیرو تھے اور بنسی والے کو مظہر شان خدا سمجھتے تھے۔ مدحت شری کرشن جی میں سورگیہ بنواری لال شعلہ کے ہمنوا ہے۔ سورگیہ دیا نرائن نگم کے ساتھ ہر سال برج بھومی میں جاکر حاضری دیتے تھے اور شری کرشن جی کے اظہار عقیدت میں اردو ہندی نظم یا غزل ضرور پیش کرتے تھے۔ کچھ اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

عرفان عشق نام ہے میرے مقام کا　　حامل ہوں کسی کے نغمۂ نے کے پیام کا
متھرا کہ نگر ہے عاشقی کا　　دم بھرتی ہے آرزو اسی کا
تم بن کون سنے مہاراج　　راکھو بانہہ گہے کی لاج
من موہن سنیام سے نین لاگ　　نسدن سلگ رہی تن آگ

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ "نغمۂ جاوید" کے نام سے ۱۹۴۵ء میں ملک کے سامنے پیش کیا اور ملک نے اس منظوم ترجمہ کی بڑی قدر کی تھی۔

صدر جمہوریہ ہند نے ۱۹۶۱ء میں پدم بھوشن کا خطاب بھی گیتا کے منظوم ترجمہ پر دیا تھا "نغمہ جاوید" کے شروع میں کرشن جی کے متعلق جو نظم ہے اس کی زبان تقریباً ہندوستانی ہے۔ "محبت کی مرلی" ان کی ایک شاہکار نظم ہے۔ جو تیج کے جنم اشٹمی نمبر ۱۹۲۶ء میں چھپی تھی یہ نظم بہت مقبول ہوئی اور متعدد ہندی اور اردو کے اخباروں اور رسالوں میں نقل ہوئی تھی۔ اثر مرحوم کی ایک نظم "گوپیوں کا پریم" "کشٹ نوارن" نامی کتاب میں شامل ہے جس کے مرتب اقبال بہادر اقبال ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ہر وقت یہ بنسی کا بجانا نہیں اچھا — بیرن کو میرے منہ سے لگانا نہیں اچھا
جاتر سے تھے بہت شیام اسی سے ملی کو بری — سچ کہتے ہیں حسد کا بھی سیانا نہیں اچھا
ماکھن تمھیں کھاتا ہے تو ہم دیتے ہیں کھالو — نند لال جی گورس کا چرانا نہیں اچھا
سدھ بھول گئے نند جسودھا کی بھی موہن — ہاتھوں سے لکیروں کا مٹانا نہیں اچھا
متھرا کا ملا راج تو بس پھر گئیں آنکھیں — کنگال کو دولت کا بھی پانا نہیں اچھا

چت چورے کہو یہ اثر کہتی تھی سکھیاں
من موہ کے یہ آنکھ پھرانا نہیں اچھا

مولانا ظفر علی خاں مرزا داغ کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ ہندو کلچر پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ مولانا کے دل میں شری کرشن جی مہاراج کا بہت احترام تھا فرماتے ہیں۔

شری کرشن کا میں احترام کرتا ہوں — اور اس میں روز نیا اہتمام کرتا ہوں
وہ جور و ظلم کی بنیاد ڈھانے آیا تھا — میں اسی کی رسم کو دنیا میں عام کرتا ہوں

سو رگیہ جواری لال شعلہ کی طرح سو رگیہ بابو تھمبو دیال سرشار سہارنپوری نے بھی مرلی والے کی بھگتی میں بہت کچھ منظوم لٹریچر اردو زبان کو دیا ہے۔ ان کے ایک مخمس "گلہائے عقیدت" کے آخری دو بند ملاحظہ فرمائیے۔

مصائب کے بھنور میں گھر گئی ہے زندگی میری — ہوئی جاتی ہے بوجھل بار عصیاں سے مری کشتی
قسم ہے لے دیا ساگر تمھیں اپنی کریمی کی — مرا بیڑا بھی کر دو پار سن رکھا ہے میں نے بھی

وہ کشتی پار ہو جاتی ہے جس کے ناخدا تم ہو

چاہا جس نے تمہارا نام دل سے دیو کی نندن | بنے بگڑے ہوئے سب کام اس کے دیو کی نندن
مجھے کیا غم ہے دنیا میں ہیں میرے دیو کی نندن | زمانہ کچھ بھی سمجھے تم کو سمجھے دیو کی نندن

مگر سرشار کی نظروں میں تو پرماتما تم ہو

پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی متصوفانہ کلام اور متصوفانہ زبان کے دلدادہ تھے۔ کیونکہ انھوں نے سورگیا امرناتھ ساحر دہلوی اور سورگیہ پنڈت دینا ناتھ معجز کی صحبت کا اثر قبول کیا تھا۔ زار صاحب نے شریمد بھگوت گیتا اور شری اشٹاوکر گیتا کا اردو نظم میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ اگر یہ دونوں گیتا کے منظوم ترجمے شایع ہو جائیں تو ہمارے ادب میں ایک اضافہ ثابت ہوں گے۔ زار صاحب کی نظم "شری کرشن جنم اشٹمی" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آج برندابن میں ہے جشن ظہور حسن ذات
اشٹمی بھادوں کی آئی ہے یہ خوشنودی کی بات

جب ہوئے خاکی بدن میں رونما فخر حیات
ہو گئیں شیر و شکر جان و جگر ذات و صفات

کرشن تھے سولہ کلا اوتار اس برہمانڈ میں
آستی گاتے ہیں ان کی عارفان شش جہات

چھو کے قدموں کو ہوئی پایاب جمنا اس قدر
پار دریا کے ہوئے خدام شاہ کائنات

کوئی پوچھے یہ سداماں سے کہ سچے بھگت کی
کس طرح مفقود ہو جاتی ہیں ساری گلشہات

سورگیہ پنڈت ہری چند اختر غزل اور نظم دونوں میں یکساں قدرت رکھتے تھے۔ مرلی والے کی عقیدت میں غزلیں اور نظمیں دونوں کہی ہیں ان کے مجموعہ کلام "کفر و ایمان" میں سے ایک چھوٹی سی نظم "گوکل کی شام" ملاحظہ فرمایئے۔

گوکل کے جھونپڑے ہیں جمنا کا ہے کنارا | اے دیدۂ تصور کر لے پھر اک نظارہ
مغرب میں رفتہ رفتہ اک شام بن رہی ہے | پریوں کی ہنر وادی گلفام بن رہی ہے

سیندور مل لیا ہے دھرتی نے جبیں پر
جمنا نے اوڑھ لی ہے اک سرخ زرد چادر
پچھم سے آرہی ہیں مستی بھری ہوائیں
پورب پہ چھا رہی ہیں نیلو فری گھٹائیں
سبزہ لہک رہا ہے کلیاں چٹک رہی ہیں
گوکل کی چھوٹی چھوٹی کلیاں مہک رہی ہیں
کھیتوں سے آرہی ہیں کچھ رس بھری صدائیں
اک کیف سرمدی سے معمور ہیں فضائیں
چھوٹا سا اک لڑکا بنسی بجا رہا ہے
الفت کے بھولے بسرے نغمے سنا رہا ہے
پیغام برگلوں کے مے میں بسے ہوئے ہیں
یعنی ہوا کے جھونکے لے میں لیے ہوئے ہیں
کچے گھروں کے باہر کچھ گوپیاں کھڑی ہیں
اک دو یہاں کھڑی ہیں اک دو وہاں کھڑی ہیں
یہ بھولی بھولی شکلیں یہ منتظر نگاہیں
یہ گرم گرم آنسو یہ سرد سرد آہیں
کیوں ہوک اٹھ رہی ہے آرام کیوں نہیں ہے
شام آگئی ہے لیکن گھنشام کیوں نہیں ہے

اے بے وقوف اختر دکھڑے ہیں یہ پرانے
یہ بھید کون سمجھے۔ یہ راز کون جانے

سید محمود علی عرشی اجمیری درویش صفت اور صوفی منش انسان تھے۔ ہندو اوتاروں پر کئی نظمیں لکھی تھیں۔ ان کی نظم "جنم اشٹمی" راجستھان کے کرشن بھگتوں میں بہت مقبول ہے۔ نظم ملاحظہ فرمائیے۔

جنم اشٹمی

برج سے اٹھی سروں پر چھا گئی کالی گھٹا
کرشن بھگتی کا سبق سکھلا گئی کالی گھٹا
پھر بدری بھادوں کی آئی رین اندھیاری ہوئی
جنم کی گوپال کے گھر گھر میں تیاری ہوئی
سج گئے موہن کے مندر آرتی جاری ہوئی
آرتی ہی سے اٹھ کر چھا گئی کالی گھٹا
وہ سدرشن چکر کی سی جوت دکھلاتی ہوئی
اور مینہ گنگا جلی کا سب پہ برساتی ہوئی
گیت گیتا کے رسیلے موہنے گاتی ہوئی
پریم کی مرلی بجاتی آگئی کالی گھٹا
جب لیا بھگوان نے متھرا میں آٹھوں کو جنم
مٹ گئے ان کی دیا سے کنس کے ظلم و ستم
آسماں سے جھک کے چومے چاند تاروں نے قدم
چرن مرلی دھر کے دھونے آگئی کالی گھٹا
ڈالی بجلی کا جنیؤ اور اٹھلائی ہوئی
اور بجاتی گھن گرج کا سنکھ لہراتی ہوئی

منتروں کا جاپ کرتی آرتی گاتی ہوئی — کرشن کے درشن کی خاطر آ گئی کالی گھٹا
یہ اثر رکھتے ہیں موہنی کرشن سیوک کے بھجن — جھومتا ہے جن کو سن سن کے ہر اک پیارا بھجن
اور کہتے ہیں بھگت گوپال کے ہو کر مگن
سن کے تیرے گیت لے وہ آ گئی کالی گھٹا

نظیر اکبر آبادی نے مرلی والے کی یاد میں کئی شاہکار منظومات لکھی ہیں۔ اپنی شاعری کے ذریعہ آگرہ اور متھرا کے علاقوں میں کرشن بھگتی کا پرچار عوام میں کیا تھا۔ نظیر کی نظم کرشن کنہیا کا بال پن " کرشن بھگتوں میں امر ہے۔ ایک دوسری نظم "کرشن کنہیا کی بانسری" کے دو بند ملاحظہ فرمایئے؛

جب مرلی دھر نے مرلی کو اپنی ادھر دھری — کیا کیا پریم پریت بھری اس میں دھن بھری
لے اس میں رادھے نام کی ہر دم بھری کھری — لہرائی دھن جو اس کی اِدھر اور اُدھر دری
سب سننے والے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کرشن کنہیا نے بانسری

کتنے تو اس کے سننے سے دھن ہو گئے دھنی — کتنوں کی سدھ بسر گئی جس دم وہ دھن سنی
کتنوں کی من سے کلی گئی اور بیا کلی چنی — کیا نر سے لے کے ناریاں کیا کوڑھ کیا گنی
سب سننے والے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کرشن کنہیا نے بانسری

پنڈت اندرجیت شرما نے کرشن کنہیا کی یاد میں ایک مجموعہ گیتوں اور نظموں کا شایع کیا تھا لیکن اب کہیں دیکھنے میں نہیں آتا مجموعہ کا نام "کرشن دھیان درپن" تھا۔ یہ مجموعہ احسن المطابع میرٹھ سے شایع ہوا تھا۔ "کرشن جی کی بانسری" ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

ہنگامۂ ہستی میں شورش سے بری تو تھی — چھل بل تھی چھلاوا تھی جادو کی پری تو تھی
نغمے ترے ڈوبے تھے سب سوز محبت میں — تھے دائرۂ عالم کے یعنی وہ حقیقت میں
اک وجد کا عالم تھا محفل میں جو بجتی تھی — انبار تھے کشتوں کے جب دن میں گرجتی تھی
گونجے تھے ترے نغمے جمنا کی فضاؤں میں — بکھرے ہوئے ذروں میں سنسان ہواؤں میں
ہر راگ سے تیرے تھا اک رنگ نیا پیدا — ہر رنگ پہ مرتے تھے دنیا میں ترے شیدا

افسوں کی تو لکڑی تھی اک آگ بھری نے تھی
ہر دل کو جو تڑپا دے کیا تھی وہ تری نے تھی

جو تیری صدائیں تھیں الہام کی تھی باتیں
ظاہر میں تو باتیں تھیں باطن میں کراماتیں

انسان ترے نغمے کو اک بار جو سنتا تھا
ناگن کی طرح ہر کو مستی میں وہ دھنتا تھا

بھائی تھی دل جاں سے وہ تیری ادا
تسخیر جو کرتی تھی پل بھر میں دو عالم کو

انصاف کی دنیا میں تھی تجھ سے ہی آبادی
تو رحم کی دیوی تھی الطاف کی شہزادی

دنیا میں تو آئی تھی تصویر وفا ہو کر
ظلمت کدہ میں بیٹھی تنویر ضیا ہو کر

سورگیہ ستیہ پرکاش مہتاب پسروری نے گیتا کا ترجمہ ہندوستانی نظم میں کیا تھا جو ۱۹۶۴ء میں شایع ہوا تھا۔ یہ منظوم ترجمہ مسدس میں ہے۔ سورگیہ مہتاب سے پہلے نگار لکھنوی نے گیتا کا ترجمہ مسدس میں کیا تھا سورگیہ مہتاب کا ترجمہ ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا تھا۔ سورگیہ مہتاب کے ترجمہ کے سلسلے میں سورگیہ جگر بریلوی کی رائے ملاحظہ ہو۔

"آپ کی گیتا ہندوستانی نظم کو میں نے کہیں کہیں سے پڑھا آپ نے عطف واضافت استعمال نہ کرنے کا التزام کر کے ایک بہت بڑی ہم سر کر لی جس نے آپ کے منظوم ترجمہ کو دوسرے منظوم ترجموں کے مقابلہ میں ایک نئی جگہ دے دی ہے۔"

گیتا کے ادھیائے دوسرے یعنی سانکھیہ یوگ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دل میں ارجن کے دیا آنکھوں میں آنسو دیکھ کر
پھر مدھو سودن یہ بولے اے بہادر اے نڈر

تو تو چھتری ویر ہے کائر بنا کیوں اس قدر
بات یہ شوبھا نہیں ہے آریوں کو بے خبر

جنگ سے جو بھاگتا ہے نرک میں جاتا ہے وہ
روز پھر اپنے کیے پر آپ پچھتاتا ہے وہ

اے دلاور ویر تجھ میں بزدلی کیوں آگئی
ویرتا سے کام لے تو یدھ کی ہے اب یہ گھڑی

جنگ کو تیار ہو تو چھوڑ کر یہ بزدلی
پھر مدھو سودن سے اتنی بات ارجن نے کہی

جنگ کرنے آئے ہیں بھیشم درونا چاریہ
کس طرح سے میں چلاؤں تیر اب ان پر بھلا؟

ان بزرگوں سے لڑوں میں مجھ سے یہ ہوگا نہیں ۔ ہے یہ بہتر مانگ کر میں بھیک دنیا میں کہیں
کاٹ لوں گا چار دن کی زندگانی ہے یقیں ۔ خون سے تر ہو گئی گر کرکشیتر کی زمیں
پاپ ان کے خون کا کیوں کر نہ ہوگا پھر مجھے ؟
اور پھر یہ پاپ بھی مجھ کو پڑیں گے بھوگنے

اے مدہوسودن نہ مجھ پر راز یہ اب تک کھلا ۔ میں لڑوں یا بھیک مانگوں کس میں ہے میرا بھلا
جنگ میں ہو فتح کس کی ؟ میں نہیں یہ جانتا ۔ ان سبھی کو مار کر جینا نہیں میں چاہتا
سامنے کورو کھڑے ہیں مجھ سے خود لڑنے کو آج
ہر طرح تیار ہیں یہ مارنے مرنے کو آج

منشی گوپال سہائے شری واستو اردو کے قابل ذکر کرشن بھگت شعرا میں سے ہیں۔ انھوں نے مرلی والے کی بھگتی میں دو منظوم کتابچے "عرضداشت" اور "نالۂ نیم شبی" شائع کرا کے کرشن بھگتوں میں مفت تقسیم کیے تھے۔ "عرضداشت" زمانہ پریس کانپور سے سورگیہ منشی دیا نرائن نگم کے اہتمام سے شائع ہوئی اور "نالۂ نیم شبی" ابوالعلائی اسٹیم پریس آگرہ سے حافظ فیاض الدین کے اہتمام سے "نالۂ نیم شبی" کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

اے شب ماہ میں بنسی کے بجانے والے ۔ سونے والوں کو بیاباں میں بلانے والے
رشک صد بزم ارم داس رچانے والے ۔ جاں فزا شربت دیدار پلانے والے
دینا درشن مجھے بنسی کے بجانے والے

اے گوبردھن سر انگشت اٹھانے والے ۔ جاں نثاروں کو مصیبت سے بچانے والے
اندر مغرور کی نخوت کو مٹانے والے ۔ قدرت اعلیٰ کا نیرنگ دکھانے والے
دینا درشن مجھے بنسی کے بجانے والے

بن میں گووں کو ہری دوب چرانے والے ۔ بیٹھ کر گوالوں میں نونیت کے کھانے والے
شک جو برہما کو ہوا تھا وہ مٹانے والے ۔ برج گولوک کی تفریق ہٹانے والے

دینا درشن مجھے بنسی کے بجانے والے

شہرۂ حسن تھا یا سحر تھا یا جادو تھا جس کو منکر ہوئی کیف ول کیا ہے کیا
تازیانہ سا پڑا رخشِ جنوں پر گویا اب کہاں چین طبیعت میں ہے بے نظارا

دینا درشن مجھے بنسی کے بجانے والے

بے نیازی تری گو خاص نہیں ہے عام جس کی اکثر کیا کرتے ہیں شکایت ناکام
مجھ کو شکوہ و شکایت نہ گلہ سے ہے کام ہے مگر وردِ زباں یہ ہی مرے صبح و شام

دینا درشن مجھے بنسی کے بجانے والے

نسبت خاص تھی ازلی وہ مرے ساتھ آئی وہ ہی دل وہ ہی جگر پہلو بھی وہ ہی لائی
آکے اس عالم امکان میں عجب رنگ لائی نیم کشش تیرا ہوا دل کی نہ کچھ برائی

دینا درشن مجھے بنسی کے بجانے والے

سورگیہ منشی رام بہادر لال جوؔیا انولوی نے شری کرشن جی پر پندرہ بیس نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن ان کے مجموعۂ کلام "سروِ چراغاں" میں صرف دو ہی نظمیں شامل ہیں۔ اگر اردو کے کرشن بھگت شعرا کا کوئی تذکرہ شائع کیا جائے گا۔ تو اس میں جوؔیا انولوی کی نظموں کا شامل ہونا ضروری ہوگا۔ ایک چھوٹی سی نظم "گوپال اور گودھن" سنیے۔

کرشن! تیری بانسری کی وہ صدائیں اب کہاں برج منڈل کی وہ بھارت میں ہوائیں اب کہاں
روگ بھارت کا مٹا دینے کا جن کو ناز تھا وہ معالج اب کہاں ہیں وہ دوائیں اب کہاں
دودھ کی دھاروں کے بدلے ہے چھری کی دھار آہ دور دورہ ہے جفاؤں کا وفائیں اب کہاں
اب نہ گائیں برج کی ہیں اب نہ تیرے گوال بال گیت اے گوپال تیرے گائیں گائیں اب کہاں
کنج گلیوں میں چلے کوئی صبا ہو یا نسیم دامن گوپال کی لیکن ہوائیں اب کہاں
وہ تری کملی کا سایہ وہ کرم کی چھاؤں آہ! برج کی اے برج نندن وہ لتائیں اب کہاں
برج رج جمنا کا جل مرلی کی دھن مدھ بن کی دوب کرشن کے باغ شبابی کی فضائیں اب کہاں

کوہکن کو حکم جوئے شیر جوؔیا کون دے
ہم نشانِ مرقد شیریں کو پائیں اب کہاں

سو گیہ مہاراجہ کشن پرشاد شاد نے "جلوۂ کرشن" کے نام سے شری کرشن جی کے ابتدائی حالات زندگی ۱۳۴۷ھ میں اردو مثنوی میں نظم کرکے اردو دنیا کے سامنے پیش کیے۔ اس مثنوی کے مطالعہ کے بعد پتا چلتا ہے کہ مہاراجہ شاد کو شری کرشن جی مہاراج سے کتنی محبت جذبہ و عقیدت تھی۔ اس مثنوی کے متعلق مولانا سید علی حیدر نظم طباطبائی مرحوم فرماتے ہیں۔ "اردو زبان اس تصنیف پر ناز کرے تو بجا ہے۔" ظہور و نور یعنی کرشن جی کی ولادت کے اشعار ملاحظہ ہو۔

اٹھی ہے گھٹا وہ کالی کالی — پگڑی کسی کی رند نے اچھالی
متھرا کی سیاہ کاریوں پر — گرنے کو ہے برق قہر دادار
ایوان ہے دیو کی کا زنداں — دھڑکے میں ہے واسدیو کی جاں
راجہ کو خبر پہنچ چکی ہے — امید سے رانی دیوکی ہے
اس حمل میں آٹھواں پسر ہے — اب راجا کی جان کا خطر ہے
بیتاب ہوا یہ سن کے راجہ — دیوانوں کی طرح اچھلا کودا
تازے ہوئے ظلم کے ارادے — چاہا کوئی داغ پھر نیا دے
قدرت کا تھا انتظام کچھ اور — قسمت کا تھا اہتمام کچھ اور
تقدیر کی طاقت اور کچھ تھی — تدبیر کی حکمت اور کچھ نہ تھی
تھا بے خبر انتقام حق سے — جاگا گیا رات بھر قلق سے
لو آلیا وقت نور چمکا — وہ سر جھکا لوح پر قلم کا
چھائی ہے اندھیرے میں وہ زردی — بدلی ہے گھٹا نے کالی وردی
نقارۂ رعد بج رہا ہے — بادل اٹھ کر گرج رہا ہے
ہشیار کہ شیر کی ہے آمد — عالم کے دلیر کی ہے آمد
بنیاد ستم کی ڈھانے والا — احکام خدا سنانے والا
پیدا ہوا پیشوا مبارک — پورا ہوا مدعا مبارک
اغیار کی آنکھ سے بچاؤ — نظروں سے ہر ایک کی چھپاؤ
گلچیں کی کہیں نظر نہ لگ جائے — اس گل کی مہک الگ جائے

مولود کی دیو کی سے لے کر
راہی ہوئے واسدیو مضطر

وہ رات اندھیری اور وہ تنہا
بھادوں کا مہینہ ابر چھایا

دریا پہ جو پہنچا وہ بہادر
دامن میں چھپائے ہے بہادر

جمنا اس قدر جوش پر تھی
طوفاں کی صدا خروش پر تھی

وہ اس کی روانی اور وہ دھارا
آتا ہی نہ تھا نظر کنارا

یہ دیکھ کر واسدیو کھٹکا
بھگوان کا نام لے کر اترا

قدرت کا یہ انتظام دیکھا
فطرت کا یہ اہتمام دیکھا

پھیلا ہوا دامن اس کا سمٹا
پایاب ہوئی سمٹ کے جمنا

جمنا میں چلا وہ بے تکلف
تھا یہ بھی کرشن کا تصرف

موہنی نرنشی سورگیہ پنڈت کرتا کشن ٹکو کی صاحبزادی ہیں جو اردو کے بلند پایہ ادیب تھے۔ موہنی نرنشی کا مجموعۂ کلام "پھول اور کانٹے" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس میں نظمیں اور غزلیں دونوں ہیں۔ کرشن بھگتی پران کی ایک نظم "جنم اشٹمی" پیش کرتا ہوں۔

آج رہ رہ کر دہن میں گو تڑپتی ہے زباں
کرشن کی توصیف کی مجھ میں بھلا طاقت کہاں

دیوتا کے گن کوئی انسان گا پاتا نہیں
بند کوزے میں کبھی دریا کیا جاتا نہیں

یاد پر تیری دلوں میں اب بھی آہی جاتی ہے
اک یہی پونجی نظر بھارت میں اب بھی آتی ہے

گردشِ دنیا سے جب انساں کوئی گھبرا گیا
چھاؤں میں گیتا کے تیری صدق دل سے آ گیا

نقش دل پر جس گھڑی وہ پند تیرا ہو گیا
کھل گئیں آنکھیں وہیں گویا سویرا ہو گیا

جب حقیقت کھل گئی تو پھر غم دنیا کہاں
جب خودی ہی مٹ گئی تو پھر کہاں قید جہاں

سورگیہ لکشمی نرائن جوہر بدایونی شری کرشن جی مہاراج کے عقیدت مند تھے۔ آپ نے مجموعۂ کلام "آئینۂ جوہر" کا انتساب بھی مرلی والے کے چرن کملوں میں۔ صد احترام کیا تھا۔ سورگیہ جوہر نے بھگوت گیتا کو اردو مثنوی میں نظم کیا تھا لیکن یہ منظوم ترجمہ شائع نہ ہو سکا۔ "ویرابھمنو" کے تاریخی قصہ کو

سورگیہ تو تہر نے مسدس میں استادانہ شان سے پیش کیا ہے۔ ابھمنو کی اہلیہ سبھدرا ابھمنو کی لاش کے پاس بیٹھی ہے۔ شری کرشن جی آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تین بند ملاحظہ فرمایئے :

یہ کہہ کے بیکسی میں بغرطِ غم و ہراس — اک سرد آہ بھر کے اٹھائی نگاہ یاس
دیکھا تو سر جھکائے کسی فکر میں اداس — غمگین سے کھڑے ہیں دیا سندھو اپنے پاس
نظر ملیں تو اور بھی بھڑکی جگر کی آگ
اشکوں سے یوں بجھائی دلِ پُرشرر کی آگ

کہنے لگی کہ آپ کے ہوتے جناردن — دم بھر میں لٹ گیا مرا پھولا پھلا چمن
جی کس کا لاؤں کون سے ہاتھوں سے دوں کفن — سونی پڑی ہوئی ہے امیدوں کی انجمن
شاید ہماری شام الم کی سحر نہیں
یا بیکسوں پہ شیام تمہاری نظر نہیں

سن کر اسیر یاس سے یہ شکوہ برملا — جنبش ہوئی لبوں کو کہا کیوں سبھودرا
وہ چندر بنشی جوشِ شجاعت کہاں گیا — کیا راجپوتی خون بدن میں نہیں رہا
آنسو بہا کے رنج دکھانا عوام کو
بدنام کر رہا ہے بزرگوں کے نام کو

سورگیہ اقبال بہادر اقبال ایڈووکیٹ کاپنور نے "گسٹ نوارن" کے نام سے کرشن بھگتوں کے لیے اردو میں ایک منظوم کتاب ترتیب دی تھی۔ اس کتاب کے چھ اڈیشن شایع ہو چکے ہیں اس کتاب میں شعلہ علی گڑھی ملتجی اور دوسرے کرشن بھگت شعرا کا کلام شامل ہے جس کو مندروں اور گھروں میں لوگ پاٹھ کرتے ہیں۔ اقبال بہادر اقبال کی کرشن بھگتی پر ایک نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

مکٹ دھر مال دھر گر دھر مُراری — ترے دربار میں آیا بھکاری
لگا کر کان سن بتیا ہماری — یہی ہے آرزو بانکے بہاری

سلہ بھگوان کرشن — سلہ بھگوان کرشن

ہر واے کرشن سنکٹ بیگ میری
لگائی کیوں مری کارج میں دیری

لیا اوتار اک زنداں کے اندر　　اسے روشن کیا اور نند کا گھر
دلِ تاریک میں تھا کس کے ڈر　　کیا جو کچھ کر تم نے وہ ہے اظہر

ہر واے کرشن سنکٹ بیگ میری
لگائی کیوں مری کارج میں دیری

بجا کر بانسری برج کو رجھایا　　کر ناچے آپ اور سب کو نچایا
ہر اک کے گھر میں جا ماکھن چرایا　　جو کھایا کھا لیا باقی لٹایا

ہر واے کرشن سنکٹ بیگ میری
لگائی کیوں مرے کارج میں دیری

سورگیہ پنڈت امر ناتھ ساحر دہلوی نے اپنے کلام کے ذریعہ فلسفہ کی باریکیاں اور تصوف و معرفت کے رمز و نکات بیان کیے ہیں۔ فیضی کی گیتا اور وشنو پران کا بھی آپ نے اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ کرشن بھگتی پر آپ کی کافی تعداد میں نظمیں شایع ہو چکی ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ الگ مرتب کیا جا سکتا ہے۔

محمد اسحاق الم مظفر نگری مرحوم نے فیضی کی گیتا کا منظوم ترجمہ "آہنگ سرمدی" کے نام سے کیا تھا۔ جو مکتبہ "برہان" دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔ الم مرحوم کا ترجمہ مثنوی میں ہے اور اسی بحر میں ہے جس میں فیضی کا ترجمہ ہے۔ الم مرحوم نے یہ منظوم ترجمہ کر کے کرشن بھگتوں اور گیتا پریمیوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ الم مرحوم کا نام بھی مرلی والے سے عقیدت رکھنے والے شعرا میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

پنڈت دینا ناتھ معجز دہلوی نے گیتا کا ترجمہ "مخزن الاسرار" کے نام سے کیا تھا۔ سورگیہ معجز کے اس ترجمہ سے استادانہ شان اور کہنہ مشقی ٹپکتی ہے۔ سورگیہ معجز کا ترجمہ "مخزن الاسرار" اور شری کرشن جی

لہ جلدی

بہ ان کی نظمیں ہندوستان میں بہت مقبول ہیں۔ گیتا کے بعض عقیدت مندوں کا یہ خیال ہے کہ "مخزن الاسرار" کا بہتر ترجمہ اردو اور دوسری ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں اب تک نہیں ہوا ہے حضرت ابوالحسنی گنوری صاف طور پر کرشن جی کو اوتار مانتے تھے مرحوم کے نزدیک اوتار کے معنی رسول یا پیغمبر کے ہیں۔ جس کو انھوں نے اپنی بعض تصنیف میں علی الاعلان کرشن علیہ السلام لکھا ہے۔ چند حضرات نے ان پر اعتراض کیا تو "قرآن شریف" کی اس آیت سے انھوں نے جواب دیا۔

"ہم نے ہر قریہ میں اپنے رسول بھیجے۔"

اس آیت کو پیش کر کے انھوں نے پوچھا کہ بتاؤ کہ ہندوستان جو ایک چھوٹا براعظم ہے اسے آپ قریہ کے برابر بھی مانتے ہیں یا نہیں اگر مانتے ہیں تو بتائیے کہ یہاں کون کون پیغمبر یا جب کہ پیغمبر اپنی تعلیم سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کا جواب کسی کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ کرشن جی کا احترام ویسا ہی کرتے ہیں جیسا کہ دوسرے اوتاروں یعنی رسولوں کا اور قرآن شریف کی اس آیت کا حوالہ دیتے تھے

"تم رسولوں میں کوئی فرق نہ کرو"

جو شخص کرشن جی کا اتنا احترام کرتا تھا اس کا کلام مرلی والے کے سلسلے میں کتنا پر خلوص ہوگا ان کی ایک نظم کے کچھ شعر سنیے۔

وادیٔ گوکل پہ ہے کالی گھٹا چھائی ہوئی
بارشِ عرفاں کی ہے گویا خبر آئی ہوئی

معرفت کے حوصلے بالیدہ بالیدہ سے ہیں
جہل عالم کے قدم لغزیدہ لغزیدہ سے ہیں

شرک و بے دینی کو اپنی موت کا ہوتا ہے شک
رونما ہے پردۂ کثرت سے وحدت کی جھلک

ہر پریشانی پشیماں ہے خود اپنی آن پر
امن عالم ناچتا ہے بانسری کی تان پر

آرہا ہے کون آزادی کا یہ پیغامبر
کنس کے زنداں کے تالے گر رہے ہیں ٹوٹ کر

اتنا لکھنے کے بعد کچھ تاریخی اشارے
کس حسن سے کر رہے ہیں

اس کے چند شعر اور سن لیجیے۔

آرہی ہے غیب سے آواز یہ انصاف کی | بزم میں ننگی نہ ہوگی اب کوئی بھی دروپدی
اب زمانہ میں جوئے کا دور آسکتا نہیں | کوئی دریودھن کسی کا حق دبا سکتا نہیں
مفلسی کا اب زمانہ میں نہیں ہوگا گذر | چرخ سے ٹکرائیں گے لاکھوں سداماؤں کے گھر

فائدہ بیجا کوئی ظالم اٹھا سکتا نہیں
اب کسی ارجن کو ان پر رحم آ سکتا نہیں

غرض پوری نظم میں عجب والہانہ جوش اور زور بیان ہے۔

ورگیہ رام سہائے تمنا لکھنوی کا شمار دبستان لکھنؤ کے صف اول کے شعرا میں ہوتا ہے ۱۹۱۳ء میں "بھگوت گیتا منظومہ تمنا مع گیتا ماتم وکرشن دھیان درپن" مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے شایع ہوکر اردو دنیا میں مقبول ہو چکی ہے۔ بھگوت گیتا منظوم کا خاتمہ ان اشعار پر تمنا نے فرمایا ہے۔

سدا شیو یہ تمنا دم بدم ہے | دل مغموم خواہان کرم ہے
دم مشکل کروں فریاد کس سے | کہوں حال دل ناشاد کس سے
تمھیں سے مطلب دل ہے میسر | تمھیں سے لطف کامل ہے میسر
تمھیں سے عقدۂ امید ہے حل | تمھیں سے رتبۂ کمتر ہے افضل
میں ہوں دنیا میں ناچیز و گنہگار | نہیں تم سا کوئی اپنا مددگار
کرو سامان عشرت مجھ کو موجود | ملے فرط کرم سے نقد بہبود
بلائے غم سے دنیا میں رہوں دور | مگر دل عیش و عشرت سے ہو مسرور
جہاں میں نیک نامی ہو میسر | رہے شاہد طرب کا زینت بر
یہی ہو دل سے ہے امید غمناک | گناہوں سے رہے دامن مرا پاک
زمانے میں ہیں جتنے دوست واحباب | رہے گلزار مقصد ان کا شاداب

تمنا کی تمنا ہے یہی اب
ملے فرط کرم سے نقد مطلب

گیندن لال سبے تو اہیلی بھیتی نے رام چرت مانس کا ترجمہ لفظ بہ لفظ آٹھ کانڈوں میں اردو میں

نظم کیا تھا اور سداما ن چرتر جس میں ۱۰۱ بند ہیں اردو مسدس میں شایع ہو چکا ہے۔ اس کی پہلی اشاعت فروری ۵ ۱۹۰ء میں نامی پریس لکھنؤ سے ہوئی تھی۔ ملتجی کا سداما ن چرتر مسدس میں ہے لیکن بے نوا کا سداما ن چرتر اردو مسدس میں ایک یادگار کارنامہ ہے۔ سداما ن نے تھک کر ایک باغ میں دم لیا۔ بے نوا صاحب فرماتے ہیں۔

تھکاوٹ کے سبب اس باغ میں جاتے ہی نیند آئی ۔ مقدر نے بھی کروٹ لی تھی ۔ ۔ ۔ نے انگڑائی
مٹی ادبار کی ظلمت ہوئی جب نور آرائی ۔ بہاروں نے کیا سجدہ محبت نے جبیں سائی
اُٹھ جھٹ پٹ سداماں آنکھ مل کر دست حیرت سے
تو دیکھا دوارکا میں آگئے ہیں فیض قدرت سے

تعجب تھا کہ کیسے دوارکا میں آ گئے اڑ کر ۔ پے پرواز کس نے دیدیے مجھ بے نوا کو پر
اتنی دور کی منزل کا آخر کون ہے رہبر ۔ نہ جانے کب کرم فرما گیا کوئی کرم گستر
بس دیوار ایواں باغ میں پر کس طرح آیا
حقیقت ہے کہ کوئی خواب کے عالم کی مایا ہے

سداما کرشن جی کی تعریف کرتے ہیں، بے نوا نے کیا خوب فرمایا ہے۔

تمھیں ہو نغمۂ بلبل تمھیں شور عنادل ہو ۔ تمھیں گل ہو تمھیں کانٹا تمھیں گلشن تمھیں گل ہو
تمھیں راہ منازل ہو تمھیں حسن منازل ہو ۔ تمھیں کشتی تمھیں دریا تمھیں دریا کا ساحل ہو
تمھیں ہو رونق دنیا تمھیں ہو حسن مےخانہ
تمھیں ساقی تمھیں میکش تمھیں ہو جام و پیمانہ

سورگیہ رادھے شیام رستوگی احقر لکھنوی اردو فارسی اور انگریزی کے عالم تھے۔ دبستانِ لکھنؤ کے کرشن بھگت شعرا میں آپ کا ایک مرتبہ تھا کرشن بھگتی کا پرچار اپنی نظموں اور کلام کے ذریعہ لکھنؤ کے دور دراز علاقوں میں کیا تھا۔ آپ کی کرشن بھگتی کی نظموں کا مجموعہ "شمیم عرفاں" کے نام سے ۱۹۶۹ء میں نامی پریس لکھنؤ سے شایع ہوا تھا۔ اس پر پیش لفظ لکھتے ہوئے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی سابق صدر شعبۂ اردو فارسی لکھنؤ یونیورسٹی فرماتے ہیں۔

"خدا کرے آج کل کی ناسازگار مادہ پرست فضا میں پروفیسر رستوگی صاحب

کی منظوم عقیدت اور نصائح سے گراں بار شمیم عرفاں عقیدت مندوں کے مشام جاں کو معطر و معنبر کرنے میں کامیاب رہے۔"

کرشن چندر کو بھجو نظم کو ملاحظہ فرمائیے،

فراخ چشم شیام رنگ برج کے ہیں وہ چندرما
مٹائیں دکھ کو سکھ وہ دیں بھولا پہ کرتے ہیں دیا
جگت پتی وہ شاہِ حسن وہ جہاں کا آسرا
سکھوں کے اصل راز ہیں برہم دائم البقا
کرشن چندر کو بھجو کرشن چندر کو بھجو

فدا ہے کام دیو بھی وہ حسن لاجواب ہے
سخا بھی بے شمار ہے کرم بھی بے حساب ہے
پناہ رہے جسم پر مکٹ بھی انتخاب ہے
وہ گوپیوں سے کھیلنا بھی اررہ صواب ہے
کرشن چندر کو بھجو کرشن چندر کو بھجو

فروغ حسن میں ہوا جو منھ پہ رج لپیٹ لی
گئو چرائیں بن میں جب مدھر بجائیں بانسری
نظر گوال بال کی چرن کمل میں ہے لگی
دیا وہ نور گیان کا کہ ہر طرف ہے روشنی
کرشن چندر کو بھجو کرشن چندر کو بھجو

وہ آئے اس جہاں میں تو لطف بے شمار ہے
زمیں کا بار اتارنے کا جو انھیں بچار ہے
تو قتل آمروں کا پھر قطار در قطار ہے
دھرم جہاں میں چھا گیا دھرم پہ سب نثار ہے
کرشن چندر کو بھجو کرشن چندر کو بھجو

رہس کیا تو گوپیوں میں بے خودی سی آ گئی
جگر میں بانسری کی تان اتر گئی سما گئی
لبوں کی وہ مدھر ہنسی فریفتہ بنا گئی
شمیم ہی شمیم ہے جو کل فضا میں چھا گئی
کرشن چندر کو بھجو کرشن چندر کو بھجو

اٹھایا کوہ انگلی پر یہ کس قدر کمال ہے
مدد کوئی نہیں بچا ہر ایک پائمال ہے
محافظ اس کے ہیں سدا جو کوئی خستہ حال ہے
ہیں خود مرید بھگت کے یہ کیا عجب حال ہے
کرشن چندر کو بھجو کرشن چندر کو بھجو

کریں بہار گنج ہیں ہر ایک دل میں جانشیں
خلا میں ہیں ملا میں ہیں وہ ہر مکاں میں ہیں مکیں
اگرچہ رنگ شیام ہے مگر ہیں کس قدر حسیں
مدن نثار اُن پہ ہے مدن سے ان کا خوشہ چیں
کرشن چندر کو بھجو کرشن چندر کو بھجو

آغا حشر کاشمیری صف اول کے ڈرامہ نگار ہونے کے علاوہ اردو کے خوش فکر شاعر تھے۔ ہندی زبان پر پوری دسترس تھی۔ شری کرشن جی پر آپ کا ایک گیت ملاحظہ فرمایئے:

سانورا ہنسی والا نند لالہ متوالا
یاں گوکل کا اجیالا
کرشن کرشن کر ساتھ سکارے
کرشن نام سب کا دکھ ٹارے
بار لگانے والا نرالا متوالا
یاں گوکل کا اجیالا

کوئی کہتا ہے کرشن مراری
کوئی کہتا ہے شیام بہاری
کوئی کہے نٹور گردھاری
یاں گوکل کا اجیالا

"مدھر مرلی" ملاحظہ فرمائیے۔

بجائے بنسری نند لالہ گوکل کا اجیالا
پلائے پریم رس کا پیالہ بانکا متوالا
مرلیا پیاری بولے
بول بھولے بھولے
کانوں میں امرت گھولے
پیران کنہیا میں ڈولے
ہاں بجائے بنسری نند لالا
گوکل کا اجیالا

جناب راجیندر ناتھ سکسینہ بسمل شمس آبادی کے تین مجموعے "گل صحرا" "زخم نہاں" اور "رستے چھالے" منظر عام پر آچکے ہیں۔ رام بھگتی اور کرشن بھگتی پر آپ کی شاہکار نظمیں اردو ادب میں حیات جاوید کا امتیاز حاصل کر چکی ہیں۔ جو ان کے تینوں مجموعۂ کلام میں شامل ہیں۔ کرشن جنم مسدس کے چار ابتدائی بند ملاحظہ فرمائیے۔

تھا دیوکی کی آٹھویں اولاد سے جو ڈر
کہتا تھا دل ہی دل میں یہی کنس خیرہ سر
تھا ہوا اس کا وقت ولادت تمام اگر
پہونچا سکے گا دوسرا کوئی نہ پھر ضرر
کرنے کو راہ زیست سے اس خار غم کو دور
بس دیو ودیوکی کو کیا قید بے قصور

پہرہ لگا دیا در زنداں پہ معتبر
فرمان تھا کہ آئے نہ جائے کوئی بشر
ہونے کی طفل نو کی جو دے گا مجھے خبر
انعام پائے گا وہ بہت مال سیم وزر

جس دن بجھے گی پیاس میری اس کے خون سے
سچ تو یہ ہے کہ ہوؤں گا اسی دن سکون سے

آئی گھڑی امید کی جس دم قریب تر — دونوں پہ اور کنس نے کر دی کڑی نظر
دنیا کو حال زار کی ان کے نہ تھی خبر — معبود سے دعائیں وہ کرتے تھے ہر پہر

مرضی تری نہیں تو ہمیں زندگی نہ دے
داغ فراق آل مگر جیتے جی نہ دے

کتنا عجیب ہے یہ جہاں کا طریق و طور — کچھ سوچتا ہے آدمی ہوتا ہے پر کچھ اور
دیکھے کوئی نظام دو عالم اگر بغور — قدرت کو بھی قبول نہیں بیکسوں پہ جور

بے جا ستائے جاتے ہیں جب بھگت دم بہ دم
لیتا ہے ظالموں کے مٹانے کو وہ جنم

اگرچہ میں نے متعدد ہندو مسلمان کرشن بھگتوں کا اس مقالہ میں ذکر کیا ہے لیکن یقین کیجیے کہ یہ تعداد بالکل ایسی ہے جیسے خرمن سے چند دانے اٹھا لیے جائیں یا دریا سے ایک چلو پانی۔ اگر میں تمام کرشن جی کے مداحوں کا ذکر کرنے پر اور ان کا تھوڑا کلام بھی نمونتاً پیش کرنے پر اتر آؤں تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں جن میں ہندو ہی نہیں بہ کثرت مسلمان نظر آئیں گے۔

ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

ریاض خیرآبادی کے اخبارات

(ریاض الاخبار، روزانہ تار برقی، صلح کل اور فتنہ و عطر فتنہ)

جیسے جیسے انسان اپنی ضروریات زندگی کو فراہم کرنے میں کامیابی حاصل کرتا گیا ویسے ویسے اپنے تخلیقی وسائل کو اور وسیع کرتا گیا۔ آدمی سماج کے اندر رہتا ہے۔ اس کے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ اپنے دوست واحباب، عزیز و اقارب سے براہ راست وہ اپنی زندگی کے مسائل کو وابستہ کرتا ہے۔ ان کے نفع و نقصان سے باخبر رہتا ہے۔ اس طرح خبر رسانی کی اہمیت اس کی بنیادی زندگی ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔

خبر رسانی کے ابتدائی مدارج کے بارے میں محمد عتیق صدیقی کا یہ بیان قابل توجہ ہے ۔۔۔

"ہمارے دیس میں منو مہاراج کے فلسفۂ ریاست میں بنیادی حیثیت گاؤں کو حاصل تھی گاؤں کا چودھری اپنے گاؤں کے نیک و بد کا دس گاؤں کے چودھری کو اور وہ بیس گاؤں کے چودھری کو اور وہ سو گاؤں والے چودھری کو، اور وہ ہزار والے کو اطلاع دیتا تھا۔ اس طرح خبر اپنی اہمیت کے اعتبار سے راجہ تک پہنچ جاتی تھی۔ لیکن اس زمانے میں اگر کوئی بڑی سی بڑی بات بھی ہو جاتی تھی تو دوسری جگہ کے لوگوں کو بہت دنوں کے بعد سادھوؤں، فقیروں، سیلانیوں اور مسافروں کی زبانی اس کا حال معلوم ہوتا تھا۔ پٹالوں، کتبوں، ستونوں پر کندہ ہوئی عبارتیں خبر رسانی کا پہلا سراغ دیتی تھیں ۔۔۔۔۔۔۔۔ (ہندوستانی اخبار نویسی از محمد عتیق صدیقی، صفحہ ۲۱)

عتیق صدیقی صاحب آگے تحریر فرماتے ہیں کہ عہد وسطیٰ میں خبر رسانی کافی ترقی کر چکی تھی۔

"عہد وسطیٰ میں محمد تغلق کے زمانے میں ہم کو فوری چھٹیوں (EXPRESS) کے لانے اور لے جانے کے بندوبست کا پتہ چلتا ہے۔ شیر شاہ کے عہد میں بھی خبر رسانی اور ڈاک کا

مکمل انتظام قائم تھا۔ اس نے سڑکوں کے کنارے جو سرائے بنوائی تھیں اس میں ڈاک چوکی بھی شامل تھی اور چوکی پر ہر وقت دو گھوڑے تیار رہتے تھے۔

مغلوں کے عہد میں اخبار نویسی اور وقائع نگاری نے کافی ترقی حاصل کی۔ ابوالفضل نے اس کا ذکر کرتے ہوئے "آئین اکبری" میں لکھا ہے کہ وقائع نگار واقعات سلطنت قلم بند کرتا تھا۔ یہ نہ صرف مملکت و دولت کی ترقی اور انتظام کے لیے ضروری تھا بلکہ ہر طبقہ اور ہر مجلس کی رونق بحال رکھنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ خبر رسانی نے اخبار کی صورت کب اختیار کی اور کیوں؟

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ جب ہرکاروں اور کبوتروں وغیرہ سے کام نہیں چلا تو خبر رسانی نے ترقی کر کے اخبار نویسی کا درجہ اختیار کر لیا اور اخبار وجود میں آیا۔ پہلا مطبوعہ خبر نامہ ۱۶۰۹ء میں جرمنی میں جاری ہوا۔ اس کا نام (AVISARLATION ODERZEITUNG) اوزار لیشن اوڈرزیتنگ تھا اور پہلا باقاعدہ اخبار انگریزی زبان میں ۱۶۲۰ء میں شائع ہوا اس کا نام (WEEKLY NEWS NATHANIL BUTTLER) ویکلی نیوز نتھانیل بٹلر تھا۔ اس کے بعد ۱۶۲۱ء میں فرانس سے گزٹ دی فرانس GAZZETT DE FRANCE جاری ہوا۔ امریکہ کا پہلا اخبار پبلک اکرنس PUBLIC OCCERENCE تھا۔ اس اخبار کا اجرا ۱۶۹۰ء میں بوسٹن سے ہوا۔

ہندوستان میں چھپائی کے فن کے بارے میں عتیق احمد صدیقی کا ایک بیان ملاحظہ ہو۔

ہندوستان میں چھپائی کی ابتدائی تاریخ پرتگالیوں کی تاریخ سے وابستہ ہے اور صرف چار سو سال پرانی ہے۔ ۱۵۰۰ء میں فادر تھامس اسٹیونس FATHER THAMS STEVENS نے بہت سی کتابیں دیسی زبانوں میں چھاپیں۔"

اردو کے سب سے پہلے مطبع کے بارے میں مزید وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"پہلا مطبع مولانا اختر شہنشاہی کی فہرست کے مطابق دہلی کا مطبع عبدالرحمٰن قائم ہوا۔" (ہندوستانی اخبار نویسی ص ۳۰)

اس کے بعد ہندوستان میں اخبار نویسی کا باقاعدہ رواج ہوگیا اور اخبارات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ڈاکٹر جان ہنڈرسن نے آگرہ اخبار کے نام سے ۱۸۳۲ء میں دیسی زبان کا اخبار فارسی رسم الخط میں شائع کیا۔ اس اخبار میں زیادہ تر عدالتی کاروائیاں شائع ہوتی تھیں۔

دہلی اخبار

یہ دہلی کا پہلا اخبار تھا جس کا ۱۸۳۷ء میں اجرا ہوا۔ یہ مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کے قلم سے نکلا۔ کچھ دنوں کے بعد یہ اخبار دہلی اردو اخبار کے نام سے نکلنے لگا۔

سید الاخبار

۱۸۳۷ء میں ایک اور اخبار سید الاخبار کے نام سے جاری ہوا۔ اس اخبار کے مالک سرسید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں تھے۔ یہ اخبار خاص طور سے وکیلوں میں بہت مقبول تھا۔ یہ ۱۸۴۸ء تک جاری رہا۔

اس کے بعد لکھنؤ سے بھی اخبار کے اجرا کا آغاز ہوا۔ لکھنؤ کا پہلا اخبار "لکھنؤ اخبار" ہے جو نابیا ۱۸۴۷ء کے اوائل میں ایک بزرگ لال جی نے نکالا تھا۔ لکھنؤ کے اخبارات کے بارے میں عتیق احمد صدیقی اس طرح رقم طراز ہیں:

"سلطنت اودھ کے چند ہی مہینوں کے بعد لکھنؤ سے اردو کے دو اخباروں کا ۱۸۵۶ء کے وسط میں اجرا ہوا۔ ایک کا نام "طلسم لکھنؤ" (جولائی ۱۸۵۶ء)۔ اور دوسرے کا نام "سحر سامری" (نومبر ۱۸۵۶ء) تھا۔ اس کے اڈیٹر گر نرائن عیاش تھے)

(ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۱۱)

اردو کے بنیادی اخبارات کے سلسلہ میں "مخزن الاخبار" کا بھی ذکر آتا ہے اور اس سے ایک اور اخبار "تاج الاخبار" بھی وابستہ تھا۔

اس دور کے اخبارات اردو ادب کو ترقی دینے کے علاوہ عوام میں ایک طرح کی سیاسی بیداری پیدا کرنے میں بھی معاون تھے۔ "ریاض الاخبار" ۱۸۵۷ء کے بعد اس دور کی ایک کڑی

ہے۔ ریاضؔ نے خیرآباد سے "ریاض الاخبار" ۱۸۷۲ء میں نکالا۔ یہ پہلے سیتاپور سے نکلتا تھا۔ جس کے لیے غالب الاخبار "ادبی فضا ہموار کر چکا تھا۔

نادمؔ سیتاپوری نے سیتاپور کے اخبارات کے بارے میں اس طرح تحریر کیا ہے

"غالب الاخبار" محلہ تامسین گنج (سیتاپور) ہفتہ وار۔ مجاریہ، محمد صادق وکیل سرکار و آغا عبدالغنی وکیل عدالت "مطبع نادرہ کار" مرزا محمد قاسم علی منصرم نے یکم مارچ ۱۸۶۹ء کو شایع کیا۔"

"تہذیب الآثار" سیتاپور (اودھ) محلہ تامسین گنج مقام کوٹھی سید محمد صادق وکیل سرکار۔ مالک مطبع مجاریہ منشی منی لال صاحب بلگرامی تھرڈ ماسٹر ہائی اسکول ضلع، اڈیٹر۔۔۔۔ مطبع صبح صادق۔ سیتاپور (اجرا) یکم ستمبر ۱۸۷۹ء"

(انتخاب فتنہ نادم سیتاپوری ۲۲۔۲۲)

نادمؔ سیتاپوری "ریاض الاخبار" کے سن اجرا کے بارے میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

"ریاض الاخبار" یہ اخبار پہلے بمقام موتی مسجد، مکان منشی نیاز احمد صاحب آنریری مجسٹریٹ شہر خیرآباد محلہ میاں سرائے ضلع سیتاپور سے عشرہ وار سالانہ نو روپیہ پر تاریخ یکم اکتوبر ۱۸۷۴ء میں ریاض الدولہ۔ بہار الملک منشی سید ریاض احمد صاحب آشفتہ رئیس ابن سید طفیل احمد صاحب کرمانی کورٹ انسپکٹر درجہ اول جونپور۔ حافظ نظام احمد صاحب انداز رئیس نے مطبع لمعہ رخشاں سے جاری کیا اب بحکم مالکان موصوف۔ باہتمام لالہ سیتلا بخش محلہ نخاس شہر گورکھپور۔ آٹھ ورق اوسط۔ سالانہ بارہ روپیہ تیرہ آنے پر شائع ہوتا ہے۔"

(اختر شہنشاہی ص ۱۳۱ بحوالہ انتخاب فتنہ ص ۲۳)

اس بیان سے "ریاض الاخبار" کے سن اجرا پر روشنی پڑتی ہے لیکن سیتاپور گزیٹیر کی طرح یہ سن بھی مجھ کو غلط نظر آتا ہے۔ اس سلسلہ میں رئیس احمد جعفری کا یہ بیان قابل توجہ ہے۔

"۱۸۷۲ء میں انھوں نے لمعہ رخشاں کے تاریخی نام سے خیرآباد میں ایک مطبع قائم کیا اور "ریاض الاخبار" جاری کر دیا۔" (رند پارسا ص ۲۹۸)

ان سب بیانات پر رئیس احمد جعفری کے بیان کو ترجیح دی جاسکتی ہے کیوں کہ ریاض کے بارے میں ان کو واقفیت کامل ہی نہیں ہے بلکہ وہ ریاض کے بہت قریبی عزیز بھی ہیں جو ان کی زندگی کے ہر پہلو سے واقف تھے۔ یہ طے پایا کہ "ریاض الاخبار" کا سن اجرا ۱۸۷۲ء ہے۔ "غالب الاخبار" سیتاپور میں پس منظر کے طور پر ایک ادبی فضا قائم کیے ہوئے تھا۔ اور "تہذیب الاخبار" "ریاض الاخبار" کے سات سال بعد سیتاپور سے نکلا۔

"ریاض الاخبار" ۱۸۷۲ء میں لمعہ رخشاں کے تاریخی مطبع خیرآباد سے جاری ہوا۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا۔ اور قریب ۱۸۸۱ء تک خیرآباد سے نکلتا رہا۔ خیرآباد کے لوگ اس کا دوسرا نام "نظام الآثار" بھی بتاتے ہیں۔ اس کے بارے میں ریاض صاحب خود تحریر فرماتے ہیں:

"بعض کے پاس "ریاض الاخبار" بلا قیمت جاتا تھا۔ ہر گلی کوچہ میں مختلف مقامات پر ذریعہ پیکٹ کارپردازوں کی معرفت فروخت کے انتظام میں اولیت "ریاض الاخبار" پریس خیرآباد کو ہے۔ ریاض الاخبار کو بھی ولایتی اور ہندوستانی انگریزی اخبارات کے چیدہ و دلچسپ تراجم جنگ سے متعلق جیسے ملتے تھے شاید اس وقت کسی دوسرے ہفتہ وار اخبار کو ملتے ہوں غازی عثمان پاشا معروف بہ رستم سلونا کی آخری جنگ روس، رومانیہ، بلگیریا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ روس کی کمان میں، تفصیل اور جس شان سے ریاض الاخبار میں چھپی ہے۔ دیکھنے کے قابل ہے مگر اس وقت کے پرچے اب کہاں۔

(نگار اپریل ۱۹۲۱ء ص۱۰، ریاض اپنے آپ آئینہ میں)

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ "ریاض الاخبار" نے ابتدائی منزلوں میں ہی ایک سیاسی اور ادبی اہمیت پیدا کر لی تھی۔ اور اس کی عام مقبولیت اور جدت کے بارے میں کوئی شک و شبہ ہی نہیں ہے۔

اس وقت کے مشہور اخبارات کے بارے میں مولوی سبحان اللہ صاحب اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

"منشی ریاض احمد کے ایک عزیز منشی سید نظام احمد رئیس خیرآبادی بھی گورکھپور

میں تشریف لائے باپ سے کچھ روپیہ مار لائے تھے۔ دونوں نے مل کر "ریاض الاخبار" جاری کیا

ریاض الاخبار، گورکھپور، لکھنؤ میں اودھ پنچ اودھ اخبار، دلگداز، کانپور میں "زمانہ" آگرہ، مرادآباد اور کہاں کہاں انہی ریاض احمد کے ہمعصر لوگوں نے اخبارات جاری کئے تھے جس میں ریاض الاخبار کا مرتبہ اپنے لٹریچر کے اعتبار سے کسی دوسرے درجہ کا نہ تھا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، مصنف فسانۂ آزاد، نثار حسین سجاد حسین، مولوی عبدالحلیم شرر، ناصر علی دہلوی اور معلوم نہیں کتنے باذوق اور ٹھوس لکھنے والے اس وقت فضا میں گونج رہے تھے۔"

(زمانہ ستمبر ۱۹۳۴ء ص ۱۵۸ بعنوان خیام الہند حضرت ریاض)

ریاض الاخبار

۱۸۸۱ء میں گورکھپور میں آیا۔ اس نے دنیائے صحافت میں دھوم مچادی۔ یہ وہ اخبار ہے جس نے ریاض کی شخصیت کو چار چاند لگادیے تھے۔ اور بڑے بڑے معرکے سر کئے۔ "ریاض الاخبار" کا مقابلہ آج کی صحافت سے نہیں کیا جاسکتا۔ اس کو اسی معیار پر دیکھنا چاہیے جو ان کے زمانے میں رائج تھا۔ اس زمانے کے اخبارات خبریں کم دیتے تھے۔ مقالات، نصائح، ہدایات پر زیادہ توجہ کرتے تھے۔ قصہ کہانیوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ لیکن ریاض الاخبار نے ان حدود کو توڑ کر ایسی آزاد خیالی، بے باک اور بے لاگ نکتہ چینی سے اردو صحافت میں نیا معیار قائم کیا۔" ریاض الاخبار" کے پہلے صفحہ پر یہ شعر درج رہتا تھا

تری اٹھان ترقی کرے قیامت کی

ترا شباب بڑھے عمر جاوداں کی طرح

ریاض کو جب حالات نے مجبور کردیا تو مہاراجہ محمود آباد کے اصرار پر ۱۹۰۷ء میں لکھنؤ چلے آئے اور "ریاض الاخبار" یہاں سے نکالنا شروع کردیا۔

اب ہم "ریاض الاخبار" کی کچھ جدید شوخیوں اور منسوخ حرکتوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

ریاض الاخبار نے خوش معاملہ اور نادہند خریداروں میں امتیاز کی ایک عجیب روش زریں اور تاریک کالم کے عنوان سے نکالی تھی

یہ لطیفہ ریاض ہی کی زبان سے سنیے

۱۔ زریں کالم :۔ دنیا میں وہ حضرات بھی ہیں جن کے نام خاص کالم کی نذر کیے جاتے ہیں اور کچھ اثر نہیں ہوتا ۔۔۔۔ جو لوگ اخباری دنیا سے بہ اعتبار دلیسی مذاق کے واقف ہیں وہ زریں کالم کی جدت کو بہت ہی نگاہ سے دیکھیں گے۔ ہم نے آئندہ کے لیے پسند کیا ہے کہ خاص کالم کی ترمیم سیاہ کالم سے کر دیں اور وہ سیاہ کالم زریں کالم کے دوش بدوش ہے۔

۲۔ سیاہ کالم :۔

لائے خدا ہی اس بُتِ ظالم کی راہ پر
چھائی ہوئی ہے بے اثری روئے آہ پر

وہ نادہند خریدار جن سے ہر طرح مایوسی ہو چکی تھی۔ ان کے نام مع تعداد بقایا تاریک کالم میں درج کر کے ہم نے اپنی حالت کو ان کے رحم پر چھوڑ دیا۔ ان میں سے ایک خدا کا بندہ ایسا تھا جس نے یکمشت پچاس کی رقم جو باقی پڑ گئی تھی ادا کر دی، دو ایسے نکلے جنھوں نے وعدہ کر کے نام تو اس کالم سے نکلوا لیے مگر اب تک قیمت نہ ادا کی ۔۔۔۔"

(نثر ریاض خیرآبادی، عقیل احمد جعفری ص ۲۵)

"ریاض الاخبار" میں خریداروں کی تعریف اور سالانہ چندہ نہ دینے پر کبھی کبھی ہجو بھی شائع کی جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں عقیل احمد جعفری ریاض کے بیان کو اس طرح قلم بند کرتے ہیں۔

"مثل ہے ہاتھی لاکھ گھٹ جائے جب بھی سونے کے سوا لاکھ ٹکے کا۔ نواب لائق علی خاں مرحوم وزیر دکن نے شاید مستعفی ہونے پر یا اس سے پیشتر ریاض الاخبار کو اطلاع دی کہ وہ ان کے نام بند کر دیا جائے۔ مطالبہ میں چار ہفتہ کی قیمت سے زیادہ نہ تھا۔ پورا چندہ بھیج دیا۔ اب ان کے واسطے امیر ابن امیر کا الفاظ کیونکر نہ استعمال

کیا جائے۔ ایک ہمارے نواز جنگ ہیں۔ حساب تو دس دس بار طلب ہوتا ہے مگر روپیہ کسی طرح جیب سے نہیں نکلتا۔ ہاں ہاں صاحب آپ کے دشمن دیں اعلیٰ درجہ کی قیمت تو اعلیٰ لوگوں سے ہے۔ آپ بیچارے غریب گھرانے کے ڈیوڑھی پر اب ہاتھی جھوم رہے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کی قیمت کیا جانیں۔ اس کے بعد پھر سانس نہ لیا نہ لی۔ سننے میں آیا خود بدولت ولایت کی ہوا کھا رہے ہیں۔ ولایت سے پھرے۔ پھر بھی ہماری قیمت نہ پھری۔"

نثر ریاض خیرآبادی ص ۱۶۷)

"ریاض الاخبار" میں ادبی مباحثے بھی شامل ہوتے تھے۔ چنانچہ شوکت میرٹھی اور ریاض صاحب کی چشمک کی جھلک مندرجہ ذیل سطور میں آپ کو نظر آئے گی۔

ریاض تحریر فرماتے ہیں۔

"جناب شوکت میرٹھی نے اپنے رسالے پروانہ" میں ایک بار تحریر فرمایا۔۔

حضرت ریاض ماشاء اللہ جلیلی طبیعت۔ کھلے ہیں اور استادوں میں سے ہیں ان کا شعر ؎

کوئی منہ چوم لے گا اس نہیں پر — شکن رہ جائے گی یوں ہی جبیں پر

خاصہ ہے مگر مصرع اولیٰ میں۔ اس حشو ہے اگر ہم مضمون کو بلند کر دیں۔ تب تو ہماری تجدید تسلیم ہو گی۔ یہ لیجئے۔

کوئی منہ چوم لے گا اس نہیں پر — دھری رہ جائے چین شاق جبیں پر

ایک اور شعر

لہو بیکس کا مقتل کی زمین پر — نہ دامن پر نہ ان کی آستین پر

بہت خوب حسرت بھرا مضمون ہے۔"

اس کے جواب میں حضرت ریاض کی تحریر ملاحظہ ہو جو طنز نگاری کی بہترین مثال ہے جو ریاض رخند میں شائع ہوئی ہے۔

"کوئی شکریہ ادا کرے یا نہ کرے ہم دل سے ان الفاظ کے لیے شکر گزار ۔

جو ہمارے مرتبے سے کہیں زیادہ ہمارے لیے صرف کیے گئے ہیں۔ اپنے عیب کے قبول کرنے میں اس لیے پس و پیش ہے کہ مجدد الوقت کی فکرِ آسمان پیوند نے اس کو اس قدر بلند کر دیا ہے کہ وہ ممدوح کے سوا کسی اور کے مرتبہ پا زیب نہیں دیتا۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے

؎ سنتے ابھی دراز کی قدر کے — وہ مجھے جزو توقف کہتے ہیں

ہم بھی اپنے عیب کلام پر ہزار بار بعد تھے لیکن ایک ریفارمر اور ایک ادنیٰ شخص کے عیب کلام کی طرف فیاضانہ توجہ۔ ہم امید کرتے ہیں جد دالوقت جناب شوکت کو آیندہ بھی توجہ رہے گی۔

(ریاض الاخبار ۲۸ جولائی ۱۹۰۶ء)

ایک نامہ نگار نے "ریاض الاخبار" مطبوعہ ۲ مئی ۱۸۹۸ء میں لفظ "ایجاد" کی تابیث پر بحث کرتے ہوئے مثالاً اور سنداً جناب رشک کے ذیل کے تین شعر لکھے

وقتِ حسابِ کثرتِ اغیار وصل میں	کہتے ہیں بات ٹال کے گنتی غلت ہوئی
سودا ہے حاسبانِ قیامت کا آپ کو	تعدادِ جرمِ اہلِ معاصی غلت ہوئی
پروا ہے حرف گیریِ اہلِ سخن نہیں	اے رشک مستندِ جو کتابِ لغت ہوئی

اس پر حضرت ریاض تحریر فرماتے ہیں۔

"نامہ نگار صاحب کو ذاتی طور پر رائے قائم کرنے اور اس پر پابند ہونے کے لیے اختیار حاصل ہے۔ ۔ ۔ ۔ رشک نے عمداً "غلت" کا لفظ استعمال کیا ہے یہ غلت ہے نہ غلط نہیں ہے جو صحیح کا مقابل ہوتا ہے بلکہ یہ غلت حد سے زیادہ گزر جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس "غلت" کا مخرج "غالی" و "غلو" ہے جیسا کہ لوگوں کے زبان زد ہے کہ فلاں شخص ۔ ۔ ۔ غالی ہے اور فلاں شخص کو فلاں معاملے میں "غلو" ہے۔ یعنی اعتدال سے زیادہ بڑھا ہوا ہے میر علی اوسط رشک نے اس معنی میں یہاں "غلت" کا لفظ استعمال کیا ہے

پہلے تو معشوق اپنے عاشقوں کی گنتی کو کہتا ہے کہ "غلت" یعنی حد سے بڑھ گئی اس طرح دوسرے شعر کے معنی ہیں کہ جرائم بے حد ہو گئے۔ رشک نے اس میں تجنیس لفظی کے لحاظ سے بلاغت صرف کی ہے۔ اور یہ خاص مذاق جناب رشک کا ہے۔" (ریاض الاخبار، ۸ جون ۱۸۹۷ء)

اب ذرا "ریاض الاخبار" کی ادبیت، ادبیت اور مقصدیت کے بارے میں خود ریاض خیرآبادی کا بیان ملاحظہ ہو۔

" اے عندلیب رنگ ہمارا اڑائیو
تقلید میں بھی تار ہے ایجاد کا مزا

"ریاض الاخبار" نے اپنے طرز وسٹریچر میں جو اعلیٰ درجہ کی نمود حاصل کی ہے وہ اس لیے کہ زمانہ کو اس پر ناز ہو۔ شاہد پرستان سخن سے اس کی قدر پوچھیے۔ اور جو عروس مذاق کے نکھار پر سٹے ہوئے ہیں ان کے دل ٹٹولیے۔ . . . ناٹک کی وہ دھوم مچی کہ ہنگامۂ محشر سمٹ کر یہیں آرہا ہے ناول کی شہرت کا وہ شور ہوا کہ حشرستان تمنا گونج اٹھا۔ انھیں شعر وادب سے لگاؤ تھا وہ اس کی پرستش کرنے لگے۔ انھیں سائنٹیفک اور پولیٹکل مضامین کی چاہت تھی، وہ اس پر مرمٹے۔ اس پرچہ کی خواہش ہے کہ اپنی حالت کو اپنے حوصلہ کے مطابق سنبھالے۔ وہ بات پیدا کرے کہ ملک کو اس کے اندازہ کی وقعت سے فخر حاصل ہو۔ اس لیے قوم کی توجہ دلائی جاتی ہے کہ دات، درمے، سخنے اعانت سے محروم نہ رکھے اور اپنی آبیاری فیض سے اس کی امنگوں کے ہونہار پودے مرجھانے نہ دے۔

دل بیتاب کا سنبھلنا کیا
دیکھ لو پیار کی نگاہوں سے"

(نثر ریاض خیرآبادی ص ۱۶۵)

روزانہ تار برقی

"ریاض الاخبار" نکال کر جب ریاض کی طبیعت ادبی سرگرمیوں سے آسودہ نہیں ہوئی تو

ریاضؔ نے خیرآباد ہی سے ایک پرچہ "روزانہ تار برقی" کے نام سے نکالا جو پائنیر اور دوسرے انگریزی اخبارات سے خبریں اکٹھا کرتا تھا۔ اس اخبار کے بارے میں ریاضؔ صاحب خود تحریر فرماتے ہیں:

"جنگ روم وروس کے بارے میں اودھ اخبار لکھنؤ کے سوا کوئی اردو اخبار روزانہ نہ تھا۔ میں نے ایک پرچہ پریس خیرآباد سے موسوم بہ "روزانہ تار برقی" نکالا تھا جس کی ترتیب اور تار برقی وغیرہ کے تراجم کا انتظام پائنیر اور دیگر انگریزی اخبارات سے اور قونی کلب سے کر دیا تھا۔ اور سیتاپور میں اشاعت و فروخت کا انتظام ایک انگریز انسپکٹر پولیس نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ یہ پرچہ کتابی تقطیع کے دو ورق پر چھپتا تھا۔ قیمت ایک پیسے کے دو پرچے مگر سیتاپور اور خیرآباد کے سوا اور مقامات پر ایجنٹ ایک ہی پیسے کا فروخت کرتے تھے یا جیسا موقع ہو۔ زیادہ تر کام کرنے والے احباب تھے۔"

(نگار، اپریل ۱۹۳۱ء ص ۷۰)

اس اخبار کے بارے میں نادمؔ سیتاپوری کا بھی ایک بیان قابل ذکر ہے جس سے اس کی نوعیت اور اجرار کے بارے میں کچھ نشاندہی ہوتی ہے۔

"روزنامہ تار برقی" وہ پہلا اخبار تھا جس سے ریاضؔ کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا۔ یہ اخبار ہندوستان کا سب سے پہلا سستا اور ارزاں اخبار تھا جس کی قیمت ڈیڑھ پائی یا ایک دھیلا تھی۔ پنجاب کا مشہور "پیسہ اخبار" تار برقی کے پندرہ برس بعد ۱۸۸۷ء میں گوجرانوالہ سے اور مرادآباد کا۔۔۔ اخبار ۱۸۹۵ء میں جاری ہوئے تھے۔ "تار برقی" جیسے سستے اخبار کی اجرار کی سعادت ۱۸۷۲ء میں ریاضؔ نے حاصل کی تھی۔ جو اپنے رنگ کا منفرد روزنامہ تھا۔"

(انتخاب فتنہ، نادمؔ سیتاپوری ص ۲۲)

نادمؔ صاحب کو شاید "تار برقی" کے سنِ اجرار کے بارے میں غلط فہمی ہوگئی کیونکہ یہی سن ہے جب "ریاض الاخبار" جاری ہوا۔ اور دونوں اخبارات ساتھ ساتھ نکلنا نہیں شروع ہوئے۔

رئیس احمد جعفری کے مندرجہ ذیل بیان سے "تار برقی" کے اجرار کے وقت کا تعین ہو جاتا ہے۔

"۱۸۷۲ء میں ریاضؔ نے جب "لمعۂ رخشاں" کے نام سے ایک پریس خیرآباد میں قائم کیا اور "ریاض الاخبار" جاری کیا۔ اسی زمانے کے لگ بھگ انہوں نے جرأت رندانہ سے کام لے کر ایک روزانہ اخبار "روزنامہ تار برقی" کے نام سے بھی نکالا ـــــ ـــــ (رندِ پارسا ص ۲۰۱)

اس عبارت سے واضح طور پر "روزنامہ تار برقی" کا سن اجرار ۱۸۷۲ء نہیں تعین ہوتا ہے "تار برقی" کے بارے میں بہت کم مواد ملتا ہے۔ کیونکہ یہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا رئیس احمد جعفری کا "تار برقی" کے بارے میں ایک بیان قابل توجہ ہے۔

"روزنامہ تار برقی" اور "گلکدۂ ریاض" سے ریاضؔ کی جولانیٔ طبع و بلند حوصلگی اور جرأت رندانہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

انگریزی سے نابلد اور ناواقف محض ہونے کے باوجود حضرت ریاضؔ خیرآباد جیسے چھوٹے قصبے سے ایک روزانہ اخبار جاری کر دیتے ہیں اور اس میں ایسی جدتیں اور شوخیاں بھر دیتے ہیں کہ خلقت ٹوٹ پڑتی ہے۔ ہاتھوں ہاتھ استقبال ہوتا ہے حوصلہ دیکھیے کہ پرچہ صرف مقامی نہیں ہے۔ بلکہ مختلف مقامات پر اس کے ایجنٹ بھی ہیں جدت ملاحظہ ہو "ایک پیسہ میں دو" (رندِ پارسا ص ۲۰۵)

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اخبار عوام میں بہت مقبول تھا لیکن چونکہ اس کی زندگی بہت تھوڑی تھی اس لیے اس کے مضامین کا دستیاب ہونا بہت مشکل ہے اور ریاضؔ کی صحافت کے نمونے کے لیے "ریاض الاخبار" ہی کو پیش کیا جا سکتا ہے جو ان کو شہرت دینے میں پیش پیش رہا۔ "تار برقی" کو ریاضؔ کی صحافت میں کوئی اہم درجہ نہیں حاصل ہے۔

صلح کل

"صلح کل" ایک روزانہ اخبار تھا۔ جس کو ریاض نے گورکھ پور سے نکالا۔ اس زمانہ میں گورکھپور میں کچھ ایسے صاحب علم لوگ موجود تھے۔ جنھوں نے صلح کل کے لیے مشترک سرمایہ سے زمین ہموار کردی تھی۔ اور صلح کل کا اجراء عمل میں آیا۔ اس فضا کے بارے میں قاضی تلمذ حسین صاحب کا بیان ملاحظہ ہو۔

"انیسویں صدی کے اواخر بلکہ بیسویں صدی کے اوائل تک گورکھ پور میں کچھ خوش وقت اصحاب باقی تھے۔ مولوی محب اللہ صاحب، بابو موہن سنگھ صاحب مرحوم احسان اللہ عباسی مصنف تاریخ اسلام ..... منشی چھوٹو لال، خان بہادر منشی محمد خلیل مرحوم چیرمین میونسپل بورڈ کی برگزیدہ ہستی سایہ فگن تھی۔ مولوی سبحان اللہ صاحب کا عنفوان شباب تھا۔ مسٹر سید حبیب اللہ بیرسٹر ایٹ لا گورکھپور میں جائنٹ مجسٹریٹ اور مصالح قومی وملکی کے لیے وقف تھے ..... رزولیشن پاس ہوگیا کہ ایک کمیٹی قائم کی جائے اور ایک روزانہ اخبار نکالا جائے اور منشی ریاض احمد صاحب معتمد ومؤتمن ہوں ..... کمیٹی کی رجسٹری ہوگئی کچھ روپیہ بھی جمع ہوگیا اور اخبار "صلح کل" کا اجراء عمل میں آگیا۔"

(رندپارسا رئیس احمد جعفری ص ۲۶،۹)

مندرجہ بالا بیان سے صاف ظاہر ہے کہ کن حالات وماحول کے تحت "صلح کل" کا اجراء عمل میں آیا۔ اس سلسلہ میں رئیس احمد جعفری کا یہ بیان قابل توجہ ہے۔

"صلح کل" روزانہ اخبار تھا۔ حکیم برہم اس کے رکن تھے۔ حضرت ریاض نگراں کار، چند دوستوں کی ایک پرائیویٹ کمیٹی تھی تو صلح کل کی مالک تھی۔ مولوی سبحان اللہ مرحوم بھی اس میں شریک تھے۔ یہ اخبار زیادہ نہیں چلا۔ اپنا ایک خاص معیار رکھتا تھا۔

(رندپارسا ص ۲۸)

نادم سیتاپوری "صلح کل" کا سن اجراء ۱۸۹۵ء لکھتے ہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"مسلح کل" گورکھپور سے ۱۸۹۵ء میں روزانہ جاری ہوا"

(انتخاب فتنہ ص ۳۸)

اس کے اسٹاف میں سید جالب صاحب ایسے لوگ شامل تھے۔

"مصلح کل" اخبار روزانہ گورکھپور سے نکلتا تھا۔ اس کا رجسٹرڈ نمبر الف ۱۹۹ تھا۔

اس کے سرورق پر سب سے اوپر لکھا ہوتا "المصلح خیر"

آں لشں دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است"۔ اشتہار "مصلح کل" بھی اسی حصہ میں درج ہوتا جو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"نہایت اعلیٰ کاغذ۔ قیمت۔ پیشگی سالانہ مع محصول والیان ملک و مہاراجگان و تعلقدراں ؎ روساے متوسط کاغذ پر ؎ عام قیمت معمولی کاغذ پر ؎ ایجنسی اور شہر کے لیے یہاں بارہ پرچوں کا پیکٹ یکجائی طور پر جائے مع محصول سالانہ ؎ ہر قسم کی خط و کتابت سید ریاض احمد منیجر "مصلح کل" پرنٹنگ کمپنی لیمٹڈ گورکھپور کے نام آنا چاہیے۔"

میرے پیش نظر "مصلح کل" روزانہ جلد ۱ نمبر ۲۶ پنجشنبہ ۱۱ دسمبر ۱۹۰۲ء مطابق ۱۵ رمضان المبارک ۱۳۲۰ ہجری اور نمبر ۹۷ ہیں۔ یہ اخبار چار فل اسکیپ سائز صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ عموماً خبرنامہ ہوتا تھا جس میں ہندوستان اور غیر ملکی خبریں زیادہ تر شائع ہوتی تھیں۔ جو انگریزی اخبارات سے اخذ کی جاتی تھیں۔ ان خبروں کا ایک عنوان "ولایتی تار" ہوتا تھا۔ جس میں شاہ پرتگال کی واپسی، افغانستان میں اسلحہ کا جانا۔ امیر کی ایک شکایت۔ مارسلیس کی ہڑتال۔ جنوبی افریقہ کی فوج، روس میں تکلیف، قحط اور بخار ملک فن لینڈ میں نمودار ہوئے ہیں اور جنوب و مغرب روس اور کوہ قاف میں سخت تکلیف سمایا کو ہے: وغیرہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ بیرونی خبروں میں۔ ہندوستانی کپڑوں پر پھول۔ ریلوں کی توسیع۔ حاجیوں کے ساتھ ترکوں کی زیادتی۔ دربار کے متعلق پریسیڈنٹ نیشنل کانگریس کے خیالات، سریندر ناتھ بنرجی صدر کانگریس کی اجلاس احمد آباد میں قومی زندگی پر تقریر۔ دہلی کا دربار وغیرہ جیسے عنوانات شامل ہوتے تھے۔

اخبار میں ایک عنوان "رسل و رسائل" ہوتا جس کے تحت "ہندوستان کی قدیم عظمت، تلبط(؟) جیسے مضامین شامل ہوتے۔ تراجم اور اقتباسات کا عنوان بھی اخبار میں نمایاں ہوتا

جس کے تحت ہندوستان اور انگلستان کی کھیتی کا موازنہ وغیرہ مضامین شامل ہوتے۔ کچھ اور کچھ قسم کے مضامین بھی اس اخبار میں شائع ہوتے تھے۔ یہاں پر اس شمارے سے ایک عجیب قوم کے زیر عنوان مضمون نقل کیا جاتا ہے۔

"ملک کینیڈا واقع امریکا میں ایک عجیب قوم آباد ہوئی ہے جو "دوخو بورس" کہلاتے ہیں انہیں روس نے یک قلم اپنی عملداری سے نکال دیا۔ کیوں کہ ان کا عقیدہ قومی ملازمت کو منع کرتا ہے مگر وہاں بھی وہ ایک نیا رنگ لائے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بہت مسکین اور نیک چلن قوم ہیں مگر دنیا میں کسی کی رعایا ہو کر بالخصوص انگریزوں کی رعایا بن کر خلاف اپنے ایمان و مذہب کے تصور کرتے ہیں۔ جانوروں سے بھی وہ کام نہیں لینا چاہتے۔ بس کاشتکاری بھی کچھ یوں ہی ہوتی ہے اور زیادہ تر نباتات کھایا کرتے ہیں اور جاڑے کے ایام میں گرم کپڑا بغیر سوتی کپڑوں کے نہیں پہنتے۔ جس سے سل دق میں مبتلا ہو کر مر جاتے ہیں۔ چند ہفتے ہوئے کہ ان میں سے کئی ہزار ایک موضع پارکٹن سے مقام وبنیگ کو اس خیال سے روانہ ہوئے کہ وہاں حضرت مسیح سے ملاقات ہوئی۔ وہ جگہ ڈھائی سو میل کے فاصلہ پر تھی۔ بس وہ لوگ . . . اور جنگلی پھل کھاتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ رات کو وہ جھاڑیوں میں سو رہتے تھے۔ اور دوسرے دن پھر آگے روانہ ہوتے تھے۔ جب وہ وبن پگ کے قریب پہنچے تو وہاں کے لوگ بہت پریشان ہوئے اور گورنمنٹ نے ان کو واپس کرنا چاہا مگر بے سود۔ آخر کار ان کو پولس کے حلقہ میں کر کے سوار کرایا گیا اور ریل پر وطن پہنچائے گئے۔ اب ان لوگوں نے سلطان ٹرکی سے پناہ مانگی۔"

۱۱ دسمبر ۱۹۰۲ء کے اخبار میں قانونی رجسٹری سے متعلق ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس اخبار میں عدالتی خبروں کے زیر عنوان "بدایوں کا مقدمۂ قتل" تفصیل سے شائع ہوا ہے۔ بیرونی خبریں زیادہ تر گورنمنٹ یا وائسرائے یا ملک معظم شاہ ایڈورڈ ہفتم سے متعلق ہوتی تھیں۔ اس اخبار میں کچھ تجارتی اشتہارات بھی شائع ہوئے تھے۔ یہ اخبار پنڈت برم شنکر اوستی پرنٹر و پبلشر چھپوا کر صلح کل پریس گورکھپور سے شائع کیا کرتے تھے۔

یہ اخبار گورکھپور کا پہلا روزانہ اردو اخبار ہے جس سے اس زمانہ کی صحافت کا عکس نمایاں ہوتا ہے اور ریاض خیرآبادی کی مجموعی شخصیت کا ایک جاوداں مرقع ہے۔ اس اخبار کی مصروفیت

کی وجہ سے ریاضؔ بستر علالت پر پڑ گئے تھے۔ اخبار کا کاغذ بہت پتلا اور اچھا ہوتا تھا چھپائی بھی زیب نظر ہوتی اور کتابت بھی اچھی ہوتی ۔ جو بھی خبریں یا مضامین اخبار میں شائع ہوتے تفصیل سے شائع ہوتے تھے۔

"صلح کل" کے کام کی زیادتی کی وجہ سے حضرت ریاضؔ بیمار ہو گئے۔ اس سلسلہ میں قاضی تلمذ حسین اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

"جس شخص نے پولس کی ملازمت اس طرح کی ہو کر کبھی وردی نہ پہنی ہو۔ پھر صلح کل کے ۲۶ رجسٹروں کا بوجھ پڑ جائے ۔ ایک پلنگ اور حضرت ریاضؔ تھے اسی پر کھانا اور اسی پر سو رہنا۔ کسی شب بستر پھیلا لیا کسی شب میں یہ بھی نہیں۔ بیمار ہوئے اور سخت ناچار۔ بھائی نیاز احمد صاحب کے پاس فرخ آباد چلے گئے۔ (ریاض رضواں ص ۱۵)

ریاضؔ اس اخبار کی خدمت زیادہ دن نہ کر سکے ۔ مالی پریشانیوں کی وجہ سے یہ اخبار مولوی سبحان اللہ صاحب کی ملکیت میں آگیا۔ اور حکیم برہم ۱۹۰۲ء میں بھوپال سے پنشن پا کر گورکھپور آ گئے تھے وہ 'صلح کل' کے اڈیٹر ہو گئے۔

ہم نے دیکھا کہ ریاضؔ نے اپنی صحافت سے اردو ادب کی کافی خدمت کی ہے 'ریاض الاخبار' روزانہ تار برقی' اور 'صلح کل' اخبارات اردو ادب میں صحافت کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتے رہے۔

ریاضؔ خیرآبادی کا فتنہ وعطرِ فتنہ

انسان ایک کمزور سماجی جانور ہے ۔ وہ حساس ہے اور اس کا ماحول نہایت ہی سنگ دل اور مطلب پرست ہے اس لیے وہ بآسانی رنج والم کا شکار ہوتا رہتا ہے ۔ انسان کے دل میں فطرت نے لسی امنگیں، ایسی تمنائیں پیدا کر دی ہیں کہ وہ فطری طور پر ان امنگوں ان تمناؤں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن جہاں اس کی تمناؤں نے عملی صورت اختیار کی وہیں اس کی تکلیفوں کی داستان شروع ہو گئی۔ کیوں کہ دنیا اس کی تمناؤں کی

مطلق پرواہ نہیں کرتی۔ حساس انسان اس بے حس، طاقتور اور ظالم دنیا سے ٹکراتا ہے اور تکلیفیں برداشت کرتا ہے۔ یہ زندگی کی حقیقت ہے لیکن مکمل نہیں۔ زندگی میں ایسے واقعات بھی پیش آتے ہیں، جب انسان اس تلخ حقیقت کو بھول جاتا ہے۔ حالاں کہ پس منظر میں بڑی تلخ حقیقت اس پر ایک مہیب دیو کی طرح ہر وقت حاوی رہتی ہے۔

کہا جاتا ہے انسان ایک ہنسنے والا جانور ہے۔ یہ بھی پوری حقیقت نہیں لیکن اس مقولہ میں انسان کی ایک اہم خصوصیت کا انکشاف ہے۔ فطرت نے انسان کو ہنسی کا مادہ عطا کیا ہے اور ہنسی مختلف وجوہ کی بنا پر آتی ہے۔ جس کو ہنسی نہیں آتی اس کو انسان نہ کہنا چاہیے۔ ادب انسان کے تمام ذہنی اوصاف کو بروئے کار لاتا ہے۔ ہنسی بھی ایک انسانی خصوصیت اور زندگی کی ناتمامی کا نتیجہ ہے۔ اس لیے ادب میں اس کا بھی وجود ناگزیر ہے۔ ادب ہنسی کا بھی ترجمان ہے۔ ادب زندگی کے تبسم انگیز پہلو کی عکاسی کو اتنا ہی ضروری سمجھتا ہے جتنا کہ زندگی کی رقت انگیز پہلو کی عکاسی کو۔

انسان ہر وقت پیچیدہ اور گہرے امور پر غور وخوض نہیں کر سکتا وہ تفریح طبع، دل بہلاؤ اور دماغی شگفتگی کی بھی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے اوقات میں خوشی اور ہنسی کے خاکے بناتا ہے۔ کلیم الدین احمد ہنسی کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

• ہنسی عدم تکمیل اور بے ڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہے۔

(سخنہائے گفتنی، کلیم الدین ص ۱۸۹)

یہ دنیا تکمیل سے خالی ہے۔ انسان اور انسانی فطرت میں بھی یہی ناتمامی ہے۔ جب ہم اس ناتمامی کے احساس کا اظہار کرتے ہیں تو اس قسم کے احساس کا نتیجہ خاص ظرافت ہے۔ اور جب ہم اس ناتمامی کے احساس کے ساتھ ساتھ اس نقص کو دور کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو اس احساس کا نتیجہ طنز اور ہجو ہیں۔ ظرافت۔ طنز اور ہجو کو تین انگریزی لفظوں کے مقابلہ میں ترتیب وار استعمال کیا جاسکتا ہے۔

SATIRE, IRONY, HUMOUR

ظرافت نگار کسی بے ڈھنگی چیز کو دیکھ کر ہنستا ہے۔ اور دوسروں کو ہنساتا ہے۔ وہ مشاہدہ سے

کام لیتا ہے۔ اس کی آنکھیں دنیا اور زندگی کے وسیع اور بوقلموں مناظر کو دیکھتی ہیں اور ان میں ایسی چیزوں کا انتخاب کرتی ہیں، جو اس کے مخصوص آرٹ کے لیے موزوں ہیں۔ ظرافت نگار ہو یا ہجو گو، دونوں صناع ہیں۔ ان کا مقصد ایک حسین، مکمل، موزوں کارنامے کی تخلیق ہے۔ طنز نگار ایک بلند پایہ اخلاق کا حامل ہوتا ہے۔ جو اپنے بلند مقام سے انسانی کمزوریوں، خامیوں اور فریب کاریوں کو اپنی طنز کا نشانہ بناتا ہے۔

پیروڈی ہماری تخلیق کا باعث بنتے ہوئے بھی ہماری تفریح ہے۔ اس سلسلہ میں ظفر احمد صدیقی کا بیان قابل توجہ ہے۔

"پیروڈی وہ صنفِ ظرافت ہے جس میں کسی کے طرز نگارش کی تقلید کر کے اس کے اسٹائل یا خیالات کا مذاق اڑانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اردو میں یہ صنفِ ظرافت نسبتاً کم یاب ہے۔ تنقید میں بھی اس کی طرف کم توجہ کی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ اردو کا کوئی ایک لفظ ایسا نہیں ملتا۔ جو اس کے مفہوم کو پورا پورا ادا کر سکے۔

مضحک نقالی، ہجویہ تقلید یا خاکہ اڑانا جیسے الفاظ سے اس کی طرف کچھ اشارہ کیا جا سکتا ہے لیکن یہ الفاظ اول تو پیروڈی کے تمام تر مفہوم پر حاوی نہیں۔ دوسرے ان کے مطالب اور رجحانات ذہنوں میں متعین نہیں ہوتے۔"

(نقوش لاہور، طنز و مزاح نمبر ص ۱۱۶)

ریاض کی ہمہ گیر شخصیت نے گزشتہ سو سال کے اندر ادب میں جو قبول عام حاصل کیا ہے اس کو تاریخ ادب اردو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ خاص طور سے ریاض کی صحافت نے بیسویں صدی کے ابتدائی اوراقِ صحافت پر جو طنز و مزاح کے گہرے نقوش چھوڑے وہ جاوداں ہیں۔ ایسی ہی ایک مزاحیہ صحافت کا نمونہ "فتنہ اور عطر فتنہ" ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سودا، جرأت انشا کے پھکڑ پن کو "اودھ پنچ اور فتنہ" نے ختم کر کے معیاری طنز و مزاح کے لیے میدان ہموار کر دیا۔

فتنہ کا پس منظر

ریاض خیرآبادی کے گلکدہ ریاض، ریاض الاخبار، صلح کل اور فتنہ وعطر فتنہ یہ سب ایک ہی تصویر کے مختلف رنگ روپ ہیں جو انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ابھر ابھر کے مٹتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جس قسم کی سوسائٹی نے جنم لیا اس میں صحت مند ظرافت کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس زمانہ کے خاص اخبارات۔ سرسید کا تہذیب الاخلاق۔ انتخاب اودھ پنچ اور زمیندار لاہور کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ اپریل فول تھے۔ انیسویں صدی کے اختتام تک ہندوستان بھر میں مزاحیہ اخبارات کی تعداد پچاس سے اوپر پہنچ چکی تھی۔ ان میں زیادہ تر اخبارات ایسے تھے جن کی نہ کوئی پالیسی تھی نہ پروگرام مثلاً عبداللہ قریشی نے لاہور کے مزاحیہ اخبارات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"آج سے پون صدی پیشتر لاہور میں اچھے اخبارات کے ساتھ بعض گھٹیا قسم کے ظریفانہ اخبار، ملادو پیازہ، جعفر زٹلی اور رفیق ہندوستان وغیرہ بھی شایع ہوتے تھے۔ جن میں نہایت فحش مضامین چھپا کرتے تھے۔ یہ اخبار بالعموم ذاتیات اور مقامی معاملات سے بھرے ہوتے تھے۔ (نقوش لاہور طنز ومزاح نمبر ۲۴۳)

ہندوستان کے مشہور شہروں سے پنچ کا نام لگا کر مزاحیہ اخبارات نکلتے تھے۔ نادم سیتاپوری اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"موج ۔۔۔ موج ظرافت، ہوشنگ آباد۔ ظریف، بنارس۔ ظریف ہند (دہلی) شیخ چلی، سیالکوٹ۔ ملادو پیازہ، لاہور۔ جعفر زٹلی، لاہور وغیرہ۔
(انتخاب فتنہ ص ۷)

اس زمانے کے یہ مزاحیہ اخبارات قابل ذکر ہیں

اب ہم ریاض کے طنز ومزاح کا جیتا جاگتا نمونہ "فتنہ وعطر فتنہ" کے ادبی پس منظر کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں نادم سیتاپوری کا یہ بیان ملاحظہ ہو۔

"فتنہ کے پس منظر میں وہ چھیڑ چھاڑ ہے جو دلی اور لکھنؤ کے لوگوں نے بزم آرائیوں میں رزم انگیزیاں پیدا کرنا شروع کر دی تھیں۔ اہل دلی کہتے تھے۔

دلّی کے لوگ لکھنو والوں کے سامنے
چلتے ہیں جیسے شیر غزالوں کے سامنے

اور دوسری طرف یہ دعویٰ تھا۔

دعویٰ زباں کا لکھنو والوں کے سامنے
اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے

اسی ہنگامی دور میں امین الدولہ بارہ دری میں مشاعرہ ہوا، داغ نے مطلع پڑھا۔

گھر سے ان کے نکلے ہم خلقت تماشائی ہوئی
آگے آگے داغ پیچھے پیچھے رسوائی ہوئی

اور صبح ہونے تک لکھنو بھر میں پھیل گیا۔

پیچھے پیچھے داغ آگے آگے رسوائی ہوئی

دوسرا پہلو ملاحظہ ہو۔ امیر مینائی کی "امیر اللغات" کا پہلا حصہ چھپا۔ دہلی کے اکمل الاخبار میں اعتراضات شروع ہو گئے بات یہاں تک بڑھی۔ اکمل الاخبار نے لکھا۔

ایک محفل میں طوائف امیر مینائی کی یہ غزل گا رہی تھی۔

شمشیر ہے سناں ہے کسے دوں کسے نہ دوں
اک جان ناتواں ہے کسے دوں کسے نہ دوں

چنانچہ طوائف جب ردیف پر پہنچی تھی تو ساری محفل بے اختیار ہنس پڑی تھی۔"

(انتخاب فتنہ ناظم سیتاپوری ص ۲۷)

ہم نے دیکھا غدر کے بعد "فتنہ" اس پُر آشوب ہنگامی دور کی یادگار رہے جب کہ دلّی اور لکھنو اسکولوں کے شعراء میں چھڑی ہوئی تھی۔ جب امیر مینائی اور فصیح الملک داغ کے کلام کی مثالیں دے کر کیچڑ اچھالا جا رہا تھا۔ اس رزم آرائی میں اس وقت "اودھ پنچ" اکیلا حصہ لے رہا تھا۔ "ریاض الاخبار" اس حد تک ان مباحثوں میں حصہ لیا تھا، جہاں تک سنجیدہ صحافت کا تعلق تھا اس لیے ریاض الاخبار کے ضمیمے کے طور پر "فتنہ" جاری کیا گیا۔

اختر شہنشاہی میں تحریر ہے کہ

"فتنہ کا پہلا شمارہ ۸ جولائی ۱۸۸۲ء سے نکلا"

"فتنہ" کی نوعیت و اجرار کے بارے میں نادؔم سیتاپوری کے ذیل کے بیان سے کافی روشنی پڑتی ہے۔

"فتنہ" گورکھپور۔ محلہ نخاس۔ ہفتہ وار۔ آٹھ ورق خورد۔ سالانہ ایک روپیہ آٹھ آنے ۔۔۔۔ ریاض الدولہ بہار الملک منشی سید ریاض احمد رئیس خیرآباد۔ مہتمم منشی نظام احمد انداز رئیس خیرآباد۔ پرنٹر لالہ سیتلا بخش کاتب رام بخش۔ مطبع ریاض الاخبار۔ اجرار ۸ جولائی ۱۸۸۲ء

(انتخاب فتنہ ص ۲۸)

فتنہ کے سنِ اجرا کے بارے میں رئیس احمد جعفری کا یہ بیان ملاحظہ ہو۔

"۱۸۸۳ء میں ریاض الاخبار نے اپنی ادبی جولانیوں کے لیے ایک نیا میدانِ عمل منتخب کیا اور "فتنہ" اور "عطر فتنہ" کے نام سے دو ننھے منے اخبار نکال دیے۔

(رندپارسا ص ۲۰۶)

یہ دونوں بعد ازیں ایک ہی اخبار ہو گئے تھے۔

فتنہ کے سنِ اجرا کے بارے میں حسرت موہانی کا بھی ایک بیان قابل توجہ ہے۔

"گورکھپور کا 'فتنہ' مارچ ۱۸۸۳ء میں جاری ہوا۔ حضرت ریاض کی شوخ مزاجی اور برق طبعی نے 'فتنہ' نام تجویز کیا۔ "کلّ داحقر وفتنہ" کی سرخی حسب حال اس کا عنوان قرار پائی۔ وقت کی خوش حالی سے حکیم برہم۔ شاد شوخ نگار اور فطرت، سحر نگار وغیرہ اچھے اچھے لکھنے والے اس کے معاون تھے۔

(نقوش طنز و مزاح نمبر لاہور ص ۳۷۰)

اختر شہنشاہی کا بیان زیادہ معتبر ہے کیوں کہ اس حوالہ میں سب کچھ تفصیل سے دیا گیا ہے اس لیے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ "فتنہ" کا اجرار ۸ جولائی ۱۸۸۲ء کو ہوا۔ اس امر کی تائید میں نادم سیتاپوری تحریر کرتے ہیں۔

"فتنہ کا پہلا دور ۱۸۸۲ء سے شروع ہو کر ۱۸۹۸ء پر ختم ہو گیا۔ میرے پاس ۲۴ مارچ ۱۸۹۸ء کا آخری شمارہ ہے۔ اس پر جلد ۱۷، شمارہ نمبر ۲۲ پڑا ہوا ہے۔"

(انتخاب فتنہ ص ۳۸)

"فتنہ" کی بہت سی فائلیں میری نظر سے گزری ہیں۔ یہ جیبی سائز کا رنگ برنگ۔ چہارشنبہ کے دن۔ ریاض الاخبار کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ جس کے سرورق پر سپلمنٹ ریاض الاخبار تحریر ہوتا تھا۔ شروع شروع میں اس کی ضخامت سولہ صفحہ تھی۔ مگر یکم جنوری ۱۸۸۵ء سے سولہ صفحات "عطر فتنہ" کے نام سے اور بڑھا دیے گئے "عطر فتنہ" اصل میں ایک گلدستۂ شعر وسخن تھا جس میں اس دور کے مشہور گلدستوں کا انتخاب شامل ہوتا۔ اس کے سرورق پر یہ شعر لکھا ہوتا۔

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی

پسلی پھڑک اٹھی نظر انتخاب کی

سولہ صفحات کے اضافے کے بعد دونوں ایک چیز ہو گئے۔

اب ہم "فتنہ" کی ابتدائی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ فتنہ کی اشاعت نے گورنمنٹ کے حکام میں بدگمانیاں پیدا کر دی تھیں۔ لیکن مسٹر ڈیوس سپرنٹنڈنٹ پولس گورکھپور کی مدد سے وہ چلتا رہا اور کامیابی سے شائع ہوتا رہا۔

ریاض "فتنہ" کی فتنہ انگیزیوں کے بارے میں خود تحریر فرماتے ہیں۔

"فتنہ" کی اشاعت کو ابھی پوری سہ ماہی بھی نہ گزری تھی کہ اراکین گورنمنٹ کو بدگمانی ہوئی زور دیا گیا کہ نام تبدیل کیا جائے۔ یہ ناممکن تھا۔ چند روز کے لیے اشاعت رک گئی۔ مسٹر ڈیوس نے دورے سے واپس آنے پر تحریک کی اور ممدوح کی ذمہ داری پر فتنہ، "فتنہ" پھر بیدار ہوا اور برسوں کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ آخر بہ بنائے اتفاقات ایک مقطع میں مجھے کہنا پڑا۔

فتنہ کو پوچھتا ہے کوئی اس ادا کے ساتھ

چھوٹا سا وہ ریاض کا اخبار کیا ہوا

(نثر ریاض خیرآبادی عقیل احمد جعفری ص ۵۳)

اب "فتنہ" کی نوعیت اور نام سے متعلق ریاض کے ایک بیان کا جائزہ لیتے ہیں۔ ریاض تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ بات نصیب ہوئی تو "فتنہ" ہی کو۔ ہر شخص نام ہی سے سمجھ گیا کہ اس مذاق

وضع وصورت کا ہوگا۔ ۔ ۔ فتنہ کی اشاعت کے بعد تو ظریف اخباروں کے نام کے لیے کچھ اور ہی مذاق پیدا ہوا جو اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔

پانٹے خاں، ملا دو پیازہ، جعفر زٹلی، عمر عیار، بیربر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور خدا جانے کیا کیا۔ ۔ ۔ ایک لکھنوی دوست کو سوجھی کہ قیامت نام اچھا ہے۔ ساتھ ہی خیال ہوا۔ فتنہ اشتہار دے چکا جھٹ بدل کر "محشر" نام رکھ دیا۔ ہمارے لٹریچر کی تقلید میں مضامین تو دھوم دھام کے لکھے مگر وہ دو دن کی چاندنی تھی۔ اب تو آواز صور سے بھی 'محشر' صاحب چونکنے کے نہیں۔ ہمارے دوست حکیم غلام رضا صاحب مالک اخبار سر و قدی کی کیفیت سنیے۔ آپ نے "فتنہ" کی تقطیع کا ایک ظریف پرچہ نکال دیا۔ کاغذ بھی رنگین اور ۱۲ صفحہ بھی۔ فرق ہے تو تصویر ولوح میں "فتنہ" کی وضع وصورت کی تقلید والوں میں پہلے شخص یہی ہیں۔ ۔ ۔ پھر نام کتنا سڈول۔ مذاق کا پتلا 'رامپور' نام مضامین سے بڑھ کر اور مضامین نام سے بڑھ کر۔

اچھا 'فتنہ' کی تقلید میں پہلا نمبر تو ان کا رہا۔ دوسرے نمبر میں اخبار "موج زبدا" کے مالک ہیں۔ انھوں نے موج ظرافت کا اشتہار دیا۔ ان الفاظ کے ساتھ ۲۰ مئی ۸۶ء ہے۔ موج ظرافت۔ نام ایک ننھا سا اخبار ٹھیک" فتنہ" کے مطابق ہمارے اخبار کے ساتھ شایع ہوگا۔ (نثر ریاض خیرآبادی عقیل احمد جعفری ص ۱۶۹)

اس کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی 'فتنہ' کے نام اور لٹریچر کی تقلید کرنی چاہی لیکن کامیابی نہ حاصل ہو سکی۔ فتنہ کے سامنے کوئی ظریف اخبار نہ جم سکا۔ اس کی وجہ ریاض کی شوخیٔ مزاح اور مضمون نگاری ہے۔

'فتنہ' کا اشتہار دیا گیا تھا۔ ابھی شایع بھی نہیں ہوا تھا کہ عوام میں مقبول نظر آنے لگا اس کی مقبولیت کے بارے میں ریاض خیرآبادی اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

"اشتہار 'فتنہ' کے ساتھ ہی اس کے نام کی وہ خداداد شہرت ہوئی کہ قیامت کو بھی نصیب نہیں۔ شائقین اتنا بھی انتظار نہ کر سکے کہ اس نمونۂ قیامت کو دیکھ تو

یس منی آرڈر، پوسٹل نوٹ ہر طرف سے ٹوٹ پڑے۔ جب "فتنہ" شائع ہوا تو اور بھی قیامت برپا ہوئی۔ جس وضع و صورت سے یہ نکلا کسی کے ذہن و خیال میں بھی نہ تھا۔ (نثر ریاض خیرآبادی ص ۱۶۹)

فتنہ اتنا مقبول عام تھا کہ ذرا بھی پہنچنے میں دیر ہو جاتی۔ خریداروں کی بے چینی بڑھ جاتی اس سلسلے میں ریاض کا ذیل کا بیان ملاحظہ ہو۔

" فتنہ کمبخت تو ایسی چیز ہے کہ پہنچنے میں ذرا دیر ہوئی اور اس کے مشتاق بیتاب ہوئے۔ اب خط پر خط علیحدہ آ رہے ہیں۔ رجسٹری پر رجسٹری علیحدہ۔ یہ تو آئے دن ہوا ہی کرتا تھا۔ گزشتہ ہفتہ میں ایک صاحب۔ تار مع پر۔ فتنہ کی سالانہ قیمت ۱۲/ اور پرچہ کے لیے تار کا صرفہ ۱۲/ بیشک پرچہ ہو تو ایسا ہو۔ اور شایق ہوں تو ایسے ہوں۔ یہ لوگ ہیں کہ ہم کو "فتنہ" سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔"

"فتنہ" کے قدردانوں کے بارے میں ریاض کا ذیل کا بیان ملاحظہ ہو جس سے فتنہ کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔

" ہم چشم خریدار پر احسان بھی رکھنا نہیں چاہتے بلکہ اپنے قدردانوں کے شکر گزار ہیں۔ والیان ریاست میں نواب صاحب بہادر کا نمبر قدر دانی میں اوّل رہا۔ بعد میں فاضل حسن خوش مسرت سے ہمارا نظارہ کرتے ہیں۔ ہم ان کی قدر افزائی کے ممنون ہیں۔ نازیباں پری . . . کے منہ میں پانی بھر آیا ہو گا کہ شاید ہمارا نام بھی لیا جائے۔ ان کافروں کا شکر گزار ہونا فرشتوں کو گھر دکھانا ہے۔"

(نثر ریاض خیرآبادی ص ۱۷۲)

ریاض خیرآبادی کا یہ چھوٹا سا اخبار معیاری صحافت و ظرافت کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ جس کے متعلق پہلے ہی دن سے یہ خیال تھا۔

ع ابھی فتنہ ہے کسی دن یہ قیامت ہوگا

"فتنہ" کو اس دور میں ظریفانہ صحافت میں جو اہم مقام حاصل تھا اس کے متعلق مشہور صحافی اور ادیب ناصر علی دہلوی اڈیٹر "صلائے عام" لکھتے ہیں۔

"اگر ولایت میں ایسے لکھنے والے ہوں جیسے "فتنہ" میں ہوتے ہیں تو ایک نہ ایک دن وہ سکریٹری آف اسٹیٹ ہو کر رہتے۔

(نقوش طنز و مزاح نمبر ص ۳۰۰)

محمد طفیل صاحب اڈیٹر "نقوش" لاہور "فتنہ اور عطر فتنہ" کی ادبی فضیلت کے بارے میں اپنی رائے اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"یہ پرچے ریاض خیرآبادی نے نکالے اور اودھ پنچ کے زمانے میں ہی نکالے یہ پرچے اودھ پنچ کی ٹکر کے تو نہ تھے مگر ریاض کی شگفتہ بیانیوں نے ان کی حیثیت کو منوا ضرور لیا۔ اودھ پنچ کے ساتھ تو لکھنے والوں کی ایک بہت بڑی ٹیم تھی۔ یہی اس کی حیثیت بھی تھی ورنہ اکیلے سجاد حسین نا کیا کرتے۔ مگر ادھر قریب قریب ریاض اکیلے ہی تھے۔ ان پرچوں کے بارے میں بھی ہماری یہی کوشش رہی کہ ان پرچوں کے انتخاب سے زیادہ اس پرچے کے عام معیار اور روش کا اندازہ ہو سکے۔ بہرحال طنز و مزاح کے سلسلے میں ان کے پرچوں کو کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جب حقیر صورت ریاض نے اپنے آپ کو بھی نہ بخشا ہو تو اوروں کی تو بات ہی جانے دیں۔ اگر آپ نے ریاض کی تصویر دیکھی ہے تو پھر ان کا یہ شعر بھی دیکھیے۔

بڑے نیک طبیعت بڑے صاف باطن
ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں (نقوش طنز و مزاح ص ٦)

جناب ڈاکٹر خورشید الاسلام اپنے مضمون "طنز و ظرافت" میں "فتنہ و عطر فتنہ" کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"ریاض الاخبار کے ساتھ ریاض خیرآبادی نے دو مزاحیہ رسالے "فتنہ اور عطر فتنہ" کے نام سے نکالنے شروع کئے جن کا مقصد انقلاب یا اصلاح نہیں۔ آسودگی تھا۔ ان کے بارے میں یہ تبصرہ کافی ہے۔ ع بلبل چہک رہا تھا ریاض جمال میں۔ آپ چاہیں تو اس جمال کو فریب بھی کہہ سکتے ہیں۔ (نقوش طنز و مزاح نمبر ص ۲۰)

غرض کہ "فتنہ اور عطر فتنہ" نے اردو ادب میں ایک خاص شہرت حاصل کی تھی۔ دراصل ریاض کی چنچل طبیعت نے اس میں شوخی کی بجلیاں بھر دی تھیں۔

فتنہ و عطر فتنہ کا پہلا دور

(۱۸۸۳ء سے ۲۴ مارچ ۱۸۹۸ء)

"فتنہ" کا یہ دور ۱۸۸۲ء سے شروع ہوتا ہے اور یہ وہ مبارک سال ہے جب کہ ریاض نے گورکھپور سے فتنہ، ریاض الاخبار کے ضمیمے کی حیثیت سے نکالنا شروع کیا۔ اس وقت اس کی ضخامت سولہ صفحے تھی اور یکم جنوری ۱۸۸۵ء سے سولہ صفحات "عطر فتنہ" کے نام سے اور بڑھا دیے گئے اور دونوں ایک چیز ہو گئے۔ نادم سیتاپوری کے بیان کے مطابق اس دور کا آخری "فتنہ" کا شمارہ ۲۴ مارچ ۱۸۹۸ء کو نکلا ہے۔ یہ دور مکمل طور سے ریاض ہی سے متعلق ہے۔ اس کے بعد سے حکیم برہم کی ذات "فتنہ و عطر فتنہ" کی صحافت پر چھا جاتی ہے۔ اور اس کا تعلق ریاض سے براہ راست بہت کم رہتا ہے ہم اس دور کی "فتنہ" کی فائلیں مدنظر رکھ کر ریاض کے طنز و مزاح کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

پہلے سب سے پہلے فتنہ کا القاب و آداب بھی ملاحظہ ہو۔

ڈیئر فتنہ ۔۔۔ ٹوکروں تسلیم اور گاڑیوں سلام۔ (فتنہ ۱۲ فروری ۱۸۸۶ء)

"فتنہ و عطر فتنہ" اپنی ادبی چوٹوں کے لیے ہمیشہ طنز و مزاح کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا رہے گا۔ ذیل کا ایک ادبی لطیفہ بعنوان بارسٹر ملاحظہ ہو۔

"پیارے لال جو امتحان "بارسٹری" پاس کر کے آئے ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ لکھا ہوا تھا، بارسٹر، مگر پڑھا گیا بارشٹر۔ پڑھنے والے صاحب ہمارے دفتر میں پوچھنے آئے کہ صاحب بارشٹر کون عہدہ ہے جو ولایت سے امتحان پاس کرنا پڑتا ہے۔

ہم یہ سن کر اس لیے خوش ہوئے کہ ترقی کا زمانہ ہے۔ بارشٹر نے کی بارسٹر پر ترقی کی۔ (فتنہ جلد ۶ شمارہ ۵۔ ۲۱ فروری ۱۸۱۶ء)

اس لطیفہ میں بارسٹر کی ترقی، بارشٹر میں ویسی ہی قابلِ دید ہے جیسی کسی وکیل کی یا شہرا "بارشٹر" میں۔

ریاض کے طنز و مزاح میں کچھ مذہبی شوخیاں بھی ملتی ہیں۔ ذیل کی عبارت ایسی شوخی کی ہے۔

جاگتی تصویر ہے۔

مہدی کا زندہ ہونا سن سن کر فتنہ نے لکھ دیا تھا کہ آپ اس مرتبہ بھی شریک تھے۔ پر اس پر کون نظر ڈالتا ہے غلط ہے یا صحیح۔ اخباروں میں نقل ہو کر ... لوگوں کے دلوں میں جا بیٹھی اور طرح طرح کے "باندھو" باندھے گئے۔

(فتنہ ۲۱ فروری ۱۸۸۶ء)

فتنہ میں زیر عنوان "لوکل" کچھ ایسے مضمون نکلتے تھے جو واقعی لوکل ہوتے تھے ان کے طرز تحریر کی جدت تو ذرا ملاحظہ ہو۔

ٹک ... دڑ ... دڑ ... گھوڑا ... (فتنہ ۲۱ فروری ۱۸۸۶ء)

رسالہ کے فتنہ میں مزاحیہ کلام اور غزلوں کے علاوہ برہا اور منہ کا شاعری کے نمونے بھی ملتے ہیں ذیل کا ایک برہا ملاحظہ ہو۔

تڑپت برہا بروگ سے بہورا ... پیو پیو اب تن بول پپیہرا
پیو پیو کہہ کان توڑت ہے ... آپ پیا بن چھاتی پھٹت ہے
ان اور جل ہوہے کچھ نہ بھاوے ... پیو پیو کی جب سبد سناوے
ناٹڈا لاد چیلا بنجارہ ... اب سمان پڑا سنسارا
سنو موری سکھی سہیلی ... موکر بالم کہیں اکیلی

(فتنہ ۲۱ فروری ۱۸۸۶ء)

اس برہا کا بروگ اور فلسفیانہ پہلو قابل دید ہے

اب ہم فتنہ کے سیاسی پہلو اور سیاسی خدمات پر ایک نظر ڈالتے ہیں فتنہ کی سیاسی چوٹیں قابل دید ہیں۔ جس کے نمونے ذیل میں دیے جاتے ہیں۔

... بات ہے ... راقم سرسید کا ہم جان ... ارے میاں دودھ ... ق کی بات ہے۔ دہی کے دھوکے کپاس کھانے کی نہ ٹھہرا دینا ...

... لیے۔ یونان کے لیے ... ہماری رائے ہے کہ ہندوستان یونان کی ماتم کا اہتمام سرسید کے سپرد کر دیا جائے تو سینہ کوبی اور خوں فشانی میں۔

رنگ چوکھا آجائے گا۔ کیوں کہ سرسید کو فتح ٹرکی کی کچھ خوشی نہیں سرسید یونان ہی جاکر ماتم کریں۔ ہے دھوم سے ہوگا مرا ماتم تمہارے سامنے۔ فتنہ صلاح ماہمہ آلست کان صلاح شماست۔ (فتنہ ۸ جولائی ۱۸۹۰ء)

اودھ پنچ کے مضمون میں سرسید کے سیاسی خیالات کا مذاق اڑانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ریاض اور اکبرالہٰ آبادی دونوں سرسید کی تحریکوں اور خیالات کے برعکس خیالات رکھتے تھے۔ ایک اور مضمون اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو جس کا عنوان ٹرکی اور سرسید ہے جو کہ اودھ پنچ سے منقول کیا گیا ہے۔

ٹرکی:۔ سلام علیک (سرسید منہ پھیر لیتے ہیں)

ٹرکی:۔ اجی سید صاحب سلام علیک

سرسید:۔ ۔۔۔۔ ہوکر۔ کون صاحب؟ معاف فرمائیے گا۔ میں نے پہچانا نہیں

ٹرکی:۔ ایں۔ آپ نے اور مجھے نہیں پہچانا؟

سرسید:۔ مجھے تو ایسا ہی خیال ہوتا ہے۔

ٹرکی:۔ آپ پر حملوں کی بوچھار ہوئی تھی تو ابھی کل تک آپ مجھی کو سپر بنائے تھے۔ لال ٹوپی سے اس نحیف سر کو ڈھکا۔ یہ کوٹ میرا ہی اتارن ہے۔ یہ ڈھیلا پتلون میرا ہی عطیہ ہے۔ کیا آئینے میں صورت نہیں دیکھتے

سرسید:۔ سٹ پٹا کر۔ حضرت! آپ بڑے منہ پھٹ۔ بے باک ہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ تو سب کچھ ہے مگر پولیٹیکل مصلحت ہی ایسی ہے۔

ٹرکی:۔ اچھا تو اتاریے ہماری پوشاک۔ وہی چار کان والی ٹوپی پہنیے۔ جو پہلے پہنتے تھے یا انگریزی ٹوپی مانگ کر لائیے۔

(سرسید بیچارے سر سے ٹوپی اتار کر چپکے سے توالے کر دیتے ہیں)

ٹرکی:۔ اور یہ ترکش کوٹ۔ (دامن کھینچ کر۔)

سرسید:۔ بہت اچھا لیجیے (کوٹ بھی دیتے ہیں)

فیض اور بنیان آپ کے نہیں ہیں۔ میں نے انگریزوں سے لیے ہیں۔
ٹرکی:۔ اچھا، یہ ڈھیلا پتلون اتاریے یہ بھی ہمارا ہے۔
سرسید:۔ مجھے کیا عذر ہے مگر ستر پوشی کو تو کچھ دیجیے۔
ٹرکی:۔ یہ گلے کے ریشمی رومال کی لنگوٹ باندھ لو۔ تم اس پوشاک کے لائق نہیں بیچارے نے وہ بھی حوالہ کردیا۔)
ٹرکی صاحب تو اپنی پوشاک لے کر چلتے ہیں۔ اور سرسید ہیں رہے غسل خانے میں بیٹھے سوچتے رہتے ہیں کہ اب کون پولیٹیکل پوشاک اختیار کروں۔" (فتنہ ۸ اگست ۱۸۹۰ء)
ہم نے دیکھی کہ ' فتنہ ' میں کچھ مضامین، اودھ پنچ وغیرہ سے منقول کیے جاتے تھے۔ ایسے سیاسی پہلے اور زیادہ تر سرسید یا ان کے پیرو کاروں سے متعلق تھے۔ یہ مضامین "فتنہ" کی شوخ بیانی کی ایک بیتی جاگتی تصویر تھے۔ ایک اور مضمون زیر عنوان معقول ملاحظہ ہو۔

"کچھ ہفتے ہوئے ایک جنٹلمین "گلاسکو" کے متصل ایک پبلک باغ میں گھاس پر چلنے کی علت میں پکڑا گیا۔ اور وہ بھی اس جگہ جہاں ایک نوٹس ممانعت کا لگا ہوا تھا کہ ۔ ۔ ۔ ۔

جنٹلمین عدالت کے روبرو لایا گیا۔
مجسٹریٹ:۔ آپ اپنی برأت کا کیا عذر پیش کرتے ہیں۔
مجرم:۔ حضور اس نوٹس کی وجہ سے مجھ کو یہاں آپ دیکھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔
جب میں نے نوٹس دیکھا تو میں اس کا مطلب نہ سمجھا۔ اور جب میں اس کو پڑھنے جارہا تھا تو ۔ ۔ ۔ ۔
مجسٹریٹ:۔ اچھا جائیے۔ آپ کی خطا معاف لیکن آئندہ احتیاط رکھیے گا۔
(فتنہ ۱۶ اگست ۔ ۔ ۔)

ریاض کے "فتنہ" اور "عطر فتنہ" میں کچھ ریاض کے خمریات کا حصہ بھی شائع ہوا کرتا تھا۔ ساقی نامہ جو ۱۸۸۲ء میں "فتنہ" میں شائع ہوا ہے۔ اس کے چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ (ساقی نامہ از فتنہ ۱۸۸۲ء)

ساقیا مجھے یک جام دینا　　بھر کر مے لالہ جام دینا
دھانی چوڑی کا عکس پڑ جائے　　تحریر زمرد میں نظر آئے
مستانہ ادا نہ آس توڑے　　لغزش نہ کہیں گلاس توڑے

نگاہ ناز شرمائی ہوئی ہے　　ہماری یاد کچھ آئی ہوئی ہے
لب خاموش میں طرز تکلم　　یہاں گھونگھٹ میں موتیوں کا تبسم

نہ چھریرا بدن نہ بکھرے بال　　نہ وہ کافر کی لڑکھڑاتی چال
نہ وہ آنچل کا ڈالنا ہر بار　　نہ دوپٹہ سنبھالنا ہر بار
یہ دن ہیں بہار زندگانی　　بچپن کچھ ہے تو کچھ جوانی
چٹخارے نئے زباں کے ہیں　　آفت ہے کہ دن اٹھان کے ہیں
اچھا نہیں شام کا نکلنا　　اچھا نہیں نام کا نکلنا

۲۔ ساقی نامہ

خوشی کا سبب ہم جانتے ہیں　　تبسم کی ادا پہچانتے ہیں
کلائی کے لچکنے کا یقیں ہے　　بھرا ساغر چھلکتا کیوں نہیں ہے

مندرجہ بالا ساقی نامہ سے ریاضؔ کی خمریہ شاعری کی ایک جھلک نمودار ہوتی ہے۔ منظر نگاری، جذبات اور طرز بیان قابل تحسین ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ کہا ہے وہ سب تجربہ کی بنا پر کہا ہے۔ ان کی ندرت۔ الفاظ کی نگینہ کاری کو اور بہتر بنادیتی ہے۔

اس ساقی نامہ سے ایک بات اور صاف ہوجاتی ہے کہ فتنہ کا سن اجرا ۱۸۸۲ء ہی ہے اور جیسا کہ کچھ لوگوں کا خیال ۱۸۸۵ء ہے، یہ غلط ہے۔ اب ہم فتنہ و عطر فتنہ کے اس دور کے نامہ نگاروں کے مضامین کے کچھ نمونے پیش کرتے ہیں۔

ذیل کے مضمون میں شوخ ظریف نے 'خ' کے خراٹے اور 'ق' کی خوبیوں کی بھرمار

...ہے۔ مضمون کا عنوان ہے۔ "یا وحشت"

راقم۔ میرے رونے پہ لگی رہتی ہیں آنکھیں سب کی

شوخ ظریف پٹنہ

اس مضمون سے شوخ ظریف صاحب کی شوخی اور ظرافت دونوں ظاہر ہیں۔

منشی جی:۔ نوکر سے، ہمارا قلمدان تو لانا

نوکر:۔ خبد۔ قلمدان میں نہ قلم ہے۔ نہ چاقو، نہ قط زن۔ نہ قینچی

منشی جی:۔ کھی قاف تو بولے ہوتے۔

نوکر:۔ بہت توبہ

بس یہی حال ان دنوں بارش کا ہے۔

زمیں ہے خاک۔ دریا ہے خاک پہاڑ ہے خاک یا ابر برسنے لگے تو آٹھ دن کی مہلت نہیں۔ خوب چھوٹا، ۔۔۔ کی ٹھہر گئی

یارو مجھے ڈر ہے کہ کہیں آج کل۔ ملک قیامت نا تشریف لے آئیں

قیامت نامہ آپ نے پڑھا ہوگا۔ بادل برسیں گے تو تھمیں گے نہیں اور تھمے تو برسیں گے نہیں۔ ہر طرف عالم آب ہوگا۔ یا قطرۂ آب نایاب۔"

(فتنہ اگست ۱۸۹۷ء)

حق شناس

فتنہ کے نامہ نگار حق شناس کے مضامین کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ وہ موسمی رات کے زیرِ عنوان تحریر فرماتے ہیں۔

"آئی بہار ساقیا۔ جام شراب دے"

پھول کھلے پھلے شجر، ابر اٹھا، ہوا چلی۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ کالی کالی گھٹائیں قبلہ کی سمت سے جھومتی جھامتی ناچتی گاتی آئیں تو اندر والا ۔۔۔ کہہ اٹھتا۔

کیا کیا خوشامدیں ہیں کرپی لوں بہاریں
بادل کے ٹکڑے سہ پہرے چھائے جاتے ہیں (ریاض)

بجلی چمکی اور کوئی چمک کر پہلو میں آگیا۔ اُف کسی کو بجلی کی چمک نے چونکا دیا اور ہم کو کسی کی آنکھوں کی چمک نے۔ وہ آنکھیں جن میں سرخ ڈورے بجلی کی تحریر معلوم ہوتے تھے۔ آنکھوں کی چمک جو بجلی گراتی تھی۔ وہ اب کہاں

وہ رُت بدل گئی وہ ہوائیں بدل گئیں
بہار ہتا سے ارتقا کی بنائیں بدل گئیں

مگر یہ سب خوش قسمتی کے کرشمے ہمارے حصہ میں نہیں آئے کیسے آتے، نہ جوانی نہ شباب۔ روپیہ خرچ کرنے میں ہم پورے منظم۔ بڑھاپے کی علامتیں۔ گالوں۔ بالوں اور تمام ظاہر و پوشیدہ . . . سے ظاہر۔ پھر یہ شاخ طوبیٰ پر نشیمن بنانے والی اور آسمان پر . . . . . . ابابیلیں دانہ چگنے ہمارے گھر کیوں آنے لگیں۔ کاش۔ افسر ہوتے یا کسی تھیٹریکل کمپنی کے منیجر سے سانٹھ گانٹھ ہوتی تو پھر یہ ہم کو دیکھ کر یوں نہ بھاگتے

مضمون ریاض کا معلوم ہوتا ہے۔ ان کی زبان ہے۔ ان کا طرز بیان ہے۔ ان کے اشعار ہیں اور انھیں کا رنگ شباب ہے۔ شاید ریاض "فتنہ وعطر فتنہ" میں حق شناس کے نام سے لکھا کرتے تھے۔

"ایک اور نامہ نگار درخشاں کی بھی پھلجھڑی دیکھیے۔ چند چیزیں چند چیزوں کو بڑھاتی ہیں" (راقم درخشاں)

بحث۔ علم کو۔ سیاست سلطنت کو۔ علم عزت کو۔ خلق محبت کو۔

تجارت مال کو۔ عبادت کمال کو۔ (فتنہ ۲۱ فروری ۱۸۸۶ء)

۱) اب ہم کچھ مضامین۔ شوخ نگار، نامہ نگار "فتنہ" کے پیش کرتے ہیں۔ وہ زیر عنوان "پہچان" لکھتے ہیں۔

۱۔ لندن کے شریف کی پہچان۔ جو داڑھی منڈائے۔ بر سر سڑک نہائے۔
۲۔ روس کے شریف کی پہچان۔ جو عورت بغیر شادی لڑکا جنے۔ وہ لڑکا درجہ اوّل کا شریف ہے۔
۳۔ روس کے شریف کی پہچان۔ جس کا نام مندرج گزٹ ہو۔ عہدیدار انگریزی مربی ہو
۴۔ شائستہ کی پہچان۔ کالا منہ۔ لال سر۔ پاؤں میں بوٹ۔ ہاتھ میں چرٹ۔ کشادہ رو۔ لہجہ....

راقم میں تمھیں حشر کے دن لاکھ میں پہچان گیا
میں بھلا کون ہوں میرا تو پتہ دو مجھ کو

(فتنہ ۲۱ فروری ۱۸۸۶ء)

(ب) دوسرا مضمون شوخ نگار کا ملاحظہ ہو۔

"چین لکھتی ہے مرے واسطے قسمت میری
کہاں کس کو چین ہے

پولیس میں	تحقیقاتی کو
دیوانی میں	اس عدالت کو
لگن بیاہ میں	یکہ بانوں کو
جنگ سلاطین میں	اہل اخبار کو

س) تیسرا نمونہ پیش نظر ہے۔

"بھول جانا چاہیئے"
اپنی عطا کو۔ دوست کی خطا کو۔ عزیز آوارہ کو۔ خواہش نفس امارہ کو

د) ناقابل اعتبار

حیات مستعار، دولت بیشمار۔ زن فرمانبردار۔ شمشیر آبدار۔ اسپ شائستہ اطوار۔ دوستی شاہان۔ چاپلوسی دشمناں۔

(فتنہ ۱۲ فروری ۱۸۸۶ء)

اوپر کے ادبی پارے نصیحت کا مرقع ہیں جو کہ ادب اور دنیاوی تجربہ دونوں کی ترجمانی کرتے ہیں یہ "شوخ نگار" کے قلم سے نکلے ہیں۔

مندرجہ بالا مضامین کو دیکھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ طنز و مزاح صرف ریاض کی ذات تک محدود نہ تھا بلکہ اس طنز و مزاح کے رنگ میں اس دور کے کچھ لکھنے والوں کو رنگ دیا گیا تھا۔ اور اس طرح ریاض نے اردو ادب میں طنز و مزاح سے متعلق نامہ نگاروں کی ایک ٹیم تیار کی تھی جن کی قلم فرسائی ہمیشہ کے لیے ادب میں جاوداں رہے گی۔

"فتنہ و عطر فتنہ" پر تبصرہ کے سلسلے میں ریاض کے طنز و مزاح کی خامیاں ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ریاض کے "فتنہ" میں کچھ غلط الفاظ کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اس کو شوخی کی انتہا کے نام سے بھی موسوم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس سے ان کی ظرافت کا رنگ پھیکا ہی نظر آتا ہے۔ مثلاً

۱۲ فروری ۱۸۸۶ء کے فتنہ میں جو مضمون 'لال بیگی' کے زیر عنوان شائع کیا ہے اس میں "گوا بکھیری" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

فتنہ کا دوسرا دور

(۱۸۹۸ء سے ۱۹۱۲ء)

"فتنہ و عطر فتنہ" کا دوسرا دور ۱۸۹۸ء سے شروع ہوتا ہے اور شاید یہ ۱۹۱۲ء تک چلتا رہا۔ اس دور میں ریاض "فتنہ و عطر فتنہ" سے براہ راست متعلق نہیں رہے۔ لیکن ریاض کی شخصیت ادبی معاملہ میں پورے طور سے اخبار پر چھائی رہی۔ انتظامی معاملات اور دیگر ذمہ داریاں حکیم برہم کے سپرد ہو گئی تھیں۔ ۱۹۱۲ء کے بعد جب "فتنہ" بند ہو گیا تو حکیم برہم نے "رجسٹریشن ریویو" کے نام سے ایک قانونی رسالہ اور جاری کیا تھا۔ جس میں زیادہ تر رجسٹریشن ایکٹ سے متعلق مضامین نکلا کرتے تھے۔ اب ایک تاریخی قصیدہ ملاحظہ ہو۔

مصلح کل فتنہ عطر فتنہ ریاض
چار سو مشتہر جوں عالم خبر
خوش بہار ریاض الاخبار ہے
تاریخ فتنہ نازک طبع (۱۹۰۵ء)

خدایا بیسویں سالگرہ فتنہ کو مبارک ہو۔ ہاشمی صفی پوری۔ فتنہ وعطر فتنہ ۴ جنوری ۱۹۰۵ء)
قصیدہ فتنہ کی بیسویں سالگرہ کے سلسلے میں کہا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ ۱۹۰۵ء میں بھی ریاض کا تعلق پورے طور سے فتنہ سے تھا۔ اب ذرا ذیل کا اعلان ملاحظہ ہو

اعلان

ہر بدھ کو فتنہ وعطر فتنہ شایع ہوتا ہے۔
قیمت بغیر محصول ... محصول سالانہ پیشگی ... آنے پر روانہ ہوگا۔
ولایتی ساخت کی جلد فتنہ وعطر فتنہ حسب ذیل ہے۔
۱۹۰۳ء ۱۹۰۴ء ۱۹۰۵ء جملہ خط و کتابت و ترسیل زر حکیم برہم پرو پرائٹر و پرنٹر کے نام ہونا چاہیے۔ ریاض الاخبار پریس گورکھپور میں چھپا۔ (فتنہ وعطر فتنہ نمبر ۲ جلد ۲۳، ۸ جنوری ۱۹۰۸ء)

اس اعلان سے صاف ظاہر ہے کہ فتنہ وعطر فتنہ اب حکیم برہم کی ملکیت میں آگیا تھا لیکن اسی طرح بدھ کو شائع ہوتا تھا۔ اس سے سالانہ چندہ وغیرہ کی بھی نشان دہی ہوتی ہے۔
ایک بیان قارئین فتنہ کو آگاہی کے سلسلے میں ملاحظہ ہو۔

مئی ۱۹۰۳ء سے "فتنہ وعطر فتنہ" ہمارے خاص اہتمام سے نکلتا ہے۔ اس وقت تک ہم نے ایک تعطیل لی اور نہ کسی ہفتہ کا پرچہ بند کیا ... جن صاحبوں کے پاس پرچہ ایک ہفتہ کے اندر نہ پہنچے کارڈ لکھیں، تاکہ صاحب پوسٹ ماسٹر کے پاس کارروائی کی جا سکے۔
حکیم برہم پرو پرائٹر و پرنٹر و پبلشر نے شائع کیا۔
مطبوعہ مطبع حکیم برہم گورکھپور۔ (فتنہ ۱۵ ستمبر ۱۹۰۹ء)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ "فتنہ" حکیم برہم کی ملکیت میں بھی اپنا معیار قائم کئے ہوئے تھا۔ اور اس کے انتظامات بھی بدستور ٹھیک تھے۔

اس دور میں بھی ریاضؔ کے مضامین "فتنہ" میں شائع ہوا کرتے تھے۔ مضامین معیاری اور طنز و مزاح کا جیتا جاگتا نمونہ ہوتے تھے۔ ذرا پیر مۓ فروش کی حلیہ اور سیرت کی عکاسی ملاحظہ ہو؛

سر گھٹا ہوا۔ داڑھی کا صفایا۔ لمبی لمبی مونچھیں مگر سن سفید۔ ایک بال بھی سیاہ نہیں موٹے اتنے کہ در میکدہ میں خم کی طرح ان کا نکلنا دشوار ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔

رند کبھی کبھی ان کا گھٹا ہوا سر دیکھ کر پہچان جاتے ہیں۔ کیا عجب ہے انہی کے لیے حضرت ریاضؔ نے کہا ہو۔

واعظ کے سر پہ ایک جمائی تڑاق سے
اندر ہاتھ مل رہا ہوں کہ اچھی پڑی نہیں
۔ ۔ ۔ ۔ داڑھی تو آپ کے ہے نہیں جو شرمائیں ۔
شرماؤ ریاضؔ میکشی سے ۔ لمبی داڑھی ہے ہاتھ بھر کی
راقم ۔ ہمیں تو ہیں (شاید ریاضؔ)

(فتنہ وعطر فتنہ ۲۲ جون ۱۹۱۰ء)

اسی دور کے ایک مضمون سے "فتنہ" اخبار کی تعریف ملاحظہ ہو۔ 'فتنہ' اخبار کیا ہے۔ ایک زمانہ میں ہمارے دوست حضرت ریاضؔ نے فرمایا تھا۔

"فتنہ" کو پوچھتا ہے کوئی اس ادا کیسا تھ
چھوٹا سادہ ریاضؔ کا اخبار کیا ہو

اس شعر کی سچی داد تو جناب امیرؔ مرحوم نے دی تھی ۔ ۔ مگر ہمارے پوسٹ ماسٹر صاحب بہادر بھی اعلیٰ درجہ کے شاعر نازک خیال ہیں جنھوں نے ہم کو اطلاع دی ہے کہ 'فتنہ" رجسٹرڈ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں خبریں نہ ہوں۔

اب حضرت ریاضؔ کی فکر رسا کی تعریف کی جائے تو زیادہ مبالغہ نہیں۔ مگر حضرت ریاضؔ کو یہ خبر نہ تھی کہ بجائے ایک چلتے ہوئے ناز آفریں کے کوئی اور بھی ستم آفریں اس کی

تائید کرنے والا ہے۔

بہر حال اب ولایت اور ہندوستان کی وہ خبریں جنوری ۱۹۰۸ء سے درج ہونے لگیں جو مذاق سخن کی جان اور واقعات کی شان کہی جا سکتی ہیں۔

(فتنہ و عطر فتنہ ۱۵ دسمبر)

اوپر کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ "فتنہ" میں اس دور میں بھی وہ خبریں شائع ہوتی تھیں جو مذاق سخن سے متعلق ہوں یا واقعات میں کوئی خاص دلچسپی کا موضوع سے ہوئے ہوں۔

اس دور کے "فتنہ و عطر فتنہ" میں بہت سی ادبی تنقیدوں کی مثال ملتی ہے دیا شنکر نسیم کا گلزار نسیم پر بہت کچھ اچھالا گیا ہے۔ (فتنہ ۸ مارچ ۱۹۰۵ء) اس دور کے "فتنہ و عطر فتنہ" کے چند امتیازی لطیفے درج کیے جاتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ طنز و مزاح میں یہ اخبار اپنا معیار قائم کیے ہوئے تھا۔

لطیفے

۱۔ جمع خرچ برابر

جان :۔ مجھے رشک آتا ہے کہ اب بھی تم اپنی بیوی سے اظہار الفت کرتے ہوئے سرگرم معلوم ہوتے ہو۔

ولسن :۔ بیشک مگر تمہارا کیا حال ہے۔

جان :۔ ادھر تو یہ حالت ہے کہ تمام سرمایۂ محبت فضول خرچی کے ساتھ کورٹ شپ میں ختم ہو گیا اور اب وہ میرا منہ دیکھتی ہیں اور میں ان کا۔ ۔ ۔"

(فتنہ ۲۵ جولائی ۱۹۰۲ء)

ب۔ مثال :۔

استاد :۔ بتاؤ کہ بے دانت کا جانور کون ہے ؟

چھوٹا لڑکا :۔ جناب وہ میرے یہاں موجود ہے

استاد :۔ کون ؟

چھوٹا لڑکا :۔ وہ میری نانی ہیں۔ (فتنہ ۲۵ جولائی ۱۹۰۶ء)

اس دور کے "فتنہ وعطر فتنہ" میں کچھ فحش بیانی کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔ ان کو ہم شوخی بیان کی انتہا کے نام سے بھی پکار سکتے ہیں۔

چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

مس گلبرٹ کا بیان

گلبرٹ کی گل افشانی سن کر آپ لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑیں گے ۔ ۔ ۔ غنچہ دہن گلبرٹ مدت سے آغوش میں تنگ آرہی ہیں اور وہ ناشگفتہ کلی کو پھول بنا رہا ہے۔

کیا نڈر ہو کے شب وصل وہ آ بیٹھے ہیں
جانتے ہیں کہ بچا لے گی نزاکت میری — حضرت ریاض

گلبرٹ کہتی ہے کہ میری عمر چودہ سال کی ہے۔

باقی نہ دل میں ایک بھی پارسا ہوس رہے
چودہ برس کی عمر پہ لاکھوں برس رہے

(فتنہ ۸ جولائی ۱۹۰۳ء)

ایسا ہی ایک اور بیان ملاحظہ ہو۔

"جو ستائیں ہمیں۔ اللہ ستائے جائیں"

از رپورٹر

مس ۔ ۔ ۔ کی عمر پندرہ سال ہے عفت وعصمت میں حوروں کی مثال ۔ ۔ ۔ مور (صاحب) گارڈ نے ہمدردی کی۔ تیسرے درجے سے دوسرے درجہ میں لائے حسن جہاں سوز نے اس کے خرمن ضبط واستقلال کو جھلس دیا۔ لڑکی نے غل مچایا مسافر آگئے چنڈو ۔ ۔ ۔ دھرے گئے۔ چالان ہوئے۔ مجسٹریٹ نے سو روپیہ جرمانہ کر کے رہا کر دیا۔ (فتنہ وعطر فتنہ ۱۴ فروری ۱۹۰۶ء)

اس دور میں بھی بلند پایہ کے شعراء کی غزلیں "فتنہ وعطر فتنہ" میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ یہاں پر

چند نامور شعرا کی غزلوں کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

اقبال

اجالا جب ہوا رخصت جبین شب کی آستاں کا
نسیم زندگی پیغام لائی صبح خنداں کا (پوری غزل)

فتنہ وعطر فتنہ ۲۳ دسمبر ۱۹۰۳ء

اکبر الہ آبادی

تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

(فتنہ وعطر فتنہ ۲۳ دسمبر ۱۹۰۸ء)

فتنہ وعطر فتنہ میں اکبر الہ آبادی کے کلام کے نمونے بہت زیادہ نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا کلام مزاحیہ اور انگریزی تہذیب پر طنز کرتا ہے۔ اور یہی اخبار کی پالیسی بھی تھی۔

پروفیسر ریاض الرحمان شروانی

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد (۱۸۷۷ — ۱۹۴۷ء) کا ایم۔ اے۔ او کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بہت قدیم اور قریبی تعلق تھا۔ وہ ایم۔ اے۔ او کالج کے طالب علم، استاد، پرنسپل اور مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر، وائس چانسلر اور ریکٹر رہے تھے۔ ان کے تعلق کی یہ مدت زمانۂ طالب علمی سے آخر عمر تک ۵۸ برس پر حاوی تھی۔ اس ادارے سے اتنی بلکہ اس سے بھی زیادہ طویل مدت تک بعض اور لوگوں کا تعلق بھی مختلف حیثیتوں سے رہا ہے بلکہ آج بھی ایسے لوگ بقید حیات ہیں جن کے تعلق کی مدت اس سے کم نہیں ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کے تعلق میں جو گیرائی اور گہرائی تھی اس کا مقابلہ شاید ہی کوئی دوسرا شخص کر سکے وہ ۱۸۸۹ء میں ایم۔ اے۔ او کالجیٹ اسکول میں داخل ہوئے تھے۔ اور اس طرح بانیٔ درس گاہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے اور ان کے تربیت یافتہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب ایک فعال اور متحرک شخصیت کے مالک تھے۔ اس لیے ان کا ایسا ہی قریبی تعلق بعض ایسے اداروں سے بھی رہا تھا جو ایم۔ اے۔ او کالج اور مسلم یونیورسٹی کی امانت اور خدمت کے لیے قائم کیے گئے تھے لیکن اپنی جداگانہ حیثیت رکھتے تھے۔ ایسے اداروں میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور ڈیوٹی سوسائٹی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سر سید نے ۱۸۸۶ء میں اس غرض سے قائم کی تھی کہ وہ مسلمانانِ ہند میں مغربی تعلیم کی ترویج کرے اور انہیں اس کے حصول کی طرف راغب کرے۔

کانفرنس کی سالانہ روداددں پر نظر ڈالنے سے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کا نام سب سے پہلے کانفرنس کے بارھویں سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور ۱۸۹۸ء میں نظر آتا ہے۔ یہ سرسید کی وفات کے بعد کانفرنس کا پہلا سالانہ اجلاس تھا۔ محمڈن یا مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تجویز سب سے پہلے اسی اجلاس میں پیش ہوئی تھی۔ اس تجویز کے محرک مسٹر ماریسن پروفیسر ایم۔ اے۔ او کالج اور مؤید مسٹر شاہ دین بیرسٹرایٹ لا تھے۔ اس تجویز کی حمایت میں جن حضرات نے تقریریں کی تھیں ان میں ڈاکٹر صاحب کا نام بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے علاوہ اس فہرست میں ایسے اکابر کے نام ملتے ہیں۔ جیسے سر سید امیر علی، منشی مشتاق حسین، بدرالدین طیب جی نواب عماد الملک، خواجہ الطاف حسین حالی اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں۔ کانفرنس کے اس اجلاس کی روداد میں ان سب حضرات کی تقریریں کے بارے میں مجموعی طور پر "مدلل اور مبسوط" جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور یہ بھی تحریر ہے کہ "بلا شبہ ان خیالات نے تجویز مذکور میں جان ڈال دی"۔ البتہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کے سوانح نگار منشی محمد امین زبیری نے "ضیائے حیات" میں ڈاکٹر صاحب کی تقریر کی خاص طور سے غیر معمولی تعریف کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ان کی پہلی پبلک اسپیچ تھی۔

ممکن ہے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اس سے قبل بھی کانفرنس کے بعض اجلاسوں میں شرکت کرتے رہے ہوں لیکن اس وقت ان کی حیثیت ایک طالب علم کی رہی ہوگی اور کانفرنس کی کارروائی میں ان کا کوئی خاص حصہ نہیں رہا ہوگا۔ منشی محمد امین زبیری نے یہ ضرور لکھا ہے کہ ۱۸۹۵ء میں (یہی سال ڈاکٹر صاحب کے کالج کی ملازمت کے آغاز کا ہے) کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ شاہجہاں پور کے موقع پر مسٹر آرنلڈ پرنسپل ایم۔ اے۔ او کالج کی ترغیب پر ڈاکٹر صاحب نے شیخ عبداللہ (بانی مسلم ویمنس کالج) کی مشارکت میں ڈیوٹی سوسائٹی کی جانب سے چائے کی دکان کھولی تھی۔ جب سرسید کی وفات کے بعد سرسید میموریل فنڈ قائم ہوا تو ڈاکٹر صاحب اس کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے۔ سرسید کی خواہش تھی کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں منعقد ہو لیکن کسی نہ کسی وجہ سے ان کی زندگی میں ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی

ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین نواب محسن الملک نے ان کی اس خواہش کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا اور اس غرض سے ان کی نگاہِ انتخاب نوجوان ضیا رالدین احمد پر پڑی۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو کلکتہ بھیجا جہاں انھوں نے کئی ماہ قیام کر کے سرسید میموریل فنڈ کے لیے چندہ بھی جمع کیا اور کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے انعقاد کی کوشش بھی کی۔ چناں چہ ۱۸۹۹ء میں کانفرنس کا سالانہ اجلاس پہلی مرتبہ کلکتہ میں منعقد ہوا اور اس کی صدارت جسٹس سید امیر علی نے فرمائی۔

ن تمام شواہد کے باوجود ۱۸۹۸ء کے بعد کانفرنس کے جس سالانہ اجلاس میں ڈاکٹر صاحب کی عملی شرکت کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس میں ان کی شرکت بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ اس میں انھوں نے آٹھ تجاویز پیش کیں اور وہ سب اتفاق رائے سے منظور ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے چھ برس یورپ میں گزار کر اسی سال ہندوستان واپس آئے تھے اور وہاں سے مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں جو خیالات ذہن میں لے کر آئے تھے، چاہتے تھے کہ کانفرنس کے پلیٹ فارم سے انھیں مسلمان زعمار کے سامنے پیش کریں۔ ان میں بعض اہم تجاویز یہ تھیں۔ علی گڑھ میں ایک اسکول میوزیم قائم کیا جائے، تعطیل کے زمانے میں طلبہ کے لیے توسیعی لکچروں کا اہتمام کیا جائے، مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کا آغاز ہونا چاہیے۔ اسلامی تاریخ کی تدریس پر خصوصی توجہ مبذول کرنی چاہیے۔ گویا ڈاکٹر صاحب کانفرنس کے اسٹیج پر جب باقاعدہ نمودار ہوئے تو انھوں نے نمودار ہوتے ہی اپنی علمی حیثیت جملہ ارکین کانفرنس سے تسلیم کرالی لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس کے بعد کئی سال تک ہمیں ڈاکٹر صاحب کا نام کانفرنس کی رودادوں میں کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ نہ معلوم اس کا سبب ڈاکٹر صاحب کی بعض دیگر مصروفیات تھیں یا کانفرنس کے منتظمین، بالخصوص آنریری جوائنٹ سکریٹری صاحب زادہ آفتاب احمد خاں سے ان کے اختلافات تھے۔ ۱۹۰۶ء کے بعد پہلی مرتبہ ان کا نام کانفرنس کے ۲۹ ویں سالانہ اجلاس منعقدہ پونا ۱۹۱۵ء میں ملتا ہے۔ اس اجلاس میں انھوں نے صرف ایک تجویز پیش کی تھی۔ جس کے تین حصے تھے، ایک یہ کہ صوبہ بمبئی کی گورنمنٹ مڈل

اسکول اسکالرشپ برائے پس ماندہ اقوام کی مقدار تین روپے ماہوار سے بڑھاکر پانچ روپے ماہوار کردے۔ دوسرے یہ کہ ہر ایک سینٹرل فرسٹ گریڈ اردو مدرسے کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس قائم کیا جائے اور تیسرے یہ کہ لوکل بورڈ سے وظیفہ پانے والے طلبہ کا انتخاب مسلمان انسپکٹنگ افسر کے سپرد ہونا چاہیے۔

کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں میں ڈاکٹر صاحب کی موجودگی کا علم اس طرح وقفے وقفے سے ہوتا ہے۔ انھوں نے اس کے ۳۵ویں سالانہ اجلاس منعقدہ علی گڑھ ۱۹۲۲ء میں شرکت فرمائی۔ اس وقت وہ مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر تھے اور ظاہر ہے کہ اس حیثیت سے انھوں نے کانفرنس کی کارروائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر صاحب نے تعلیم بالغان کے موضوع پر تجویز پیش کی جو منظور ہوئی۔ اس کے بعد کانفرنس کے ۴۳ویں سالانہ اجلاس منعقدہ بنارس ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر ضیاءالدین احمد کی شرکت کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے اس اجلاس میں ایک تجویز بابت تحفظ قدیم کتب، فرامین اور دستاویزات پیش کی جس کی رو سے کانفرنس کے ذمہ یہ کام کیا گیا کہ وہ پرائیویٹ لائبریریوں اور مختلف افراد سے یہ کتابیں، فرامین اور دستاویزات یا ان کی نقول یا ان کی فہرستیں حاصل کرکے محفوظ کرے اور یہ کہ اس مقصد کے لیے مخصوص چندہ جمع کرکے جداگانہ فنڈ قائم کیا جائے۔ ایک دوسری تجویز کے مطابق، جس کے محرک مولوی محمود احمد عباسی تھے، ایک کمیٹی اس غرض سے تشکیل دی گئی کہ تحفظ آثار قدیمہ کے متعلق ضروری کارروائی کرے اور مختلف مقامات پر اس قسم کی تاریخی عمارتوں کا پتہ لگائے۔ اس کمیٹی کے ممبروں میں ڈاکٹر ضیاءالدین احمد کا نام سرفہرست تھا۔ ان کے علاوہ بعض اور اہم ممبر مولانا سید سلیمان ندوی، خان بہادر شیخ محمد عبداللہ، خان بہادر مولوی بشیرالدین، نواب صدر یار جنگ، خود مولوی محمود احمد عباسی اور پروفیسر محمد حبیب تھے۔ کانفرنس کے ۴۴ویں سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور ۱۹۳۲ء میں ایک کمیٹی مسلمانوں کی اقتصادی ترقی پر غور کرنے اور اس کے واسطے لائحہ عمل مرتب کرنے کی غرض سے تشکیل دی گئی۔ اس کے ممبروں میں ڈاکٹر ضیاءالدین احمد اور مولوی طفیل احمد کاظمی (جو اس تجویز کے محرک تھے) شامل تھے۔

کانفرنس کا ۴۶واں سالانہ اجلاس آگرہ میں ۱۹ و ۲۰ مارچ ۱۹۳۵ء کو زیر صدارت

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد منعقد ہوا۔ ان کے خطبۂ صدارت پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔ انھوں نے تعلیم یافتہ طبقے کی بے روزگاری پر خصوصی توجہ مبذول کی تھی۔ اور اس سلسلے میں کانفرنس کو سروس سیکورنگ ایجنسی قائم کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ انھوں نے دوسرا مشورہ یہ دیا تھا کہ کانفرنس ایک شعبہ اسلامیہ مدارس کے امدادی بورڈ کے نام سے قائم کرے جو تمام اسلامیہ اسکولوں کو ہر قسم کی امداد دیا کرے۔ انھوں نے اپنے خطبے میں ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے مسائل سے علیحدہ علیحدہ بحث کی تھی۔ انھوں نے اس وقت کے طریقۂ امتحان کو بدلنے پر بڑی زور دیا تھا۔ کیوں کہ ان کے نزدیک اس طریقۂ امتحان میں کامیابی لیاقت پر منحصر نہیں تھی بلکہ قسمت پر منحصر تھی۔

کانفرنس کے ۴۹ ویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۳۸ء بمقام پٹنہ میں انھوں کے ایک ریزولیوشن لازمی اور مفت تعلیم کے متعلق پیش کیا۔ دراصل یہ ریزولیوشن واردھا تعلیمی اسکیم کے متبادل کے طور پر پیش کیا گیا تھا اور اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے جو تقریر کی تھی اس میں اپنے نقطۂ نظر کے مطابق واردھا اسکیم کی خامیوں کی نشان دہی کی تھی۔ یہ بہت پر آشوب جلسہ تھا اور اس میں جذبات بہت بھڑکے ہوئے تھے۔ حاضرین کی اکثریت نے اس ریزولیوشن کے مخالفین مثلاً مولانا احمد سعید دہلوی کو تقریر نہیں کرنے دی تھی۔ اس وقت کے صوبہ بہار کے وزیر تعلیم ڈاکٹر سید محمود اس اجلاس کے اصلی داعی تھے اور ان کی خواہش تھی کہ اس کی صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین کریں لیکن اس وقت کے سیاسی حالات میں یہ ممکن نہیں تھا۔ اس لیے اجلاس کے صدر بنگال کے چیف منسٹر مولوی ابوالقاسم فضل الحق منتخب ہوئے تھے۔ انھوں نے بھی یہ ہڑبونگ پسند نہیں کی اور ڈاکٹر سید محمود کی بددلی تو قدرتی تھی ہی۔ تاہم قرارداد منظور ہوگئی اور واردھا اسکیم کو رد کردیا گیا۔ یہ اجلاس تین دن تک جاری رہا تھا اور اس کے مختلف جلسوں کی صدارت مختلف حضرات نے کی تھی کیوں کہ اول تو مولوی فضل الحق بہت تھکے ہوئے اور پراگندہ خاطر تھے۔ اور پھر دوران اجلاس ہی کلکتہ واپس بھی تشریف لے گئے تھے۔ چناں چہ تیسرے دن کے جلسوں کی صدارت ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد نے کی۔

۱۹۳۹ء میں کلکتہ سالانہ اجلاس میں جو حیدرآباد کے نواب کمال یار جنگ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، مسلمانان ہند کے تعلیمی حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے جو کمال یار جنگ کمیٹی مقرر کی گئی تھی اور جس کے اخراجات کے کفیل نواب صاحب مذکور ہی تھے اس سے بھی ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کا قریبی تعلق رہا۔ اس کمیٹی کی ہیئت ترکیبی میں بار بار تبدیلی ہوتی رہی اور ۱۹۴۳ء میں جو جدید کمیٹی تشکیل دی گئی اس کے صدر ڈاکٹر صاحب ہی مقرر ہوئے وہ اس وقت بحیثیت وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کانفرنس کے صدر بھی تھے لیکن وہ اپنی گوناگوں مصروفیات کی بنا پر اس کمیٹی کے کاموں میں بہت کم دلچسپی لے سکے اور اس کے لیے بہت کم وقت دے سکے۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۰۲ء تک آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے قواعد کی رو سے اس کا پریزیڈنٹ ایکس آفیشو صدر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد پہلے ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء تک اور پھر ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک اس کے مستقل صدر رہے اس دوران نواب صدر یار جنگ کانفرنس کے آنریری سکریٹری تھے۔ نواب صاحب عمر میں ڈاکٹر صاحب سے دس برس بڑے تھے اور ڈاکٹر صاحب ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ نواب صاحب بھی ڈاکٹر صاحب کو عزیز رکھتے تھے اور ایم۔ اے۔ او کالج اور مسلم یونیورسٹی سے متعلق ان کی خدمات کے معترف و مداح تھے۔ اس لیے دونوں کے باہمی روابط بہت خوشگوار رہے اور ایک کا دوسرے کے مکان (حبیب منزل اور ذکا منزل) آنا جانا اکثر رہتا تھا ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی اور کانفرنس (یونیورسٹی زیادہ، کانفرنس کم) سے متعلق مختلف امور پر نواب صاحب سے برابر تبادلہ خیال کرتے تھے۔ تاہم کانفرنس سے متعلق بعض امور میں دونوں بزرگوں کے اختلاف رائے کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس اختلاف کا زیادہ تر تعلق کانفرنس کے دفتری نظام سے تھا۔ سید الطاف علی بریلوی، جو ایک تعلیم یافتہ اور فعال شخص تھے، کانفرنس کے آفس سپرنٹنڈنٹ تھے۔ نواب صدر یار جنگ کو ان پر پورا اعتماد تھا اور اس لیے وہ کانفرنس کے دفتری کاموں میں بہت کم دخل دیتے تھے۔ غالباً الطاف علی صاحب کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کو بعض ایسی اطلاعات ملتی رہتی تھیں جن کی بنا پر وہ ان کے

طریقۂ کار سے مطمئن اور خوش نہیں تھے۔ نواب صدر یار جنگ کے ذخیرۂ خطوط میں جن بزرگوں کے خطوط میرے پاس محفوظ ہیں ان میں نواب محسن الملک سے نواب محمد اسماعیل خاں تک ایم۔ اے او کالج کے بیشتر سکریٹری اور پھر مسلم یونیورسٹی کے بیشتر وائس چانسلر شامل ہیں۔ وائس چانسلروں میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کے خطوط سب سے زیادہ ہیں جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں ہیں۔ نواب صدر یار جنگ کا ایک معمول یہ تھا کہ جب انھیں کوئی اہم خط ملتا تھا اسی وقت وہ اس کے حاشیے پر اس کا جواب لکھ دیتے تھے جو بعد میں نقل ہو کر مکتوب نگار کو بھیج دیا جاتا تھا۔ ایک ایسے خط میں جو ۲۵ نومبر ۱۹۴۶ء کا لکھا ہوا ہے اور انگریزی میں ہے، ڈاکٹر صاحب نے تحریر کیا ہے کہ انھیں کانفرنس کے کام سے باخبر نہیں رکھا جاتا ہے بالخصوص میٹنگوں کے انعقاد کی ان سے بیشتر اجازت حاصل نہیں کی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ علی گڑھ سے باہر ہونے کے سبب ان میٹنگوں میں شرکت نہیں کر سکتے ہیں۔ جواب حاشیے میں نواب صاحب نے بزبان اردو یہ تحریر فرمایا ہے: "کانفرنس میں اس کے قواعد کے مطابق کام ہو رہا ہے۔ ۲۹ برس سے میں اسی ضابطے سے پابندی سے کام کر رہا ہوں۔ جدید عمل درآمد کی ضرورت ہے، نہ اس کی قواعد میں گنجائش ہے۔ کانفرنس مستقل ادارہ ہے، یونیورسٹی کا ماتحت نہیں۔" ڈاکٹر صاحب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ بزرگوں اور ہم عصروں کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اسی لیے نواب صاحب کے اس جواب کے بعد ڈاکٹر صاحب نے یہ معاملہ آگے نہیں بڑھایا۔

ایک اور مسئلہ جو اس صدی کے چوتھے دہے میں سامنے آیا، یہ تھا کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی عمارت سلطان جہاں منزل جس زمین پر واقع ہے وہ مسلم یونیورسٹی کی ملکیت ہے اور ۵/ روپے سالانہ لگان پر کانفرنس کے قبضے میں ہے۔ ان دنوں یونیورسٹی نے کانفرنس کو لکھا کہ اس زمین پر کانفرنس نے بعض نئی عمارات تعمیر کر کے کرائے پر اٹھا دی ہیں جس کا اسے حق نہیں تھا۔ یونیورسٹی کے بعض کارکنوں اور نواب صدر یار جنگ کے درمیان خاصی طویل مراسلت کے بعد بالآخر مسلم یونیورسٹی ایگزیکٹو کونسل نے ایک کمیٹی اس مسئلے کے تصفیے کی غرض سے مقرر کی جو حسب ذیل تین ممبروں پر مشتمل تھی:

۱۔ وائس چانسلر چیرمین
۲۔ مسٹر جسٹس نعمت اللہ نمائندہ ایگزیکٹو کونسل
۳۔ نواب صدر یار جنگ نمائندہ کانفرنس

اس بارے میں کانفرنس کے فائل میں جو آخری تحریر ملتی ہے وہ رجسٹرار مسلم یونیورسٹی کا نواب صدر یار جنگ کے نام ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۴ء کا ایک خط ہے جس میں انھوں نے نواب صاحب سے دریافت کیا ہے کہ کیا وہ ۱۷ اکتوبر کو اس کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت فرما سکتے ہیں۔ حسب معمول نواب صاحب نے اس خط کے حاشیے میں تحریر فرما دیا ہے: "میں انشاءاللہ ۱۴ اکتوبر کی شام کو لکھنؤ پہنچ جاؤں گا۔ اور ۱۷ تک وہاں رہوں گا۔ اس لیے اس کمیٹی میں شریک نہ ہو سکوں گا۔" اس کے بعد اس سلسلے میں کوئی اور تحریر نہیں ملتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً یہ معاملہ اس وقت اس سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ یہ بھی ڈاکٹر صاحب کی بزرگ داشت اور مصالحت پسندی کا ایک نمونہ ہے۔

لطیفہ یہ ہے کہ تقریباً ساٹھ سال کے بعد یونیورسٹی کی طرف سے پھر ایک مرتبہ یہ مسئلہ اٹھایا گیا ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ کانفرنس کو رسمی طور پر یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ یونیورسٹی کو عملی اعتراض کیا ہے اور نہ کانفرنس کے سکریٹری کو اعتماد میں لینے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ معاملہ بالا مسلم یونیورسٹی ایگزیکٹو کونسل کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کانفرنس کا سکریٹری بھی اس معاملے میں یونیورسٹی ایگزیکٹو کونسل کی بالادستی تسلیم کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہے کیوں کہ بقول نواب صدر یار جنگ مرحوم "کانفرنس مستقل ادارہ ہے، یونیورسٹی کا ماتحت نہیں ہے۔" اور اب تو ان دونوں کے درمیان وہ رشتۂ اشتراک بھی نہیں رہا ہے، جو مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے صدر کانفرنس ہونے کی صورت میں تھا۔

جب ڈاکٹر سر ضیاءالدین احمد اور نواب صدر یار جنگ کے باہمی روابط کا ذکر آ ہی گیا ہے تو اس سلسلے میں چند دیگر امور، جو بظاہر ہمارے موضوع سے خارج معلوم ہوتے ہیں، بیان کر دینا غیر مناسب نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کے نواب صاحب کے نام جو خطوط محفوظ ہیں ان سے دونوں کے مخلصانہ اور بے تکلفانہ مراسم پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ ایک خط،

جو ڈاکٹر صاحب کے وائس چانسلر منتخب ہونے سے پہلے کا ہے، ان کی والدہ صاحبہ کی وفات پر نواب صاحب کے تعزیت نامے کے جواب میں ونڈسر پلیس، نئی دہلی سے لکھا گیا ہے اس پر تاریخ درج نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بعض اور خطوط بھی تاریخ سے معرا ہیں۔ لیکن لفافے پر ڈاک خانے کی مہر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نواب صاحب کے وطن مالوف حبیب گنج ضلع علی گڑھ ۱۳ اپریل ۱۹۳۳ء کو پہنچا ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے: "والدہ کی موجودگی بڑی چیز ہے۔ گھر میں برکت ہوتی ہے اور تمام خاندان کا رشتہ باہمی قائم رہتا ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ ختم ہو گیا۔ آپ جیسے بزرگوں کی شفقت و ہمدردی (سے) بہت تسلی ہوتی ہے۔" ۹، جنوری ۱۹۳۸ء کے خط میں تحریر فرمایا ہے: "میں آج کلکتہ سے واپس آیا ہوں۔ پرسوں بروز سہ شنبہ کو (کذا) حبیب گنج ایک بجے سے قبل پہنچوں گا اور دوپہر کا کھانا آپ ہی کے ساتھ کھاؤں گا" ایک اور خط جو ونڈسر پلیس نئی دہلی سے لکھا گیا ہے، اس پر بھی تاریخ درج نہیں ہے لیکن ایک اور خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۴۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے نواب صاحب سے اپنے ساتھ حیدر آباد چلنے کی درخواست کی ہے۔ خاص مقصد مجوزہ ملٹری کالج کے لیے چندہ جمع کرنا ہے۔ لکھتے ہیں: "میرا قصد ۲ مارچ کو حیدر آباد ایک عشرے کے لیے جانے کا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں چاہتا ہوں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ملٹری کالج کے لیے چندہ بھی کیا جاوے۔ اگر آپ بھی تشریف لے چلیں تو چندہ میں بڑی مدد ملے گی۔ میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کے پاس دس دن خالی ہوں۔" ۱ جنوری ۱۹۴۴ء کے خط میں، جو انگریزی میں ہے، لکھا ہے: "مجھے امید ہے کہ آپ اس موسم میں مجھے اسی طرح رساول بھیجیں گے جیسے پچھلے برسوں میں بھیجتے رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ۱۷ اور ۲۱ جنوری ۴۴ء کے درمیان علی گڑھ میں نہیں ہوں گا" ایک اور خط بھی تاریخ سے مزین نہیں ہے۔ اور قرینے سے بھی اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ کب لکھا گیا ہے۔ اس میں منجملہ اور باتوں کے کسی محرّر صاحب کے حوالے سے حبیب گنج کے خربوزوں کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ جو ظاہر ہے کہ حسن طلب ہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک معمول یہ تھا کہ وہ ہر سال آموں کی فصل سے ہو ۔۔ (illegible)

موسم میں مینگو پارٹیز اور مینگو پارٹی کرتے تھے جس کے لیے مختلف بے تکلف احباب سے آم کی پیٹیاں طلب فرماتے تھے۔ اور خود اپنی طرف سے ڈنر دیتے تھے۔ اس موضوع پر نواب صاحب کے نام ان کے متعدد خطوط ہیں۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب کے وطن ماہوف مارہرہ ضلع ایٹہ میں بھی مینگو پارٹی ہوتی تھی جس میں بیشتر نواب صاحب بھی شرکت فرماتے تھے۔ دو ایک خطوں میں وہاں جانے کا تفصیلی پروگرام درج ہے۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد تین بار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۸ء تک، ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۴ء تک اور ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک۔ ان میں سے پہلے دو موقعوں پر الکشن کی نوبت آئی یا آتے آتے رہ گئی۔ تیسری مرتبہ ڈاکٹر صاحب بلا مقابلہ منتخب ہوئے۔ اس زمانے میں مسلم یونیورسٹی کورٹ براہ راست وائس چانسلر کا انتخاب کرتا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں سر سید راس مسعود وائس چانسلری سے مستعفی ہو کر جا چکے تھے۔ اور نواب محمد اسماعیل خاں آنریری ٹریژرر قائم مقام وائس چانسلر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مقابلہ ان ہی دونوں کے درمیان ہوا۔ نواب محمد اسماعیل خاں کو حریت پسند طبقے کی حمایت حاصل تھی اور اس میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے اراکین شامل تھے۔ کیوں کہ اس وقت تک ان دونوں جماعتوں میں وہ اختلافات نمودار نہیں ہوئے تھے جو ۱۹۳۶ء کے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے بعد ہوئے۔ اس کے برعکس اس وقت کی غیر ملکی حکومت، بالخصوص یو۔پی کا انگریز گورنر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کو وائس چانسلر بنانے پر مصر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کورٹ کی جس میٹنگ میں یہ انتخاب ہوا اس میں اتنے نائٹ موجود تھے جتنے شاید کسی دوسری غیر سرکاری تقریب میں کبھی نہیں رہے ہوں گے۔ ان میں سے بعض حضرات انگلستان تک سے ہوائی جہاز کے ذریعہ سفر کر کے اس میٹنگ میں شرکت کرنے اور ڈاکٹر صاحب کو ووٹ دینے کی غرض سے ہندوستان آئے تھے۔ نواب صدر یار جنگ کی رائے میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نواب اسمٰعیل خاں کے مقابلے میں وائس چانسلری کے زیادہ اہل تھے۔ لیکن ساتھ ہی وہ اسے پسند نہیں فرماتے تھے کہ غیر ملکی حکومت مسلم یونیورسٹی کے کسی معاملے میں اتنی دل چسپی

ـے اور مداخلت کرے۔ اس لیے وہ اس الکشن میں غیر جانب دار رہے اور انھوں نے دونوں امیدواروں میں سے کسی کو ووٹ نہیں دیا۔

۱۹۴۱ء میں مقابلہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد اور سر شیخ عبدالقادر کے درمیان تھا۔ سر شیخ سے نواب صدر یار جنگ کے "مخزن" کے دور سے، جس کے وہ مضمون نگار رہے تھے، تعلقات تھے۔ وہ جب کبھی لاہور تشریف لے جاتے سر شیخ عبدالقادر ہی کے ساتھ قیام فرماتے تھے اور سر شیخ بھی جب علی گڑھ تشریف لاتے نواب صاحب ہی کے ساتھ ٹھہرتے تھے۔ چناں چہ اس مرتبہ بھی انھوں نے نواب صاحب کے مکان حبیب منزل میں قیام فرمایا۔ خاکسار مضمون نگار اس زمانے میں اسکول کا طالب علم تھا اور ہوسٹل میں رہتا تھا۔ کسی چھٹی کے دن حبیب منزل آنا ہوا تو دیکھا کہ ڈرائنگ روم میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد مع اپنے حامیوں کے تشریف فرما ہیں اور باہمی مشورے ہو رہے ہیں اور برآمدے میں سر شیخ عبدالقادر اور ان کے ساتھی مصروفِ گفتگو ہیں۔ سر شیخ کے ساتھیوں میں سب سے نمایاں مولوی عبدالحق (بابائے اردو) نظر آ رہے تھے۔ جب الکشن کے لیے کورٹ کی میٹنگ ہوئی تو سر شیخ کے ایک حامی نواب ناظر یار جنگ نے اپنی تقریر میں یہ تاثر دیا کہ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر نواب سر میر عثمان علی خاں نظام حیدرآباد ڈاکٹر صاحب کا وائس چانسلر منتخب ہونا پسند نہیں فرماتے ہیں۔ جواب میں ڈاکٹر صاحب کے ایک ہم نوا مسٹر عبدالجبار خیری نے کچھ اس طرح کی بات کہی کہ اس معاملے میں نظام کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں ہے سر شیخ کے حامیوں نے اسے نظام کی توہین پر محمول کیا اور میٹنگ سے اٹھ کر چلے گئے۔ اس گروہ کے لیڈر ڈاکٹر ذاکر حسین تھے۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ دراصل انھیں اپنے امیدوار کی کامیابی کا یقین نہیں تھا، اس لیے انھوں نے یہ حکمتِ عملی اختیار کی۔ نواب صدر یار جنگ حیدرآباد میں صدر الصدور امورِ مذہبی رہے تھے اور سرکار نظام سے وظیفہ یاب تھے، اس لیے لوگ سمجھ رہے تھے کہ وہ ضرور واک آؤٹ کریں گے۔ لیکن وہ بدستور اپنی نشست پر بیٹھے رہے اور اٹھ کر نہیں گئے۔ اس سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس منصب کے لیے ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد ہی کو ترجیح دیتے تھے۔

نواب صدر یار جنگ ایم۔ اے۔ او کالج کے دور میں کالج کی دینیات کمیٹی کے سکریٹری رہے تھے۔ جب ۱۹۴۵ء میں مسلم یونیورسٹی میں فیکلٹی سسٹم رائج ہوا اس وقت سنی یا شیعہ دینیات میں کوئی پروفیسر نہیں تھا۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد نے فیکلٹی آف تھیالوجی کے اعزازی ڈین کی نواب صاحب کو پیش کش کی جو انھوں نے قبول فرمائی اور ۱۹۵۰ء میں اپنی وفات تک اس عہدے پر اعزازی حیثیت سے کارگزار رہے۔ اس سے دو سال قبل ڈاکٹر صاحب ان کی خدمت میں ڈاکٹر آف تھیالوجی کی اعزازی ڈگری پیش کر چکے تھے۔ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے یہ ڈگری سب سے پہلے نواب صاحب ہی کو پیش کی گئی تھی اور ان کے بعد بھی صرف چند منتخب اکابر اس ڈگری سے مفتخر ہوئے ہیں۔ ان میں نمایاں نام مولانا ابوالکلام آزاد، سیدنا طاہر سیف الدین اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے ہیں۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کو جو تعلق خاطر مسلم یونیورسٹی کے طلبہ سے تھا۔ اس کا اظہار بعض مرتبہ ایسے انداز میں ہوتا تھا جسے اصول پرست اور انصاف پسند حضرات اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور ڈاکٹر صاحب پر اس معاملے میں تنقید کرتے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب کسی کی پرواہ کیے بغیر اپنی روش پر ہمیشہ مستعدی سے کاربند رہے۔ کس قدر ملال اور عبرت کا مقام ہے کہ ۱۹۴۶ء کے دوران ان ہی طلبہ کے ہاتھوں ڈاکٹر صاحب کو دو مرتبہ پریشانی اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان دونوں احتجاجوں کی تفاصیل لکھنا طولِ عمل ہوگا۔ اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ دسمبر ۱۹۴۶ء میں احتجاج نے ایسی نازیبا صورت اختیار کی کہ طلبہ کے دباؤ سے متاثر ہو کر ڈاکٹر صاحب کو وائس چانسلری سے مستعفی ہونا پڑا۔ اگرچہ بعد میں دوسرے خیال کے طلبہ نے ڈاکٹر صاحب کا جلوس بھی نکالا اور یہ بھی کہا گیا کہ وہ استعفیٰ اس لیے بے معنی ہے کہ کسی کو مخاطب کر کے نہیں لکھا گیا ہے لیکن ان واقعات سے ڈاکٹر صاحب اتنے پژمردہ اور بددل ہو گئے تھے کہ پھر انھوں نے وائس چانسلر کی کرسی پر بیٹھنا اور کام کرنا پسند نہیں کیا۔ آنریری ٹریژرر خان بہادر عبیدالرحمان خاں شروانی ہی ان کی نیابت کرتے رہے۔ نواب صدر یار جنگ نے مسلم یونیورسٹی ایگزیکٹو کونسل میں قرارداد پیش کی کہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کو یونیورسٹی

کا ریکٹر مقرر کیا جائے۔ اُس وقت یو۔ پی کا گورنر ریکٹر اور گورنر جنرل ہند لارڈ ریکٹر کہلاتا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، مسلم یونیورسٹی کے غیر سرکاری ریکٹر دو بزرگ ہی مقرر ہوئے۔ پہلے نواب سر مزمل اللہ خاں شروانی اور دوسرے ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، اور جیسا کہ معلوم ہے، یہ دونوں مختلف اوقات میں وائس چانسلر رہ چکے تھے۔

ڈاکٹر شمس بدایونی

اقبال کی خامیاں — تعارف و جائزہ

اردو پر ایک عرصہ تک شاعری کا تسلط رہا اور اس تسلط کا ایک اہم واسطہ غزل رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے ابتدائی تنقیدی سرمایہ کا بڑا حصہ شاعری خصوصاً غزل کی تنقید سے متعلق ہے۔ اس لیے اردو کے تنقیدی سرمایہ پر اس نہج سے بھی نگاہ کرنے کی ضرورت ہے۔ خصوصاً ان شعرا کے حوالے سے جن کی شاعری کو مرکز توجہ بنا کر کبھی صحافت کی راہ سے ان پر اعتراضات کی بارش کی گئی اور کبھی تصنیف و تالیف کے ذریعہ ان کے ادبی مرتبہ کو چیلنج کیا گیا۔ غالب شکن، خرافات عزیز، مومن و غالب، نقد سخن، حفیظ کی خامیاں، وغیرہ کتابیں اس کی مثالیں ہیں۔ ان ذرائع سے پیش کی گئی تنقید توجہ اور محاکمہ کی طالب ہے۔

اسی نوعیت کی ایک کتاب "اقبال کی خامیاں"[۱] منصہ شہود پر آئی جو کلام اقبال پر جرح و تنقید سے متعلق ہے۔ اس کتاب کا تفصیلی تعارف و جائزہ حسب ذیل ہے۔

کتاب کے مصنف لبھو رام جوش ملسیانی (المتوفی ۱۹۷۶ء) ہیں، جیسا کہ ان کی مندرجہ ذیل تحریر سے ظاہر ہے۔ وہ اپنے ایک مکتوب[۲] میں لکھتے ہیں:

---

[۱] اس کتاب کا دوسرا اڈیشن جوش ملسیانی کی وفات ۱۹۷۶ء کے بعد ان کے بیٹے عرش ملسیانی (ف ۱۹۷۹ء) نے اپنے دیباچے کے ساتھ دہلی سے ۱۹۷۷ء میں شائع کرایا اور اس پر بطور ناشر ساحر ہوشیار پوری (ف ۱۹۹۴ء) کا نام درج کرایا۔ تیسرا اڈیشن بمبئی سے ۱۹۹۴ء میں کالی داس گپتا رضا کے تعارف کے ساتھ شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے ماقبل کے اڈیشنوں میں ہونے والی کتابت کی اغلاط کو درست کر دیا ہے۔

[۲] مملوکہ راقم الحروف۔

اقبال کی خامیاں۔ دوسرا اڈیشن شائع اس لیے نہیں کیا کہ پہلا اڈیشن بھی میری مرضی کے خلاف شائع کر دیا گیا تھا۔ دراصل یہ مضامین میں نے از خود نہیں لکھے بلکہ مجھ سے لکھوائے گئے تھے۔ میں تو محبوب و محاسن دونوں لکھنا چاہتا تھا مگر درد نکودری اور ان کے ہم نوا صرف عیوب ہی لکھوانے پر اصرار کرتے رہے۔

(مکتوب بنام ویریندر پرشاد سکسینہ ۴ جولائی ۱۹۶۲ء)

ایک زمانے تک یہ بات پردہ خفا میں رہی کہ اس کتاب کا اصل مصنف کون ہے لیکن جوش ملسیانی نے اپنی زندگی ہی میں اس کتاب کے مصنف ہونے کا از خود اظہار کر دیا تھا جیسا کہ ان کی مندرجہ بالا تحریر سے ظاہر ہے۔

جوش ملسیانی، اقبال ہی کی طرح داغ کے شاگرد تھے۔ انھوں نے ایک فرضی نام 'جرأت' سے ہفتہ وار اخبار 'پارس' لاہور میں لوبھ رام درد نکودری (متوفی ....) کی تحریک پر اقبال کے مجموعۂ کلام 'بانگِ درا' (پہلی اشاعت ۱۹۲۴ء) پر اعتراضات کا سلسلہ شروع کیا۔ جو اس اخبار میں بالاقساط شائع ہوا۔ یہ کتاب انھیں اعتراضات کی مدوّن شکل ہے۔ مالک رام لکھتے ہیں:

> ایک زمانہ میں انھوں نے اقبال کے کلام پر ایک سلسلہ مضامین لکھا تھا جو جرأت کے قلمی نام سے ہفتہ وار پارس لاہور میں چھپا تھا بعد کو یہ اقبال کی خامیاں کے عنوان سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوا (تماہی تحریر۔ دہلی جولائی ستمبر ۱۹۶۰ء)

مالک رام نے جوش ملسیانی کی زندگی ہی میں تماہی تحریر کا جوش ملسیانی نمبر طبع کیا تھا۔ جس میں وقیع مواد پیش کیا۔ اس نمبر میں جوش کے بیٹے عرش ملسیانی نے ایک مضمون 'میرے والد محترم' سپرد قلم کیا۔ جس میں اس کتاب کی تصنیف کے پس منظر پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

> والد کے ایک ذہین اور ہونہار شاگرد تھے لوبھ رام درد۔ وہ مجھ سے عمر میں کوئی تین چار سال بڑے ہوں گے۔ نرنجن کمار شاد انھیں کا فرزند تھا۔ وہ جب لاہور کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے گئے تو وہاں کے ادبی حلقوں میں اپنے استاد کا نام اچھالنے میں مصروف رہے جس سے بعض اساتذہ مثلاً تاجور نجیب آبادی، ارمان دہلوی، پنڈت کیفی اور کچھ نوجوان شعرا بہت متاثر تھے۔ لیکن آپ تو اپنے گوشے سے نکلتے ہی نہیں

تھے ورد صاحب نے ایک ترکیب سوچی۔ "بانگ درا" کا ایک نسخہ لائے اور وارد سے کہنے لگے کہ اس میں جو مقام سخن ہیں ان پر ایک مضمون لکھ دیجیے۔ یہ سادہ مزاج اور بھولے تو تھے ہی جھٹ مان گئے ایک ہی نشست میں نشان لگا دیے اور لالہ کرم چند کے اخبار ہفتہ وار "پارس" میں دس کے قریب قسطیں جراح کے نام سے چھپ گئیں لاہور میں بڑا شور ہوا جو لوگ ان کے قدر شناس اور ان کی طرف تھے وہ بھی مخالف ہو گئے ان میں ایک تو حفیظ جالندھری ہی تھے یہ تجزیہ ان کے دوسرے دور تب اس کے بعد ہو گئے تھے انھوں نے والد کی تصویر اور حالات اشاعت کے لیے منگوائے تھے جب اقبال کے بارے میں مضمون شائع ہوئے تو انھوں نے ان کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا اور نہیں چھاپا۔ مجھے یاد ہے کہ اس سلسلے میں میری ان سے بڑی تلخ خط و کتابت ہوئی تھی اور وہ مجھ سے سخت ناخوش بھی رہے۔ لاہور کے ایک مشاعرے میں مجھے مخاطب کر کے یہ شعر پڑھے۔

نہ پہچانا کسی نے بھی وطن میں — سمجھتا تھا بہت مشہور ہوں میں
نہیں کرنا عزیزوں کی شکایت — عزیزو! ہاں بہت مغرور ہوں میں

ورد نے یہ تنقیدی مضامین کتابی صورت میں چھاپ دیے تھے جب نیاز فتحپوری، نوح ناروی اور ریاض خیرآبادی کو کتاب میں نے بھیجی تو سب نے بہت پسند کی۔ "نگار" میں ریویو بھی چھپا تھا۔ . . . . اس کتاب کا نام تھا "اقبال کی خامیاں"۔ اس کے جواب گجرانوالہ کے کسی گوشہ نشین نے "حفیظ کی خامیاں" لکھ ڈالی اور چھاپ دی۔ بات دراصل یہ ہو گئی کہ۔ چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد (ماہی تحریر ج ۶ ش ۲ ۶۲، ۱۹۵ء)

یہ کتاب ۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ سائز کتابی یعنی ۲۰×۳۰/۱۶ ہے۔ باہتمام بابو دیوان سنگھ پرنٹر پرکاش اسٹیم پریس لاہور سے ۱۹۲۸ء میں طبع ہوئی۔ سرورق سادہ ہے۔ جس پر مندرجہ ذیل تفصیلات ملتی ہیں۔

نام کتاب : اقبال کی خامیاں

مصنف : حضرت جرّاح

مرتبہ : نوہریا رام درد نکودری

بار اول : ۱۹۲۸ء

تعداد : ۱۰۰۰

قیمت : فی جلد ۱۲

سرورق کی پشت پر 'عرض حال' عنوان سے درد نکودری کا مختصر نوٹ ہے جو حسب ذیل ہے :

اقبال کی خامیوں پر حضرت جراح نے اخبار 'پارس' لاہور میں جو سلسلہ مضامین نکالا تھا وہ احباب کے تقاضوں کی بنا پر اب کتابی صورت میں حاضر ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ درد نکودری

اس نوٹ کے بعد اصل کتاب شروع ہو گئی ہے ص ۱ تا ۸۷۔ صفحہ ۸۸ پر جوش ملسیانی کے 'نمونۂ کلام جوش' کا اشتہار ملتا ہے۔

کتاب کا آغاز 'اقبال کی خامیاں' کے عنوان سے کیا گیا ہے۔ (ص ۱ تا ۲) اور یہ عنوان تمام تر تمہیدی گفتگو سے متعلق ہے۔ اس میں کتاب لکھنے کے جواز میں چند باتیں کہی گئی ہیں اور اسی ضمن میں بعض بہت واضح اغلاط کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ جراح لکھتے ہیں :

اس کی آواز میں درد ہے، اثر ہے، شاعرانہ انداز میں سوز اور ساز، نیاز اور ناز، سحر اور اعجاز غرض کہ سب کچھ ہے مگر اس میں کیا راز ہے کہ اس کو اتنے حسن قبول، اتنی خوش کلامی اور اتنی کہنہ مشقی کے باوجود اب تک درجۂ استناد حاصل نہیں ہے ذوق سلیم اسے تکمیل فن کا وہ درجہ کیوں نہیں دیتا۔ جو جلیل، کوثر، ریاض، مضطر، نوح یاس اور بے خود وغیرہ کو حاصل ہے۔ ہم اس بات کا کھوج لگانا چاہتے ہیں اور اہل ذوق سے درخواست کرتے ہیں کہ اسے محض حسن عقیدت کا اقتضا اور خالص نیک نیتی پر محمول سمجھا جائے کیونکہ ہم اقبال کو جو سرزمین پنجاب کے لیے مایۂ افتخار ہے ایک ایسا مکمل شاعر دیکھنا چاہتے ہیں۔ جس میں تکمیل فن کی بھی پوری شان جلوہ گر ہو۔

(ص ۱، ۲)

تمہید کے بعد مستقل عنوانات قائم کر کے اقبال کی شاعری کے عیوب پر مفصل بحث کی گئی ہے

جن عنوانات کے تحت بحث کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہیں :

تذکیر و تانیث ص : ۱۴ تا ۱۶

اختلاف لغت و انتقال الفاظ ص : ۱۷ تا ۳۲

خرابی بندش ص : ۳۳ تا ۴۵

(ذیلی عنوان) تقدیم و تاخیر، بے جا تخفیف الفاظ، بے ضرورت الفاظ اور حشو و زوائد عدم تقابل، فرقت زدہ الفاظ

زبان ص : ۵۰ تا ۶۵

(ذیلی عنوان) فارسیت، روزمرہ، متروکات

سرقہ ص : ۶۵ تا ۶۶

معنوی لغزشیں و مہملات ص : ۶۷ تا ۷۳

بے ربطی کلام ص : ۷۳ تا ۸۶

ان عنوانات کے مطالعہ سے کتاب میں کیے گئے اعتراضات کی نوعیت واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی زبان و فن کو بنیاد بنا کر کلام اقبال، (بانگ درا) کا محاکمہ کیا گیا ہے اس محاکمہ میں جو تنقیص کے دائرے سے باہر نہیں ہو سکا۔ اساتذہ کے اشعار بھی مثال میں پیش کیے گئے ہیں اور اس طرح اعتراضات کو مدلل کیا گیا ہے۔ اکثر جگہ کلام اقبال پر اصلاحیں بھی تجویز کی گئی ہیں، جو غیر ضروری ہیں۔ کتاب کے آخر میں جرّاح لکھتے ہیں :

"ہمارا سلسلہ مضمون یہاں ختم ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں اکثر جگہ مصرعوں اور اشعار کو اصلاح کردہ حالت میں پیش کیا گیا ہے۔ اپنے اعتراضات کو واضح کرنے کے لیے ہم نے ایسا کیا ہے ورنہ اصلاح کا ہمیں کوئی حق حاصل نہ تھا۔" (ص : ۸۶)

اس کتاب کی پیش کش کا مقصد بظاہر علم کی خدمت نظر آتا ہے۔ لیکن کلام اقبال کی اثر پذیری اور خود مصنف کے قلمبند تاثرات غماز ہیں کہ یہ کتاب خود ستائی اور معاندانہ جذبہ کے تحت لکھی گئی۔ مزید برآں مصنف کا اس کتاب کو پیش کرتے وقت فرضی نام اختیار کرنا اس کے مافی الضمیر کو ظاہر کر دیتا ہے کہ اس کے دل میں اقبال سے کسی نہ کسی حد تک حاسدانہ جذبہ پیدا ہو گیا تھا یہ کہہ دینا کہ

" یہ مضامین مجھ سے لکھوائے گئے تھے " یادرد نکودری صرف عیوب ہی لکھوانے پر اصرار کرتے رہے" محبوب نحو از سابق کافی نہیں ہے) اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اقبال کی بڑھتی ہوئی شہرت نے اپنے عصر کے شعری میلانات کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا اور اس کے نتیجہ میں بہت سے شعرا کی عظمتیں بھی متاثر ہونے لگی تھیں۔ یہ وہ اساتذہ فن تھے جن کے نزدیک شاعری محض زبان کی رنگینی بیان کی دلکشی و فن کی پاسداری سے تعلق رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب مذکور کے مصنف نے شروع سے آخر تک یہی تاثر دینا چاہا ہے کہ اقبال کوئی مستند شاعر نہیں۔ اس کے یہاں معائب کی بڑی بڑی تعداد میں بلبلا رہے ہیں اور وہ فن سے ناواقف محض ہے۔ اپنے اس خیال کے اثبات میں کتاب مذکور سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں جو آج لکھتے ہیں۔

(۱) "اقبال کی مشہور تصنیف 'بانگ درا' اس وقت ہمارے سامنے ہے اس کو پڑھنے سے جہاں حسن تخیل اور خوش بیانی کی داد دینی پڑتی ہے وہاں اکثر جگہ اصول فن کے لحاظ سے زد میں بھی آتا ہے۔ یہی لغزشیں اور خامیاں ہیں جو اقبال کو مستند بنانے میں مانع ہوتی ہیں۔" (ص : ۲)

(۲) "اس تفصیل سے ہمیں یہ دکھانا مقصود تھا کہ الفاظ اور ترکیبوں کے لحاظ سے ہمارے قابل مصنف (اقبال) نے کتنی ٹھوکریں کھائی ہیں اور کتنے بے اصولے پن سے کام لیا ہے ہر صاحب ذوق اندازہ کر سکتا ہے کہ ان نئی نئی ترکیبوں کی تراش خراش میں قبول عام کا حصہ کتنا ہے اور نا قبول خلق ہونے کا کتنا؟ اتنی خامیوں اور اس قدر لغزشوں کے ہوتے ہوئے استناد کا درجہ کس طرح مل سکتا ہے۔" (ص : ۳۲)

(۳) "ہمارے اعتراضات محض اس بنیاد پر کھڑے ہیں کہ اقبال کو ایک مستند شاعر کیوں نہیں مانا جاتا۔ ہم نے اس کی وجہ اپنی بساط کے موافق نہایت تفصیل سے لکھ دی ہے اور اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ مستند شاعر نہ ہونے کے وجوہ کیا کیا ہیں۔ اتنا کچھ لکھ جانے کے بعد بھی ہم اقبال کو مستند شاعر نہیں تو شاعر اور اچھا شاعر ضرور مانتے ہیں۔" (ص : ۸۶ - ۸۷)

کتاب میں کچھ ایسی داخلی شہادتیں بھی ملتی ہیں جو ان کے معاندانہ جذبہ کی غماز و عکاس ہیں مثلاً :

- مرزا غالب مرحوم نے ایک خط میں اس لفظ کو گدھوں کی زبان لکھا ہے۔ (ص: ۱۹)
- ہندوستانی میں ستے تو، اور توے کو لغویات میں شامل سمجھنا چاہیے۔ (ص: ۲۰)
- یہ حشو و زوائد کا مجموعہ ہے، یہ صرف تک ملائی ہوئی ہے۔ (ص: ۱)
- مصنف کو زبان کے اصولوں کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ (ص: ۹۰)
- نظر اور نظارے کو متحد المعانی ثابت کرنے کے لیے مولویانہ لغت بازی کی ضرورت نہیں ہے۔ (ص: ۳۱)
- اقبال نے ہندی الفاظ کو ہمیشہ ایسے ہی بھدے اور بھونڈے طریقے سے استعمال کیا ہے۔ (ص: ۲۳)
- کلام اقبال میں ایسی مثالیں جن پر اہلِ زبان خندہ زن ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے کثرت سے ہیں۔ (ص: ۵۲)
- یہ (شعر) جغرافیہ دانی کی مثال پیش کرتا ہے۔ (ص: ۷۰)
- مصرعہ ثانی مہمل گوئی کا بہترین نمونہ ہے۔ (ص: ۴۲)
- مطلب یہ کہ روزی پکاؤ گی یا ننگا ہی سو رہوں (ص: ۷۹)

یہ اس طرف بھی مشیر ہیں کہ مصنف کے ذہن میں اس خلوصِ نیت کا فقدان ہے جو ایک نقاد کے لیے ضروری ہے کیونکہ یہی خلوص بے لاگ تنقید کی اساس ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے یہاں اساتذہ قدیم کی طرح فن کی پاسداری نہیں ملتی۔ وہ شعریت کے دباؤ میں فکر کے بہاؤ کے آگے کسی بھی بندش کو روا نہیں رکھتے۔ انھوں نے شاعری کو ایک مقصد کے طور پر استعمال کیا اور اس کے کینوس کو ہر نہج سے مکمل اور وسیع کرنے کی کوشش کی۔ ان کے یہاں اگر چنداں فنی اسقام پائے جاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں کہ وہ فن سے نابلد تھے۔ وہ فارسی پر کامل دستگاہ اور زبان و فن کے رموز و نکات کو بھی سمجھتے تھے۔ لفظ و معنی کے رشتہ پر ان کی گہری نگاہ تھی لیکن وہ لکیر کے فقیر نہ تھے انھوں نے برملا کہا ہے :

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

اس کے باوجود اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ اقبال پنجابی تھے اور جو اردو وہ بولتے اور لکھتے تھے وہ پنجابی اثرات سے باہر نہ تھی۔ اقبال اور فیض دونوں کے یہاں ہر ممکن احتیاط کے باوجود سوبائی لسانی اثرات شعر و نثر دونوں میں کہیں کہیں کارفرما نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں جابجا ایسے الفاظ و تراکیب استعمال ہوئی ہیں جو ٹکسال باہر معلوم ہوتی ہیں۔ تذکیر و تانیث میں بھی یا اثر کار فرما ہے۔ دہلی اور لکھنو اسکول نے انھیں اس خصوص میں ہدف بنایا لیکن انھوں نے کبھی اس کی پرواہ نہ کی۔ انھوں نے فن کو مقصود بالذات نہیں سمجھا۔ وہ اسلوب کی ندرت، موضوع کی بداعت اور مقصد کے علو پر نگاہ رکھتے تھے۔ اس ضمن میں ان کا رویہ ہمیشہ انفرادی اور مجتہدانہ رہا۔ انھوں نے شعر و نثر میں معترضین سے متاثر ہوے بغیر خود کو شاعر نہ کہہ کر انکساری و فروتنی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس عہد کے شعری رجحانات اور ان رجحانات کے پیمانوں کے خلاف مہذب احتجاج کرتے ہوئے اپنے شعری نظریے اور رویے کی وضاحت کردی ہے۔ چند اشعار:

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری — وگرنہ شعر مرا کیا ہے، شاعری کیا ہے

نہ زباں کوئی غزل کی، نہ زباں سے باخبر میں — کوئی دل کشا صدا ہو، عجمی ہو یا ہو تازی

نغمہ کجا و من کجا، سوز سخن بہانہ ایست — سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

'خطوط اقبال' میں اقبال کے شعری نظریات کا اظہار متعدد جگہ ہوا ہے۔ چند مثالیں:

"زبان کو میں ایک بت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اظہار مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے۔ ہاں تراکیب کے وضع کرنے میں مذاق سلیم کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے۔"

(اقبال نامہ (اول)، مرتبہ شیخ عطاء اللہ، لاہور سنہ ندارد ص: ۵۶)

"شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمع نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر نہ تصور کریں۔" (اقبال نامہ، ص: ۱۰۸)

"بعض خیالات زمانہ حال کے فلسفیانہ نقطۂ نظر کا نتیجہ ہیں۔ ان کے ادا کرنے کے لیے قدیم فارسی اسلوب بیان سے مدد نہیں ملتی۔ بعض تاثرات کے اظہار کے لیے الفاظ ہاتھ نہیں آتے اس واسطے مجبوراً ترکیب اختراع کرنی پڑتی ہے، جو ضرور ہے کہ اہل زبان کو ناگوار ہو کر دل و دماغ اس سے مانوس نہیں ہیں" (اقبال نامہ ص: ۱۴۵)

"میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فن شاعری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات اور روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ

نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست
کہ بر من تہمت شعر و سخن بست

(اقبال نامہ ص: ۱۹۵)

زیر نظر حقائق اخلاقی و ملّی ہیں۔ زبان میرے لیے ثانوی حیثیت رکھتی ہے بلکہ فن شعر سے میں بحیثیت فن کے نابلد ہوں۔" (اقبال نامہ ص: ۲۱۵)

بانگ درا کو اقبال کے شعری ارتقاء کا نقش اول سمجھنا چاہیے۔ اس میں اگر شعری، فنی و فکری تسامحات کا کہیں شائبہ ہے تو یہ فطری ہے کیوں کہ خود اقبال نے صوفی غلام محی الدین کو ایک خط میں لکھا ہے:

"بانگ درا کی بیشتر نظمیں میری طالب علمی کے زمانہ کی ہیں۔ زیادہ پختہ کلام افسوس کہ فارسی زبان میں ہوا۔ بہتر طریق یہ ہے کہ 'بانگ درا' سے بعض نظمیں انتخاب کر لی جائیں"

(اقبال نامہ ص: ۲۹۹)

اگر متذکرہ بالا پس منظر میں زیرِ بحث کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو بہت واضح طور پر یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ فاضل مصنف نے شاعر کے نظریہ شاعری اور اس کے مافی الضمیر کو علٰحدہ کر کے اس کی شاعری میں نقائص تلاش کیے ہیں۔ مصنف نے فن کے دائرے سے باہر نکل کر کلام اقبال کی موضوعی، فکری ہمہ گیریت اور خود اقبال کے مافی الضمیر کو پڑھنے کی سعی ہی نہیں کی۔ انھوں نے شعر کے حسن و قبح کو صرف لفظوں کے ظاہری دروبست پر ہی جانچا اور پرکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فنی اعتبار سے گو اکثر اعتراضات درست نظر آتے ہیں لیکن ذوقِ سلیم جو صرف سطح کو نہیں دیکھتا بلکہ گہرائی میں اترنے کی کوشش کرتا ہے انھیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ کتاب میں اعتراضات کی نوعیت حسب ذیل ہے:

درست اعتراضات

نادرست اعتراضات یا اعتراض برائے اعتراض

ان اعتراضات میں بھی ایک وہ ہیں جن کے ثبوت میں اساتذہ کے شعر پیش کیے گئے ہیں اور ایک وہ ہیں جن میں اساتذہ کے شعر تو نہیں پیش کیے گئے بلکہ ان پر اصلاحیں تجویز کی گئی ہیں۔ نمونے حسب ذیل ہیں

درست اعتراضات کی مثالیں:

جراح: (۱) ہوش کا دارو ہے گویا مستی تسنیم عشق

دارو مؤنث ہے یہ مصرعہ بہت مشہور ہے ع

بدگماں وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس

(ص: ۴)

راقم: چونکہ پنجاب میں دارو کو مذکر بولتے ہیں اس لیے اقبال کا اس کی تانیث کی طرف ذہن نہیں گیا اور وہ اس لغزش کے مرتکب ہوئے۔

جراح: (۲) یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنی مرہم کو

مرہم بالاتفاق مذکر ہے اس میں کسی کو اختلاف کی گنجائش نہیں ہے اردو میں ہمیشہ یہ کہیں گے "مرہم نہ ملا"۔ جلال لکھنوی نے بھی رسالہ تذکیر و تانیث میں مذکر ہی

لکھا ہے۔ (ص: ۱۳)

۲ ۔ پنجابی میں مرہم کو مونث بولتے ہیں اس لیے بے ساختہ ایسے ہی نظم کر دیا حالانکہ ایک دوسرے شعر میں مذکر استعمال کیا ہے:

وقت کے افسوں سے تھمتا نالہ ماتم نہیں
وقت زخم تیغ فرقت کا کوئی مرہم نہیں

راج: (۳) ترآنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذت اس رونے میں
جب خون جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا

اردو میں بعض الفاظ ایسے ہیں جن کا پہلا حرف ساکن ہے مثلاً پاج، پیادہ، پیار، پیاس، پیونڈ، پیاز، تقطیع میں یہ پہلا حرف شمار میں نہیں آتا یا یہ کہیے کہ ان الفاظ میں دوسرا حرف تقطیع سے خارج رہتا ہے بات ایک ہی ہے۔ استادوں کے کلام میں ان تمام لفظوں کی بندش اس قاعدے کے تحت میں آئی ہے۔ مگر مصنف نے لفظ پیازی کو فعولن کے وزن پر باندھا ہے حالانکہ فعلن کے وزن پر باندھنا چاہیے یعنی تقطیع میں پازی آئے۔ سید انشاء فرماتے ہیں:

سفرہ پہ ظرافت کی ذرا شیخ تو دیکھو
سر لون کا مسہ پیاز کا انجور کی گردن

یہاں بھی پیاز کو یاز کے وزن پر باندھا گیا ہے۔ بول چال میں بھی پیازی کا تلفظ غازی کے وزن پر نہیں ہے۔ ایک واقف کار اور مشاق شاعر سے ایسی غلطی کی امید نہیں ہو سکتی تھی۔ علاوہ ازیں مصرعہ اول میں پر بمعنی مگر متروک ہے۔ (ص: ۱۸)

راج: (۴) نشا پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے

نشا بمعنی شراب مجاز مرسل کی رو سے درست ہے مگر فصحائے اردو نے اسے اس معنی میں استعمال نہیں کیا۔ ہمیشہ سرور و کیفیت کے معنی میں استعمال کیا

ہے۔ اس لیے شراب کے معنی میں استعمال کرنا مستند نہیں کہا جا سکتا۔

جرّاح: (۵) ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل

پہلے مضمون میں ہم نے ایطائے جلی کی ایک مثال پیش کی تھی اس شعر میں بھی وہی عیب موجود ہے۔ جس طرح آب و گلاب کا قافیہ معیوب ہے اسی طرح آب و غرقاب کا قافیہ بھی ناجائز ہے۔ کیونکہ غرقاب میں گلاب کی طرح آب اصلی اور متحد المعانی ہے۔

(ص: ۱۶)

نادرست اعتراضات یا اعتراض برائے اعتراض کی مثالیں:

جرّاح: (۱) پھر یہ آزردگیِ غیر سبب کیا معنی

بے سبب، بے جا، بے وجہ، ناروا، بے محل، اتنے لفظ موجود تھے مگر سب کو چھوڑ کر ٹکسال باہر لفظ غیر سبب استعمال کیا گیا۔ مرزا غالب مرحوم نے ایک خط میں اس لفظ کو گدھوں کی زبان لکھا ہے۔ (نقل کفر کفر نہ باشد) دیکھو اردوئے معلی صفحہ ۲۱۹۔ (ص: ۵)

راقم: اقبال نے فارسی شاعری کے تتبع میں بیسیوں الفاظ و تراکیب اردو میں استعمال کی ہیں۔ ان میں سے ایک 'غیر سبب' بھی ہے۔ چند مثالیں:

ع اے کہ تجھے نظم دہر کا ادراک ہے حاصل تجھے
ع تا بدخشاں پھر وہی لعل گراں پیدا کرے
جس کے نغموں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

اے کہ، تا بدخشاں، غیر از، یہ سب فارسی اثرات کا نتیجہ ہیں۔ اور اس قسم کے الفاظ اقبال کے یہاں بہت کثرت سے ملتے ہیں۔ اسی قبیل سے 'غیر سبب' کو بھی سمجھنا چاہیے۔ بہت ممکن ہے اقبال کے پیش نظر فارسی کا یہ شعر رہا ہو۔

ہر دم آزردگی غیر سبب را چہ علاج
ما گرفتیم ز لطف تو غضب را چہ علاج

زیر بحث شعر اس شعر سے مستفاد معلوم ہوتا ہے سے پھر یہ آزردگی بے سبب کیا معنی۔ اپنے شیداؤں پہ یہ چشم غضب کیا معنی۔

جراح (۲) مہمل گوئی

مکاں خانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

مصرعہ اول فہم انسانی سے بالاتر ہے۔ مصرعہ ثانی میں "ہے تو" اور "تو ہے"۔ کو لغویات میں شامل سمجھنا چاہیے۔ یا تو دونوں جگہ "ہے تو" کہا جائے یا دونوں جگہ "تو ہے" کہا جائے اور یہاں کوئی خاص رکاوٹ بھی نہ تھی خدا کا آخری پیغام تو ہے، جاوداں تو ہے۔

راقم: آنی آن سے بنا۔ آن کے معنی ہیں وقت۔ لمحہ۔ آنی بمعنی لمحاتی۔ ___

راقم: آنا فانا کی طرح آنی وفانی بھی مستعمل ہے۔ آنی کے معنی سمجھے بغیر ہی اقبال کو مہمل گو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی جب کہ اقبال نے اس لفظ کو متعدد اشعار میں استعمال کیا ہے مثلاً،

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کار جہاں بے ثبات، کار جہاں بے ثبات (مسجد قرطبہ)

مصرعہ ثانی پر اعتراض کرتے وقت مصنف نے اس رمز پر توجہ نہیں کی کہ "ہے تو" میں قطعیت کا جو زور مضمر ہے وہ "تو ہے" میں نہیں۔ اس کا تعلق وجدان سے ہے۔

جراح (۳) ساحل دریا پہ میں اک رات تھا محو نظر
گوشہ دل میں چھپائے اک جہان اضطراب

محو نظر بے معنی بات ہے۔ محو دید کہیے، یا محو نظارہ، یا محو تماشہ اگر یہ کہا جائے کہ ایک مفہوم کو ظاہر کرنے کے لیے یہ نیا لفظ تراش لیا گیا تو کیا گناہ ہے۔ بیشک کوئی گناہ نہیں۔ اچھی بات ہے۔ زبان کی خدمت گذاری ہے۔ مگر اس کا مفہوم بھی کچھ ہو۔ کسی کی یا اپنی نظر میں کوئی کس طرح محو ہو سکتا ہے۔ دید میں محو ہوگا۔ نظارے میں محو ہوگا۔ قرآن کی مدد سے قیاسی گھوڑے دوڑا کر مفہوم کی منزل تک پہنچے تو کیا پہنچے۔ نظر اور نظارے کو متحد المعانی ثابت کرنے کے لیے

مولویانہ لغت بازی کی ضرورت نہیں ہے نظر کا استعمال اس قدر معروف ہے کہ
اس کے لیے کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔ (ص: ۲۰)

راقم: معترض نے نظر کو عدم معنی الیمنی نگاہ، لے کر اعتراض اٹھایا ہے نظر کے ایک معنی فکر کے بھی ہیں اور یہاں اقبال نے نظر کو فکر ہی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ دوسرا مصرعہ بھی اسی معنی کی طرف مشیر ہے کہ نظر کے معنی محدود ہرگز نہیں بلکہ محو فکر ہیں۔ اس معنی کو لے کر شعر واضح ہوتا ہے اور اعتراض باطل

جراح (۴) کشتۂ عزلت ہوں آبادی میں گھبراتا ہوں میں

کشتہ بمعنی فدا کئے لکھا جاتا ہے۔ مثلاً کشتۂ وفا، کشتۂ جفا، کشتۂ محبت، کشتۂ ناز
لیکن ان سب ترکیبوں میں کشتن کے معنی پیدا کرنے کی صلاحیت موجود
ہے۔ ناز کو خنجر اور چھری سے تعبیر کرتے ہیں اس لیے کشتۂ ناز کی ترکیب
خوب صورت ہے۔ محبت اور وفا بھی عاشق کو مار رکھتی ہے۔ اس لیے کشتۂ وفا
اور کشتۂ محبت درست اور صحیح ترکیبیں ہیں۔ عزلت میں اس قسم کا کوئی وصف
نہیں ہے جو کشتن سے تھوڑا بہت تعلق رکھتا ہو۔ اس لیے یہ ترکیب اہمل
ہے۔ اگر وسعت الفاظ کی کوشش اسی سلیقے سے ہوتی رہے گی تو کل کو کشتۂ
سلطنت، کشتۂ تعلیم، کشتۂ شاعری، کشتۂ انجمن یہ سب ترکیبیں زبان کو حیات
تازہ بخشنے کی مدعی ہو جائیں گی اور لوہے، سونے، چاندی کی طرح علم، [illegible]
تاش، پتنگ، چوسر، شطرنج وغیرہ ہر ایک چیز کا کشتہ مہیا ہو جائے گا
(ص: ۲۰)

راقم: کشتۂ عزلت کی ترکیب اپنی جگہ درست ہے کیونکہ بقول مصنف جس طرح وفا [illegible]
اندر کشتن کے معنی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے اسی طرح عزلت میں بھی کشتہ [illegible]
ہوتے ہیں۔ کیونکہ عزلت ہی ہے جو انسان کو تمام دنیا سے کاٹ کر علیحدہ کر [illegible]
چناں چہ پورا مصرعہ اس پر گواہ ہے جس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ [illegible]
اس لیے آبادی سے گھبراتا ہوں۔ کشتۂ سلطنت، کشتۂ تعلیم اور کشتۂ انجمن وغیرہ [illegible]

تیا چیرت یہ ہے کہ موصوف نے کشتہ کے معنی غلط لکھا ہے۔ جب کہ ان کی پیش کردہ مثالوں میں خصوصاً کشتۂ جفا، کشتۂ محبت وغیرہ میں کشتہ بمعنی مقتول یعنی مارا ہوا استعمال ہوا ہے۔ کشتہ کے لغوی معنی مقتول کے ہیں اور مجازاً عاشق کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ لہذا اگر کشتۂ عزلت کے معنی تنہائی کا عاشق یعنی تنہائی پسند قرار دیے جائیں تب بھی مصرعِ اول میں کشتۂ عزلت کا استعمال درست ثابت ہو جاتا ہے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

یہ جغرافیہ دانی کی مثال پیش کرتا ہے چونکہ قافیہ بحر وغیرہ نے اسے یہاں کاشغر لکھ دیا حالانکہ دریائے نیل کے ساحل سے تا کاشغر خط کھینچا جائے اس سے ہندوستان، افغانستان اور بلوچستان کے مسلمان باہر رہ جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ تعجب اس بات پر ہے کہ شاعر خود ہندوستانی ہے اور ہندوستان کے مسلموں کو بھی اس مقدس اتحاد سے باہر رکھتا ہے۔ (ص ۱۰)

۱۲۔ اس شعر کے اصل مفہوم کو سمجھنے کے لیے جغرافیائی علم کے ساتھ ملی فہم کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری تھا۔ نیل سے مراد شمالی افریقہ اور کاشغر سے مراد ممالکِ اسلامیہ کی وہ آخری حدود ہیں جو ترکستان اور افغانستان پر جا کر ختم ہو جاتی ہیں۔ بلوچستان اس زمانہ میں جب کہ یہ شعر کہا گیا ہندوستان ہی کا ایک حصہ تھا اور آج پاکستان کا حصہ ہے اور ہندوستان مسلمانوں کی قلیل تعداد سے قطع نظر ممالکِ اسلامیہ میں شامل نہیں۔ دراصل اقبال ان تمام ممالکِ اسلامیہ کو حرم کی پاسبانی کے لیے اتحاد کی دعوت دیتے ہیں جو افریقہ سے تا حد کاشغر ایک دوسرے کی سرحدی حدود پر متصل پھیلے ہوتے ہیں پوری نظم "دنیائے اسلام" کو اگر دیکھا جائے تو اس خیال کی تصدیق ہو جائے گی۔

مصرعِ مذکور میں اقبال نے تا حدِ کاشغر کی جگہ تا بخاکِ کاشغر کی اصلاح سے اسلامی ممالک کی مشرقی حدود کی واضح طور پر نشاندہی کر دی۔ کیوں کہ خاک بمعنی سرزمین ایک شہر کی بہ نسبت

زیادہ وسعت رکھتی ہے اور اس میں کاشغر کا جنوبی علاقہ افغانستان بھی شامل ہو جاتا ہے

جوش ملسیانی نے اقبال کے کلام پر جو اصلاحیں تجویز کی ہیں وہ سراسر باطل ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کی نظر شعر کے ظاہر پر رہی اور انھوں نے نظم کے موضوعی و فکری تسلسل کو نظرانداز کرتے ہوئے تنہا شعر کے ظاہری اسلوب و مضمون پر گرفت کی اور اصلاح دی۔ دراصل انھوں نے اقبال کے کلام کو ان کے ملی احساسات اور فلسفیانہ تصورات کی روشنی میں سمجھنے کی سعی ہی نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اقبال کے اشعار کا مفہوم متعین کرنے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ اور زیر بحث اشعار کے پس منظر پر نگاہ کرتے ہوئے اسے قابل اصلاح قرار دیا ہے۔ جو ظاہر ہے کسی طرح درست نہیں۔ چند مثالیں:

اصل: نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

اصلاح: عشق ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنی فریاد کو سینے میں ذرا تھام ابھی (ص: ۲۷)

صرف نالہ کے خام ہونے کو ٹکسال باہر کہہ کر شعر کو اصلاح طلب قرار دیا اور شعر کے اس جذباتی حسن پر نظر نہیں کی گئی جو نالہ کو سینے میں تھامے رکھنے میں مضمر ہے۔ فریاد کو سینے میں تھامنا محل نظر ہے۔ اس طرح اصلاح نے شعر میں کوئی خوبی پیدا نہیں کی۔

اصل: خفتہ خاک پے سپر میں ہے شرار اپنا تو کیا
عارضی محمل ہے یہ مشتِ غبار اپنا تو کیا

اصلاح: خفتہ خاک پے سپر میں ہے کلام اپنا تو کیا
عارضی محمل ہے یہ مشتِ غبار اپنا تو کیا (ص: ۳۰)

یہ اصلاح بھی بے محل ہے یہاں لفظ کلام معنوی اعتبار سے بھی اور باعتبار قافیہ بھی موزوں اور درست نہیں ہے۔ دراصل شعر کے مفہوم و مطلب کو سمجھے بغیر لفظی اصلاح دے دی گئی۔ اقبال کے

نزدیک 'شرار' اس روحانی طاقت سے عبارت ہے جو ہمارے جسم خاکی کے اندر خفتہ ہے لیکن ہمارے جسم کا یہ عمل عارضی ہے ایک وقت آئے گا جب یہ شرار بھڑکے گا۔ یعنی ہماری روح جاگ کر ہماری کمزوریوں پر قابو پالے گی اس وقت اگر خفتہ ہے تو کیا ؟

اصل : ہے بجا شیوہ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصہ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

اصلاح : گو ترے حکم کی تعمیل میں مشہور ہیں ہم
قصہ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم (ص : ۴۰)

شیوہ تسلیم یعنی رضائے الٰہی کو ہر چیز پر مقدم رکھنا بالفاظ دیگر راضی بہ رضا ہونا۔ حکم کی بجاآوری میں جذبہ تسلیم شامل نہیں ہے۔

اصل : تھی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا!
عرش والوں پہ کھلتا نہیں یہ راز ہے کیا!

اصلاح : تھی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا
عرش والوں کو تجسس تھا کہ یہ راز ہے کیا (ص : ۴۲)

لکھتے ہیں : مصرعِ ثانی میں تھی کے مقابل میں کھلتا نہیں کہنے سے تقابل کی پوری شان مٹی میں مل گئی۔ حالانکہ مضمون تقابل کی پوری شان قائم رکھنے کا تقاضا کر رہا ہے۔ (ص : ۴۲)

اس شعر کے اندر تقابل کا کوئی پہلو نہیں ہے نہ لفظی، نہ معنوی اور نہ واقعاتی۔ اس میں فرشتوں اور عرش والوں کے اس استعجاب کا اظہار ہے جو انھیں انسان کی اس پرواز پر تھا کہ اس کی نارسا عرش تک وتاز کیسے پہنچ گئی۔

اصل : تبریز مئے زہد سے تھی دل کی صراحی
تھی تہہ میں کہیں دردِ خیال ہمہ دانی

اصلاح : تیر بزمِ مئے زہد سے تھی دل کی صراحی
تھا تہ میں کہیں دردِ غرورِ ہمہ دانی (ص : ۴۵، ۴۶)

دَرد کو مذکر خیال کرتے ہوئے یہ اصلاح دی گئی۔ البتہ معترض نے خیال کی جگہ غرور کا اچھا استعمال کیا ہے۔ معترض نے دَرد کو مذکر لکھا ہے۔ راقم کا خیال ہے دُرد مشترک ہے مذکر و مونث دونوں ہی صورتوں میں مستعمل ہے۔ جلال لکھنوی نے اپنے رسالہ تذکیر و تانیث میں لکھا ہے :

دَرد مذکر ہے، دُرد مشترک ہے لیکن مؤلف کے عندیہ میں مونث ہے۔
(مفید الشعراء مطبع مجتبائی دہلی ص : ۳۲)

اصل : رلاتی ہے مجھے راتوں کی خاموشی ستاروں کی
نرالا عشق ہے میرا نرالے میرے نالے ہیں

اصلاح : کبھی رو رو کے ہنستا ہوں کبھی ہنس ہنس کے روتا ہوں
نرالا عشق ہے میرا نرالے میرے نالے ہیں (ص : ۷۹)

معترض کے نزدیک خاموش راتوں میں عشاق کی گریہ زاری کرنا ایک عام بات ہے اس میں نرالے پن کی کوئی بات نہیں۔ اسی خیال کے پیش نظر اس شعر پر اصلاح تجویز کی گئی۔

اس شعر کا سارا حسن لفظ خاموشی میں ہے اور یہی مرکزی نکتہ عشق اور نالہ کے نرالے پن کا ہے کیونکہ خاموشی مریض عشق کے لیے سکون بخش ہوتی ہے اگر ستارے گویا نظر آتے ہیں تو عشق کے جذبات جاگتے ہیں۔ جس کا نتیجہ گریہ وزاری ہے۔

اقبال کی شاعرانہ عظمت کے پیش نظر ان پر کی گئی منفی تنقید کو نظرانداز کیا جاتا رہا ہے ضرورت ہے کہ اس کی بازیافت کی جائے اور اس کے صحیح و معتبر حصوں کو نئی ترتیب و تہذیب کے ساتھ محفوظ کر دیا جائے۔ کیونکہ کسی بھی عظیم شاعر سے نسبت رکھنے والی تحریر اپنی جگہ خود ایک اہمیت رکھتی ہے۔ کاش کوئی اس طرف توجہ دے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

تعارف و تبصرہ

نام کتاب : یہ راستے (ناول)

مصنف : رفیعہ منظور الامین

صفحات : ۳۳۸

ناشر : انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش، حیدرآباد

قیمت : ۲۵ اروپے

تبصرہ نگار : ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

اردو ناولوں میں اور ان میں بھی خواتین کی لکھی ہوئی ناولوں میں نسوانی کردار کے ارتقار کی اپنی تاریخ ہے۔ اور اس ارتقار پر سماج کے بدلتے ہوئے تیور، عورتوں کی الم نصیبی، اور پھر اس کے خلاف پہلے درونِ خانہ اور پھر کھلے عام جدوجہد: سب ہی کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔

عورتوں کی ناول نگاری کی تاریخ اگر رشیدۃ النسار کی ناول "اصلاح النسار" سے بھی شروع ہوتی ہے تو یہ ایک صدی سے اوپر مدت پر محیط ہے۔ "اصلاح النسار" ۱۸۸۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد ہندوستان میں اگر ایک طرف انگریزی حکومت کو استحکام ملتا ہے تو دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ گلستانِ ہند کی متعدد کلیاں نسیم مغرب کے زیر اثر چٹکنے اور مہکنے لگتی ہیں۔ یہ دورِ نشاۃ الثانیہ ہے۔

نسوانی کرداروں کا ارتقار تحریکِ نسواں کا مرہونِ منت ہے۔ جیسے جیسے یہ تحریک بڑھتی گئی، نئی راہیں بنائی گئیں، ویسے ویسے ناولوں کے نسوانی کرداروں کا ارتقار ہوتا گیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ناولوں کے ان کرداروں نے راہ دکھائی یا تحریک نسواں نے ان کرداروں کی پرداخت کی۔ اگر ادب

سماجی کشمکش کا آئینہ بھی ہے۔ اور آفریدہ بھی تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ناولوں کے نسوانی کردار اور تحریک آزادیٔ نسواں ایک دوسرے سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔

فیعوئی ناول "یہ راستے" کے مرد کرداروں میں اہم ترین مقام التمش کو ملتا ہے اور اس کے بعد مسیح اور فدا حسین آتے ہیں۔ لیکن نسوانی کرداروں میں جہاں کاکل اہم ترین ہے، وہیں ڈورا، کاکل کی ماں شاہدہ اور جور باخو کا رول بھی عورتوں کے کرب والم پر روشنی ڈالتا ہے۔

التمش ایک سابق فوجی عہدے دار کا بیٹا ہے۔ ملک کے باہر تعلیم حاصل کی ہے۔ اور تحقیقاتی کام میں مصروف ہے۔ التمش نے اگر ایک طرف مغربی تہذیب کے اس عنصر کو قبول کر لیا ہے۔ جو اسے عورتوں سے قریب کرتا ہے تو دوسری طرف اس نے مشرق کے ان اقدار کو بھی سینے سے لگائے رکھا ہے۔ جہاں محبت کو جنسی جرم کے ارتکاب تک پہنچنے نہیں دیا جاتا۔

مسیح بچپن ہی سے پادری بننے کی سوچتا ہے لیکن کاکل سے ملنے کے بعد ڈگمگا جاتا ہے۔

مسیح کی ماں ڈورا کا ایک پیچیدہ کردار ہے۔ یہ قبائلی عورت ہے اور قبائلی اقدار و روایات کا اس پر گہرا اثر ہے۔ لیکن وہ ایک انگریز کے فریب میں آجاتی ہے اور مسیح کی ماں بن جاتی ہے پھر وہ میری دانست میں مصلحتاً عیسائی ہو جاتی ہے۔ اختر بخت کی بیوی کی تیمار داری کرتی ہے۔ نرس ہے۔ اور مسیح اس کے پیٹ میں کروٹیں لیتا ہوتا ہے۔

پھر یوں ہوتا ہے کہ اختر بخت کا داماد مر جاتا ہے اور کچھ ہی دنوں بعد اختر بخت، ان کی بیوی اور بیٹی تینوں ایک حادثے میں فوت ہو جاتے ہیں۔

اب ان کے جڑواں بچوں سجاد اور زینو کی پرورش اور دیکھ بھال کا سوال پیدا ہوتا ہے اور ڈورا ہی پر یہ ذمہ داری آپڑتی ہے۔ مسیح بھی ساتھ ہے۔

التمش نے بچوں کو ہاسٹل میں شریک کرنا چاہا۔ بچوں نے انکار کر دیا۔ التمش بچوں کو واپس گھر لاتا ہے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے کاکل آچکی تھی۔

کاکل کا قصہ یہ ہے کہ اس کی ماں شاہدہ، فدا حسین کی بیوی ہے۔ فدا حسین شاعر ہے لیکن کوئی کام نہیں کرتا۔ کمائی ایک کوڑی نہیں۔ شاہدہ سب کچھ سہہ جاتی ہے۔ شوہر کو پالتی ہے، بچی کی پرورش کرتی ہے۔ اسے پڑھاتی ہے۔ بالآخر کینسر کے موذی مرض کا شکار ہو جاتی ہے۔

اب کاکل اور فدا حسین کب تک جمع پونجی پہ زندگی گزاریں ؟ مال و اسباب بھی بک ڈالا۔ ایسے میں فدا حسین کو نور بانو کا آفر آتا ہے۔ نور بانو اصل میں التمش کی پھپھی ہے۔ بہت مالدار ہے۔ حویلی کی مالک ہے۔ شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے اور اسے لاولد چھوڑ جاتا ہے۔

نور بانو بڑی ٹھسّے دار عورت ہے۔ اسے ایک عدد ' ملازم شوہر ' کی ضرورت ہے جو اس کا تابعدار رہے۔ فدا حسین کی ضرورت کی بھی تکمیل نظر آتی ہے۔ لیکن کاکل کو نور بانو اپنے ساتھ رکھنے کو تیار نہیں۔ پھر فدا حسین تجویز رکھتے ہیں کہ کیوں نہ کاکل کی شادی کر دی جائے۔ نور بانو نے حفیظ نامی ایک لڑکے کو ڈھونڈھ نکالا۔ اسے ایک ہوٹل دلا دیا۔ کاکل بی۔ اے ہے اور حفیظ بس یوں ہی شاید حرف شناس ہے۔ لیکن کاکل شادی کی ' محل ہی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شادی سے انکار کر دیا اور چل پڑی۔ " میں اپنا راستہ خود بناؤں گی"

یہی کاکل اب زینو اور عماد کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔

یہاں مسیح کو کاکل سے محبت ہو جاتی ہے۔ اور ایک مثلث تیار ہوتا ہے۔ کاکل اسے محض دوستی اور نیک نیتی سمجھتی ہے۔ مسیح فادر بننے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اب ڈگمگا جاتا ہے اور ڈورا اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے کہ مسیح کاکل کا ہو جائے اور فادر بننے کا ارادہ ترک کر دے۔

ادھر التمش بھی کاکل کی طرف راغب ہوتا ہے اور وہ بھی اندر سے جل جاتا ہے ورنہ وہ تو شادی سے انکار کرتا تھا۔ لیکن التمش کی الجھن جو ایک شک و شبہ کی ذہنیت کی پرداختہ ہے کہانی کو ایسا رنگ دیتی ہے کہ قاری بھی الجھتا، چونکتا رہتا ہے۔

ڈورا نے ڈوری ڈالی کہ مسیح مسلمان ہے اور اختر بخت کا لڑکا ہے۔ التمش سخت اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لیکن مسیح التمش اور کاکل کی محبت کو سمجھتا ہے۔ اور خود کو روڑا بننے کے گناہ سے بچانا چاہتا ہے۔ وہ فادر کو بلاتا ہے۔ اور فادر نے جھوٹ کو بے نقاب کر دیا۔ مسیح ایک انگریز کا بیٹا ہے۔ اب ڈورا بالکل لوٹ چکی تھی۔

اور یہ سب کاکل کے پیٹھ پیچھے ہو رہا تھا۔ اور وہ "اپنا راستہ آپ بنانے" کے اپنے اٹل فیصلے پر قائم ہے۔ چلے جانے کی تیاری کر رہی ہے۔ اور اپنا سوٹ کیس اٹھائے چلی جاتی ہے ریل میں سوار ہو جاتی ہے اور میٹو پالم کے چھوٹے اسٹیشن پہ اتر جاتی ہے۔ ایسے میں ایک ہاتھ آگے

بڑھتا ہے اس کا سوٹ کیس لے لیتا ہے یہ اتمش ہے اور کاکل سے کہہ رہا ہے کہ گھر چلو"

رفیعہ کے نسوانی کرداروں کا ایک جائزہ ضروری ہے۔

شاہدہ فرض و محبت کے دائرے میں قید، نکھٹو شوہر کو برداشت کرتی ہے۔ خود کماتی اور اس کی پرورش کرتی ہے۔ بچی بھی ہے اور اسے پالتی پڑھاتی ہے۔ اسی کرب میں مبتلا بالآخر مر جاتی ہے۔

حور بانو ہے جو دولت کے گھمنڈ میں مست ہے۔ فدا حسین اپنی عادت اور نکھٹو پن سے مجبور اس کے ہو جاتے ہیں۔ اور بیٹی مُنک کو چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن حور بانو کے برتاؤ سے (جو شاہدہ کے رویے سے بالکل برعکس تھا) ان کے ضمیر کو شاید ٹھیس پہنچتی ہے۔ شاہدہ کے مشاہرے میں جو اضافہ ہوا تھا، اس کے مرنے کے بعد سارا بقایا فدا حسین کو ملا۔ اس سے انھوں نے خود اپنی بزنس شروع کی اور سماج میں ایک مقام پیدا کر لیا۔

حور بانو بھی ماں بن گئی اور لگتا ہے کہ فدا حسین کے بدلے ہوئے تیور اور ماں بننے کی مسرت دونوں ہی نے حور بانو کے رویہ میں انقلابی تبدیلی پیدا کی۔ محسوس ہوتا ہے کہ ماں بننے ہی پر عورت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کی محبت اور اس کے جذبات میں شدت بھی پیدا ہوتی ہے اور وسعت بھی۔

اب وہ بھی فدا حسین کے نئے گھر میں آگئیں اور اپنی کوٹھی خیراتی کام کے لیے وقف کر دی۔

ڈورا ایک غریب قبائلی عورت ہے۔ نرس ہے۔ اور ایک انگریز کی جنسی بھوک کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے اس کا بیٹا مسیح ہی سب کچھ ہے۔ اسے پادری بننے سے روکنے ہی میں اس کا مستقبل محفوظ رہتا ہے۔ اس کے لیے وہ مذہب بدلتی ہے۔ جھوٹ بولتی ہے اور کیا کیا کچھ کرتی ہے۔

کاکل ہے جو خوددار ہے اور ایک بیدار نسوانی انا رکھتی ہے۔ "اپنا راستہ آپ بنانے" کی ہمت رکھتی ہے۔

ان کرداروں پر سوچتے وقت میرے ذہن کے پردے پر عورتوں کی لکھی ہوئی ناولوں کے نسوانی کردار فلیش بیک کی شکل میں ابھر آئے۔

رشیدۃ النساء کی ناول "اصلاح النساء" میں تعلیم و تربیت کی اہمیت جتائی گئی ہے۔ نذیر احمد

نے بھی تو صغریٰ کو ایک اچھی پڑھی لکھی، اپنے گھر بار کی خدمت کرنے والی با سلیقہ عورت کی صورت میں پیش کیا ہے۔ رشیدۃ النساء نے بھی تعلیم و تربیت پر زور دیا ہے لیکن ساتھ ہی قدیم تصورات اور روایات اور نسل و خون کی وراثت کی پاسداری کی اہمیت بھی بتائی ہے۔

اکبری بیگم کی ناول جسے افضل علی کے نام سے شایع کیا ہے "گدڑی کا لال" میں جو ۱۹۰۷ء میں شایع ہوئی، تعلیم نسواں پر زور ہے۔ تحریک نسواں جس منزل میں ہے اس کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ اصلاح اخلاق کو مقصد بنایا ہے۔

صغریٰ ہمایوں مرزا کی ناول "سرگذشت ہاجرہ" جو ۱۹۲۶ء میں چھپی ہے۔ ایک مظلوم لڑکی کی کربناک داستان ہے۔

عباس بیگم کی ناول "زہرہ بیگم" جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ کم سنی کی شادی کے مضر اثرات کو بے نقاب کرتی ہے۔ اور عورت کی روایتی وفاداری۔ شوہر تو ہر طرح کا ظلم کرے اور عورت شوہر کی محبت کا دم بھرے۔ اس پر طنز و تنقید ہے۔

عورت کی مظلومی کی داستان اور بھی ناولوں میں ملتی ہے۔

نذر سجاد کی ناولوں میں بھی جہاں اعلیٰ متوسط طبقہ کی عورتوں کی تہذیب اور معاشرت افکار و اقدار پر روشنی ڈالی ہے وہیں عورت ہر جگہ درد و کرب سے کراہتی ہوئی ملتی ہے۔

قرۃ العین کی ناول "اگلے جنم مجھے بٹیا نہ کیجو" کی ہیروئن زندگی بھر ٹھوکریں کھاتی ہے، اذیتیں برداشت کرتی ہے اور بس یہی چاہتی ہے کہ اگلے جنم وہ عورت نہ بنے۔

آخر میں میرا ذہن عصمت چغتائی کی ناول "ٹیڑھی لکیر" کی طرف منعطف ہوا۔ اس کی ہیروئن شمن سرکش بھی ہے اور جاندار بھی۔ اپنی دنیا آپ بناتی ہے۔ یہاں سے وہ دور شروع ہوتا ہے جہاں تحریک آزادی نسواں نے جدوجہد کا ایک نیا موڑ اختیار کیا ہے۔ عورت اپنی دنیا آپ بنانا چاہتی ہے۔

رفیعہ کی ناول "یہ راستے" میں اگر شاہدہ ہے جو اپنے آپ کو نصیب کے سپرد کر چکی ہے۔ ڈورا ہے جس نے قدیم سماجی ڈھانچے کے اندر ہی جہاں مرد کی جنسی ہوس کا شکار ہو جاتی ہے وہیں وہ اپنے بچے کو اپنے بڑھاپے کا سہارا بنانا چاہتی [illegible]

مرد کا احسان لینا نہیں چاہتی جو اسے معاف کر لے اور اپنانے کے لیے تیار ہے۔ لیکن ناکام ہو جاتی ہے، لوٹ جاتی ہے۔

کوکل کہیں "ٹیڑھی لکیر" کی شمن کا ترقی یافتہ اڈیشن تو نہیں ؟ اپنا راستہ آپ بنانے کا شعور اب اور پختہ ہو گیا ہے۔ اب مرد کو سرنگوں ہونا پڑ رہا ہے۔

رفیعہ منظور الامین کی یہ ناول "یہ راستے" اگر ایک طرف خود رفیعہ کی ناول نگاری کے شعور اور فنی ارتقار کی مظہر ہے۔ تو دوسری طرف تحریک نسواں کے بدلے ہوئے تیور کی نشاندہی کرتی ہے۔

اردو ادب (سہ ماہی)

۱۹۹۵ء شمارہ (۴،۳)

اردو ادب

(قاضی عبدالغفار نمبر)

اڈیٹر

خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلی

۱۹۹۵ء شمارہ (۳،۴)

سالانہ قیمت	۷۵ روپے
فی شمارہ	۲۰ روپے
موجودہ شمارہ	۵۰ روپے

پرنٹر پبلشر ایم۔ حبیب خاں، اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند) نے ثمر آفسٹ پرنٹرس
نئی دلّی میں چھپوا کر اُردو گھر راؤز ایونیو نئی دلّی سے شائع کیا

فہرست

خلیق انجم

قاضی عبدالغفار ـــ سوانحی خاکہ

(حرفِ آغاز)

قاضی عبدالغفار بیسویں صدی کی اردو نثر کی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے قبل کے فکشن نگاروں میں انھیں ممتاز مقام حاصل تھا ان کی تصنیفات "لیلیٰ کے خطوط" "مجنوں کی ڈائری" افسانوں کے دو مجموعے "عجیب" اور "تین پیسے کی چھوکری" اردو فکشن کا قابلِ قدر سرمایہ ہیں۔ قاضی صاحب نے اردو میں ترجمے بھی کیے تھے۔ انھوں نے جان گالزوردی کے ناول The Apple Tree اور جبران خلیل جبران کی "النبی" کا "اس نے کہا" کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

قاضی صاحب کی "آثارِ جمال الدین افغانی" "آثارِ ابوالکلام آزاد" اور "حیاتِ اجمل" کو سوانح نگاری کا اعلا ترین نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ "نقشِ فرنگ" قاضی صاحب کا سفرنامہ ہے، جسے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ قاضی صاحب شعر بھی کہتے تھے۔ اگرچہ انھوں نے اپنا کلام کبھی شائع نہیں کرایا۔ انھوں نے کچھ دن حکیم اجمل خاں سے اصلاح لی تھی۔ قاضی صاحب نے اعلا درجے کے ڈرامے بھی لکھے تھے۔

قاضی صاحب کا ذکر کیے بغیر اردو صحافت کی تاریخ نہیں لکھی جا سکتی۔ قاضی صاحب نے صحافتی زندگی کا آغاز "ہمدرد" کے نائب مدیر کی حیثیت سے کیا، اس کے مدیر مولانا محمد علی تھے پھر کلکتے سے روزنامہ "جمہور" جاری کیا۔ نو مہینے بعد جب حکومت کے دباؤ سے یہ روزنامہ بند ہو گیا تو قاضی صاحب دہلی آ گئے۔ یہاں سے روزنامہ "صباح" جاری کیا۔ کچھ دن بعد قابلِ اعتراض مضامین شائع کرنے کے الزام میں "صباح" کی ضمانت ضبط

کرلی گئی۔ اس طرح یہ اخبار بھی بند ہوگیا۔

قاضی صاحب نے مرادآباد سے میونسپل کمیٹی کے چیرمین کے عہدے کے لیے دو بار انتخاب میں حصہ لیا؛ پہلی دفعہ جیت گئے اور دوسری بار ہار گئے۔ انھوں نے تجارت بھی کی؛ پیرس میں مرادآباد کے برتنوں کی دکان کھولی مگر ناکام رہے۔ قاضی صاحب چھ سات سال تک انجمن ترقی اردو کے فعال اور سرگرم سکریٹری بھی رہے۔

غرض یہ ہے کہ قاضی صاحب کی شخصیت کثیرالجہات تھی وہ اردو کے ممتاز ترین ناول نگار، افسانہ نگار، ادیب، نقاد، ڈرامہ نویس، انشائیہ نگار، شاعر، مترجم اور اردو تحریک کے علم بردار تھے افسوس ان پر اب تک کوئی معقول تحقیقی یا تنقیدی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ ان کی تصنیفات کے تنقیدی اڈیشن بھی شائع نہیں ہوئے۔ حد تو یہ ہے کہ ابھی تک اس غیر معمولی شخصیت کی سوانح عمری نہیں لکھی گئی۔ ان کی صاحبزادی فاطمہ عالم علی صاحبہ نے قاضی صاحب پر "ابا کے ساتھ گزرے ہوئے چند لمحے"، کے عنوان سے بارہ صفحات پر مشتمل ایک مقالہ لکھا ہے، جو ان کی کتاب "یادش بخیر" میں شامل ہے۔ چوں کہ فاطمہ صاحبہ کو ان کے ماموں سر محمد یعقوب نے گود لے لیا تھا، اس لیے اپنے والد اور خاندان کے بارے میں ان کی معلومات بہت کم ہیں۔

قاضی صاحب کی زندگی کے بارے میں مکمل معلومات کہیں نہیں ملتیں۔ چند مضامین ہیں، کچھ سوانحی حقائق بکھرے ہوئے ہیں، جنھیں میں نے یہاں اکٹھا کر دیا ہے' ان میں سے بہت سے حقائق اور سنین تحقیق طلب ہیں، وہ مضامین ہیں:

۱۔ فاطمہ عالم علی، ابا کے ساتھ گزرے ہوئے چند لمحات

(یادش بخیر، فاطمہ عالم علی، ۱۹۸۹ء، حیدرآباد)

(زیرنظر کتاب میں شامل درج ذیل مضامین)

۲۔ فاطمہ عالم علی۔ ابا کی باتیں

۳۔ قاضی عبدالغفار، برماجراں گزشت

۴۔ ایم۔ حبیب خاں، قاضی عبدالغفار اور انجمن ترقی اردو (ہند)

۵۔ حکیم محمد حسین خاں شفا، کچھ آثار قاضی عبدالغفار

۶۔ ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری، قاضی عبدالغفار کی تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ

۷۔ سری نواس لاہوٹی، قاضی عبدالغفار: ہماری زبان، دہلی یکم ستمبر ۱۹۸۵ء

قاضی عبدالغفار کے آباؤ اجداد مغلوں کے عہد میں عرب سے ہندوستان آئے تھے اس خاندان کے لوگ مغل حکومت کے محکمۂ قضات کے اعلا عہدوں پر فائز رہے تھے۔ قاضی صاحب کے دادا قاضی حامد علی ۱۸۵۷ء میں مراد آباد کے قاضی تھے۔ فاطمہ عالم علی کو قاضی عبدالغفار نے اپنے دادا کی وفات کے بارے میں یہ واقعہ سنایا:

"جب دہلی میں غدر ہوا تو اس وقت ہمارے دادا (قاضی حامد علی) مراد آباد کے قاضی تھے اور ہمارے والد کی عمر اس وقت تیرہ سال تھی۔ دہلی کے قلعہ میں کہرام برپا تھا اس قیامت میں ایک شہزادہ قلعہ سے بھاگ کر مراد آباد کی طرف آنکلا، نفسا نفسی کا عالم تھا کوئی شہزادے کو پناہ دینے کو تیار نہ تھا۔ ہمارے دادا کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے شہزادے کو اپنے یہاں چھپا لیا۔ انگریزوں کے جاسوس ہر طرف پھیلے ہوئے تھے کسی نے خبر کر دی کہ مراد آباد کے قاضی نے شہزادے کو پناہ دے کر غداری کی ہے شہر میں کھلبلی مچ گئی ہمارے دادا کے دوست احباب گھبرائے ہوئے آئے اور کہا "قاضی جی آپ نے یہ کیا غضب کیا۔ اب آپ کی خیر نہیں خدا کے لیے روپوش ہو جائیے۔ آپ پر غداری کا الزام لگ چکا ہے" مگر قاضی جی نے صاف انکار کر دیا اور کہا میں نے غداری نہیں وفاداری کی ہے۔ اب جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔

چنانچہ ہمارے دادا مسجد میں عصر کی نماز ادا کر رہے تھے کہ انگریز ان کو پکڑ کے لے گئے اور آناً فاناً پھانسی دیدی۔ ادھر پھانسی ہوئی ادھر دادی کو مع بچوں کے گھر سے نکال کر مکان اور جائیداد ضبط کر لی۔ انگریزوں کے ظلم و ستم سے ہر شخص خائف تھا۔ قاضی کی بیوی کو پناہ دینے کی کسی میں ہمت نہ تھی مگر کسی اللہ کے بندے نے رات گزارنے کے لیے جگہ دے دی۔ آدھی رات کا وقت ہوگا کہ کسی نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی سارے گھر کی جیسے

جان نکل گئی لیکن مسلسل کنڈی کی آواز پر مرتا کیا نہ کرتا دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ ایک "لالہ" آئے ہیں۔ اور قاضی جی کی بیوی سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری دادی نے دروازے کی اوٹ سے آنے کی وجہ پوچھی تو لالہ نے کہا "بہن قاضی جی کی لاش بے گور و کفن پڑی ہے اس کے لیے بھی کچھ سوچا" ہماری دادی نے کہا "بھلا لالہ آدھی رات وہ بھی قیامت کی میں مجبور عورت ذات کیا کر سکتی ہوں؟" لالہ نے ہمت دلائی اور کہا "چلو ان کی لاش تلاش کر کے کچھ انتظام کریں" ابا نے ایک خاص مسکراہٹ کے ساتھ لمبی سانس لی اور کہنے لگے۔ "اس زمانے کی عورتیں جنھوں نے زندگی میں کبھی قدم گھر سے باہر نہ نکالا ہو وقت پڑنے پر مرد سے زیادہ، ہمت کر جاتی تھیں۔ غرض ہماری دادی لالہ کے ساتھ جہاں سولی لٹکائی گئی تھی وہاں پہنچیں اور ہزاروں لاشوں میں سے شوہر کی لاش تلاش کی، وہیں پر ایک گڑھا کھودا اور لاش دفن کر کے نشانی کے طور پر ایک لکڑی لگا دیں اور گھر آگئیں۔ اس کے بعد جب حالات درست ہوئے اور ہمارے دادا بے قصور ثابت ہوئے تو جان تو واپس نہ آسکی لیکن انگریزوں نے بڑی عنایت کی کہ مکان اور جائیداد واپس کر دی بلکہ کچھ انعام بھی دیا۔ پھر اس وقت ہمارے دادا کی قبر بھی بنوائی گئی۔ کیونکہ دفن کرتے وقت کسی کو یہ ہوش نہ تھا کہ سر کس طرف ہے اور پاؤں کدھر چنانچہ اس لکڑی کی مدد سے قبر پہچانی گئی اور جو کور قبر بنا دی گئی اور وہی حشر کا میدان ہمارا خاندانی قبرستان بن گیا۔"

(یادش بخیر، ص ص ۱۲ - ۱۳)

قاضی عبدالغفار کے والد کا نام قاضی ابرار احمد تھا۔ بقول قاضی عبدالغفار ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے وقت اُن کی عمر تیرہ سال تھی (یادش بخیر، ص ۱۲) جس کا مطلب ہے کہ ان کی ولادت ۱۸۴۴ء میں ہوئی تھی۔ قاضی ابرار احمد کو برطانوی حکومت سے بہت قربت حاصل تھی۔ وہ ایک خوشحال زمین دار اور مراد آباد کے اسپیشل مجسٹریٹ

تھے۔ حکومت سے انھیں خان بہادر کا خطاب ملا تھا۔ انھوں نے کچھ عرصے بھوپال ریاست میں بھی ملازمت کی تھی۔

قاضی ابرار احمد نے پانچ شادیاں کیں۔ دوسری بیوی کا نام ہدایت النسا بیگم تھا۔ ان سے تین لڑکے اور چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ قاضی عبدالغفار انہی کی سب سے بڑی اولاد تھے۔ فاطمہ صاحبہ نے قاضی صاحب کے ایک بھائی قاضی عبدالجبار اور ایک بہن خدیجہ صاحبہ کا ذکر کیا ہے۔

ایک دفعہ مرادآباد میں طاعون کی ایسی شدید وبا پھیلی کہ محلے کے محلے خالی ہوگئے۔ ایک ہفتے میں قاضی صاحب کے خاندان کے سات افراد خدا کو پیارے ہوگئے۔ ان میں قاضی صاحب کی بہن، بھائی اور والدہ بھی شامل تھیں، قدرت کا کرشمہ یہ تھا کہ قاضی صاحب کا سوا مہینے کا ایک بھائی اور دو سال کی ایک بہن بچ گئی۔

قاضی عبدالغفار مرادآباد کے "محلہ تمباکو والا" میں واقع اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کی تاریخِ ولادت میں اختلاف ہے۔ ایم۔ حبیب خاں صاحب نے قاضی عبدالغفار کے حوالے سے اُن کا سنہ ولادت ۱۸۸۵ء بتایا ہے۔ جب کہ قاضی صاحب کی صاحبزادی فاطمہ عالم علی دسمبر ۱۸۸۹ء بتاتی ہیں۔

قاضی صاحب کی ابتدائی تعلیم مرادآباد میں ہی ہوئی۔ ۱۹۰۲ء میں قاضی صاحب نے مڈل انگلش امتحان پاس کیا۔ جب ۱۹۰۵ء میں انھوں نے مرادآباد کے گورنمنٹ انٹر کالج سے دسویں کا امتحان پاس کرلیا تو اعلا تعلیم کے لیے والد نے علی گڑھ کالج میں داخل کردیا۔ قاضی صاحب نے ابھی انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا تھا کہ والد نے واپس بلا لیا۔ دراصل ان کے انگریز افسروں سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ انھوں نے کسی افسر اور بعض حضرات کا کہنا ہے کہ گورنر سے سفارش کر کے قاضی صاحب کا بطور نائب تحصیل دار تقرر کرادیا۔ ایک دفعہ قاضی صاحب ملازمت کے سلسلے میں دورے پر گئے۔ وہ اپنا سامان ایک ڈاک بنگلے میں رکھ کر دفتر کے معائنے کو گئے۔" جب واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کا سامان ڈاک بنگلے میں پڑا ہوا ہے اور ایک انگریز مادر زاد ننگا ان کے کمرے میں بیٹھا ہے

اس پر قاضی صاحب کو بڑا طیش آیا اور انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس انگریز افسر کی چھڑی سے اتنی پٹائی کی کہ وہ آگے بھاگ رہا تھا اور قاضی صاحب چھڑی لیے اس کے پیچھے تھے۔ جب وہ ادھ موا ہو کر بھاگ نہیں سکا تو ایک درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا، تب قاضی صاحب نے اس کو چھوڑ دیا اور واپس ڈاک بنگلے آ کر اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور مراد آباد چلے آئے۔" (قاضی عبدالغفار، سری نواس لاہوٹی ہماری زبان انجمن ترقی اردو ہند دہلی، یکم ستمبر ۱۹۸۵ء)

قاضی صاحب کو سولہ سال کی عمر میں صحافت سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ مراد آباد سے ابن علی کی ادارت میں "نیّر عالم" نام سے ایک رسالہ شائع ہوتا تھا۔ قاضی صاحب کی ابتدائی تحریریں اسی رسالے میں شائع ہوئی تھیں ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد انھوں نے صحافت کی طرف توجہ کی۔ اُن کی خوش نصیبی تھی کہ ۱۹۱۳ء میں مولانا محمد علی نے "ہمدرد" میں انھیں اپنا اسسٹنٹ مقرر کر لیا اور انھوں نے قاضی صاحب کی صحافتی تربیت کی۔ جب پریس ایکٹ کے تحت "ہمدرد" بند کر دیا گیا تو قاضی صاحب کلکتے چلے گئے انھوں نے وہاں سے روزنامہ "جمہور" نام سے اخبار جاری کیا، بعد میں انھوں نے ترجمان اور "صداقت" کی بھی ادارت کی۔ "جمہور" بند ہونے پر انھوں نے دہلی سے روزنامہ "صباح" جاری کیا۔ اس اخبار کے بارے میں قاضی صاحب نے "حیات اجمل" میں لکھا ہے:

"اسی زمانہ میں حکیم صاحب نے دہلی میں ایک روزنانہ اخبار جاری کرنے کا انتظام کیا۔ اس کا نام "صباح" تھا۔ اُس کی ایک ابتدائی اشاعت میں حکیم صاحب کا ایک پیام شائع ہوا، جس میں اُنھوں نے قومی اخباروں کے متعلق حکومت کی سخت گیری کا اس طرح ذکر کیا کہ:

"گو میں ایک عرصہ سے دیکھ رہا ہوں کہ دفتر اقتدار کا پنجہ خصوصیت کے ساتھ اسلامی اخباروں پر زیادہ آسانی سے چلایا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی کچھ ایسے آداگوں سے واقف ہوگئے ہیں کہ اگر ایک دفعہ اُن کی زندگی ختم کر دی جاتی ہے تو پھر دوبارہ بدلے ہوئے روپ میں جلوہ افروز ہو کر اپنے عزم و استقلال کا ثبوت دئے بغیر نہیں رہتے۔ یادش بخیر "جمہور" نے جب اپنے چہرہ پر فنا کی

نقاب ڈالی تو صباحت کی برقعہ کشائی نے اس کی تلافی کر دی۔ اس لیے مجھے اطمینان ہے کہ اگر صباح نے بھی اپنے برادر مرحوم کا ساتھ دیا تو پھر اُسی جمہور کی روح کسی اور روپ میں اپنی رونمائی سے باز نہیں رہے گی۔"

(قاضی عبدالغفار، حیاتِ اجمل، علی گڑھ، ۱۹۵۰ء ص ص ۲۲۵-۲۲۶)

قاضی صاحب کبھی کبھی شعر کہتے تھے چونکہ حکیم اجمل خاں سے انھیں بہت قربت تھی۔ اس لیے انھوں نے شاعری میں حکیم صاحب کا تلمذ اختیار کر لیا۔ اسی دوران خلافت کمیٹی کا وفد لندن جا رہا تھا۔ اس وفد میں سیٹھ چھوٹانی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، سر آغا خاں سید حسن امام اور مشیر حسن قدوائی شامل تھے۔ ڈاکٹر انصاری نے تجویز پیش کی کہ قاضی صاحب اس وفد کے سکریٹری کی حیثیت سے جائیں۔ یہ تجویز منظور کر لی گئی اور قاضی صاحب ۱۴ فروری ۱۹۲۱ء کو اس وفد کے ساتھ لندن پہنچے اور ۲۰ اپریل ۱۹۲۱ء کو ہندوستان کے لیے واپس ہو گئے۔

کچھ دن بعد قاضی صاحب نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر پیرس میں The Oriental Emporium کے نام سے مرادآبادی برتنوں کی دکان کھولی۔ تین چار سال تک کاروبار اچھا چلا، لیکن نہ جانے کیوں اتنا نقصان ہوا کہ دکان بند کر کے قاضی صاحب کو ہندوستان واپس آنا پڑا۔ یہ واقعہ ۱۹۲۵ء کا ہے۔ قاضی صاحب حکیم اجمل خاں کے انتقال کے بعد کچھ دن طبیہ کالج کے سکریٹری رہے۔ ۱۹۲۶ء میں انھوں نے مرادآباد میونسپل بورڈ کے چیرمین کے انتخاب میں حصہ لیا اور کامیاب ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء میں پھر الیکشن لڑے، لیکن اس دفعہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

اسی سال اپنی بڑی بیٹی کی شادی کر کے قاضی صاحب نے مرادآباد کو خیرآباد کہہ دیا۔ کچھ دن دہلی رہ کر گوالیار چلے گئے اور پھر دو سال بعد یعنی ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد پہنچے کچھ ایسے حالات رونما ہوئے کہ وہیں سکونت اختیار کر لی۔

قاضی صاحب نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی ۱۹۱۰ء میں سر محمد یعقوب کی بہن افضال بیگم سے ہوئی۔ سر محمد یعقوب، قاضی صاحب کے خالہ زاد بھائی تھے۔ اس شادی

میں مولانا شوکت علی بھی شریک تھے۔ کہتے ہیں کہ قاضی صاحب کو سلامی کے طور پر جو رقم ملی تھی وہ انھوں نے محمڈن اورینٹل کالج کو دے دی۔ افضال بیگم کے بطن سے چار لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ان میں چاروں لڑکے اور ایک لڑکی پیدائشی معذور تھے۔ تین لڑکے اور ایک لڑکی دو دو سال کی عمر میں خدا کو پیارے ہوگئے منجھلا لڑکا بائیس سال کی عمر تک زندہ رہا۔ اس لڑکے کا نام ارشاد تھا۔ بقول فاطمہ عالم علی صاحبہ:

"یہ بائیس سال زندہ رہے۔ لمبا قد، رنگ گورا، کھڑا ناک نقشہ۔ کوئی اجنبی دیکھ کر سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ جوان لڑکا جو پلنگ پر لیٹا ہے، وہ معذور ہے۔ ان کی کیفیت ایک تین ماہ کے بچے جیسی تھی۔ نہ گردن ٹھہرتی۔ نہ ہاتھ پیر پر اختیار تھا، آواز نکالتے تھے، لیکن زبان نہ پلٹتی تھی۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ گھر والوں کو پہچانتے تھے تکلیف میں روتے اور خوشی میں قہقہے لگاتے" ۲۲ سال کی عمر میں ۱۹۴۱ء کو اللہ کو پیارے ہوگئے۔"

دو صاحبزادیوں کو خدا نے محفوظ رکھا، بڑی صاحبزادی کا نام زہرہ اور دوسری کا نام فاطمہ عالم علی ہے۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں زہرہ کی شادی سندیلے کے چودھری محمد سلطان سے ہوگئی۔ یہ لکھنؤ یونیورسٹی میں لیکچرر تھے۔ ۱۹۶۰ء میں زہرہ صاحبہ کا انتقال ہوگیا۔ فاطمہ اپنی بڑی بہن سے دس سال چھوٹی تھیں یہ دس گیارہ دن کی تھیں کہ ۱۹۲۲ء میں ان کی والدہ افضال بیگم کا انتقال ہوگیا۔ جیساکہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ افضال بیگم کے بھائی یعنی فاطمہ صاحبہ کے ماموں سر محمد یعقوب لاولد تھے، انھوں نے فاطمہ صاحبہ کو گود لے لیا۔ دو سال بعد سر محمد یعقوب کا انتقال ہوگیا اور فاطمہ اپنے والد کے پاس حیدرآباد آگئیں۔

۱۹۲۸ء میں قاضی صاحب نے سکینہ بیگم عرف منی جان سے دوسری شادی کرلی۔ منی جان حبیب سیٹھ کی تھیٹر کمپنی میں کام کرتی تھیں، ان خاتون سے قاضی صاحب کو کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ قاضی صاحب نے اپنی صاحبزادی زہرہ کے لڑکے طارق کو گود لے لیا۔ سکینہ بیگم نے جن کی بڑی محبت سے پرورش کی۔

جب فاطمہ جوان ہوئیں تو قاضی صاحب نے حیدرآباد کے جج ہاشم علی خاں کے صاحبزادے عالم علی خاں سے ان کی شادی کردی۔ خدا کا شکر ہے کہ فاطمہ صاحبہ بقید حیات ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ جب قاضی صاحب کی دوسری بیوی کا انتقال ہوا تو اُن کی چھوٹی صاحبزادی فاطمہ دس گیارہ دن کی تھیں فاطمہ کے ماموں سر محمد یعقوب نے انھیں گود لے لیا تھا ۲۲ نومبر ۱۹۴۲ء کو یعقوب صاحب کا انتقال ہو گیا اور فاطمہ عالم علی اپنے والد کے پاس حیدر آباد آ گئیں۔ فاطمہ کو اپنے والد کو قریب سے دیکھنے کا بہت کم موقع ملا۔ مگر پھر بھی انھوں نے قاضی صاحب کے عادات و اطوار، اور گھریلو زندگی کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں، وہ بیش بہا ہیں اس لیے فاطمہ صاحبہ نے جو کچھ لکھا ہے اُسے مکمل طور پر یہاں نقل کرنا ضروری ہے، وہ لکھتی ہیں :

"۲۳ نومبر ۱۹۴۲ء کو اچانک ماموں میاں کا انتقال ہو گیا یہ میری زندگی کا پہلا زبردست حادثہ تھا۔ ماموں میاں کے انتقال کے بعد "پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم" کے مصداق یوں سمجھئے کہ میں دوبارہ ابا کے گھر پیدا ہوئی اور یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اس کا ناؤں۔

ہاں تو جس وقت میں ابا کے پاس آئی اخبار "پیام" اپنے شباب پر تھا۔ ابا ہفتہ بھر مصروف رہتے تھے۔ حد یہ ہے کہ گھر میں بھی آتے تو ابا کم اور ایڈیٹر زیادہ معلوم ہوتے۔ جب دیکھئے کچھ لکھ رہے ہیں، اور اگر اتفاق سے ہاتھ میں کاغذ پنسل نہ ہو تو کچھ سوچ رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا کہ دماغ میں کوئی مضمون تیار ہو رہا ہے اس قدر کھوئے ہوئے رہتے کہ ان کو یہ بھی خبر نہ ہوتی کہ وہ کہاں بیٹھے ہیں کیا کر رہے ہیں، اور کیا کہہ رہے ہیں مثلاً کھانے کی میز پر بیٹھے ہیں میں نے نہایت محبت سے کباب کی پلیٹ سامنے کرتے ہوئے چونکانے کے خیال سے کہا "ابا کباب لیجئے بہت مزے کے ہیں" اور ابا نے گویا سخت مصروفیت کے باوجود جواب دینے کی زحمت گوارا کی اور فرمایا "ارے بھئی مجھے فرصت نہیں ہے" اب بتائیے کے کباب کی پلیٹ نہ ہوئی پکنک کے پروگرام کی اسکیم ہوئی کہ جس کو عدیم الفرصتی کی بنا پر

ٹھکرا دیا گیا۔ اب یہ فرض بھی مجھی کو ادا کرنا پڑتا کہ ان کو یاد دلایا جائے کہ جناب دفتر میں نہیں کھانے کی میز پر ہیں چنانچہ کان کے پاس منہ لے جاکر زور سے کہتی "یہ دستر خوان ہے" فوراً مسکرا دیتے اور بڑے پیار سے کہتے "کیوں شامت آئی ہے" اور کھانے کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

ابا ہر چیز بھول جاتے سوائے کتاب اور پنسل کے یہ چیزیں تو جیسے ان کی زندگی کا لازمہ حصہ بن گئی تھیں۔ بعض مرتبہ سگریٹ کی جگہ پنسل منہ میں رکھ لیتے اور کئی کئی بار جلانے کی کوشش کرتے، جو بھی اس وقت ان کی یہ حرکت دیکھ لیتا ان کو یاد دلاتا کہ "آپ کے منہ میں سگریٹ نہیں پنسل ہے" اپنی اس حرکت پر بے ساختہ ہنس پڑتے اور لاحول پڑھنے لگتے۔ یہی حال عینک کے ساتھ تھا اکثر عینک چہرے پر ہوتی اور منہ دھوڈ لیتے۔ ابا کی عادت تھی کہ رات کو جب پلنگ پر لیٹ کر پڑھتے تو عینک پیشانی پر کھسکا لیتے (ابا نے پڑھنے کے لیے کبھی عینک استعمال نہیں کی) اور اس وقت کسی کام سے اٹھنا ہوتا یا کوئی صاحب ملنے آجاتے تو فوراً بستر سے اٹھ کر عینک کی تلاش شروع کر دیتے بڑی لجاجت سے پوچھتے "بھئی فاطمہ تم نے کہیں ہماری عینک دیکھی ہے"؟ اور میں بھی گویا ان پر احسان کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہتی "جی ہاں آپ کی پیشانی پر رکھی ہے" عینک فوراً آنکھوں پر آجاتی، اور کہتے "اچھا دیکھا ابھی آکر کیسی مرمت کرتا ہوں" اور باہر چلے جاتے۔ خیر بات عینک اور پنسل تک رہتی تو بھی مضائقہ نہ تھا مگر معاملہ بھول کا کافی طویل ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ عالم علی صاحب نے (جن سے میری منگنی ہو چکی تھی) ابا کو فون کیا اور ابا نے انھیں نہ پہچانا، وہ بیچارے اپنا نام بتاتے رہے اور ابا کو اصرار رہا کہ معاف کیجئے میں آپ کو نہیں پہچان رہا ہوں؟ جب انھوں نے کہا میں ہاشم علی صاحب کا لڑکا بات کر رہا ہوں۔ تو ان کو اپنی غائب دماغی پر بہت کوفت ہوئی۔ اکثر لوگوں کے نام تو نام صورت تک بھول جاتے اور اس بھول

کی بدولت مغرور کہلاتے ۔ غرض آئے دن اس قسم کے بیسیوں واقعات ہوتے رہتے ۔

ابا کے زمانے میں جمعہ کو حیدرآباد میں عام تعطیل ہوا کرتی تھی جمعرات کی شام سے ابا کے یہاں چھٹی کی تیاریاں شروع ہو جاتیں کہیں نہ کہیں پکنک منانے کا پروگرام بنتا موٹر کے لحاظ سے کھانے پکتے۔ اگر باہر نہ جاتے تو گھر پر ہی کبھی پچیسی کبھی شطرنج جمتی اور ابا جو ایک ہفتہ تک گھر میں رہتے ہوئے بھی نہ رہنے کے برابر ہوتے تعطیل کے دن وہ واقعی ہم لوگوں کے درمیان ہوا کرتے۔

ابا نوکروں پر بہت کم غصہ کرتے ہاں اگر ان کے کتوں کی دیکھ بھال میں ذرا سی بھی کوتاہی ہو جاتی تو نوکروں کی شامت آجاتی ۔ کسی نوکر پر غصہ کا یہ انداز بھی خوب ہوتا کہ جس قدر شدت کے ساتھ غصہ آتا اسی قدر ادب سے گفتگو کرتے یعنی آپ اور جناب سے نوکروں کو مخاطب کرنے لگتے ۔ ابا کو "بولتا غصہ" بہت کم آتا تھا۔ دفتر میں یا گھر پر ہی کوئی بات خلاف مرضی ہو جاتی تو خاموش ہو جاتے اور اپنے پڑھنے لکھنے کے کمرے کی صفائی شروع کر دیتے۔ تمام کتابوں اور میز کی صفائی ہو جاتی اخبار جن کا ہر طرف ڈھیر لگا ہوتا قرینے سے ایک جگہ رکھ دیئے جاتے (ورنہ اپنے پڑھنے لکھنے کے سامان کو ہاتھ لگانے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔) کمرے کی جھاڑ پونچھ گویا یہ اعلان ہوتا کہ ابا کو غصہ آگیا ہے۔ سارے گھر کو چپ لگ جاتی۔ میں جو ابا کے سب سے زیادہ منہ چڑھی تھی نہ جانے کیوں میری زبان کو تالا سا لگ جاتا اور اس وقت یہ احساس ہوتا کہ ہم لوگ ابا سے کس قدر مرعوب ہیں خدا جانے کیا بات تھی کہ ہم نہ ڈرتے ہوئے بھی ان کے بگڑے تیور دیکھ کر سہم جاتے۔ عام طور پر ابا کا غصہ میعادی ہوتا تیسرے دن خود بخود بھلے چنگے ہو جاتے۔ گھر بھر میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی اور ہماری زبانیں پھر قینچی کی طرح چلنے لگتیں ۔ غرض یہ بڑا پُر لطف زمانہ ابا کے ساتھ گزرا ویسے تو یہ اچھا خاصا طویل زمانہ ہے مگر سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف چند

لمحے اباّ کے ساتھ گزارے ہیں۔

پھر حیدرآباد کے حالات بدلے اور ان بدلے ہوئے حالات نے ابا کو حیدرآباد چھوڑنے پر مجبور کردیا اور ابا لکھنؤ آگئے۔ لکھنے لکھانے کا سلسلہ یہاں بھی جاری تھا لیکن دفتر کا جھگڑا نہ تھا۔ گھر پر ہی محاورے جمع کرنے کا شوق ہوا کوئی دلچسپ محاورہ نظر سے گزرتا تو ہم لوگوں کو بھی سنانے اور اظہار خیال کا موقعہ دیتے۔ کبھی کبھی دوپہر کو کوئی پرانا واقعہ یا کتاب سے کوئی کہانی پڑھ کر سناتے ایک مرتبہ "غبار خاطر" سے "چڑیا چڑے کی کہانی" سنائی ایک تو کہانی بڑی جاندار اس پر ابا کے سنانے کا دلچسپ انداز آج بھی ان کی آواز کانوں میں گونجتی ہے بس لطف آگیا تھا۔ جی چاہتا کہ ابا کہانی سناتے ہی رہیں۔

کبھی کبھی رات کو کھانے کے بعد بیت بازی کا موڈ آجاتا۔ بچے سب ابا کو گھیر کر بیٹھ جاتے پارٹی بنتی تو سارا گھر ایک طرف اور ابا تنہا پھر ساتھ ساتھ ابا پر پابندی لگادی جاتی کہ جناب فارسی کا شعر نہیں چلے گا لیکن اتنی پابندیوں کے باوجود ہمارے پاس اشعار کا ذخیرہ ختم ہو جاتا اور جیت ابا ہی کی ہوتی .....

قصے کہانیوں کے علاوہ ابا کو گانا سننے کا بہت شوق تھا۔ اپنے گانوں کا شوق، ریڈیو سے پورا کرتے اور گھر میں اکثر شام کو ڈھولک جمتی وہ گیت جس میں بیٹی سسرال میں رہ کر اپنے کنوارے پن کو یاد کرتی ہے بہت بھاتے اور بابل سن کر تو ان کی عجیب کیفیت ہو جایا کرتی تھی۔

ابا قہقہہ مار کر بہت کم ہنستے اور اگر کسی وقت بے قابو ہو کر ہنس دیتے تو جلد ہی اس پر قابو پالیتے ایسا معلوم ہوتا جیسے زور سے ہنس کر انھوں نے کوئی بڑی غلطی کی ہو۔ ابا کو عمدہ کھانے اور بہترین کپڑوں کا بیحد شوق تھا۔ کپڑا ہمیشہ بہت اچھا پہنتے۔ بڑے جامہ زیب بھی تھے۔ چوڑی دار پاجامہ پر

جب ہم رنگ ٹوپی اور شیروانی پہن کر باہر نکلتے تو میں اکثر جھوٹ موٹ کچھ پڑھ کر
پھونکتی اور کہتی کہ خدا نہ کرے کوئی بلا سا تھ نہ لگ جائے تو ہمیشہ کہتے "دیکھ
پھپھے دیتا ہوں منہ کو لگام دینا سیکھو ورنہ سسرال میں جوتے کھائے گی"
جھومتی ہوئی چال پر تو نجانے ابا نے کتنوں کو قتل کیا ہوگا وہ بھلا ہم کو یوں
تبلانے لگیں !!

ابا کی کتابِ زندگی میں کفایت شعاری کا کوئی باب نہ تھا، اور میں
یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ جو کچھ کمانے کھانے اور کھلانے پر اڑا دیتے۔
ابا نے حساب کتاب کا جھگڑا کبھی مول نہ لیا اور ہمیشہ سولہ سو کے ہزار کرتے
رہے ان کو کبھی اخبار "پیام" کی آمدنی کا علم ہوا نہ گھر کے اخراجات کے حساب
لکھنے کا ان کو خیال آیا۔ وہ کہتے خرچ ہو جانے کے بعد حساب لکھنے سے کیا حاصل؟

سری نواس لاہوٹی نے قاضی صاحب کے ساتھ "پیام" کے دفتر میں کئی سال کام کیا
تھا انھوں نے قاضی صاحب کا حلیہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"قاضی صاحب بڑے وجیہہ اور خوش خوراک و خوش پوشاک انسان
تھے۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، اونچا قد، چوڑی پیشانی، خشخشی داڑھی،
گداز جسم، چہرے پر متانت اور آواز میں خوداعتمادی۔"

(ہماری زبان، یکم ستمبر ۱۹۸۵ء)

قاضی عبدالغفار کے روزنامہ "جمہور" کا ذکر تو سنا تھا، لیکن اس کا کوئی بھی شمارہ دیکھنے
کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

روزنامہ[1] "جمہور" کے مالک، مسعود احمد ولد عبدالعزیز تھے یہ موضع نذیر پر شیلا
تحصیل رنگانیا، ضلع چٹگاؤں، مغربی بنگال کے رہنے والے تھے۔ قاضی عبدالغفار کی

---

[1] روزنامہ جمہور کے بارے میں تمام معلومات "اخبار جمہور مرتبہ پروفیسر عابدہ سمیع الدین"
۱۹۹۵ بجنور (یوپی) سے حاصل کی گئی ہیں، جس کے لیے میں عابدہ صاحبہ کی شکر گزار ہوں۔

ادارت میں جمہور کا پہلا شمارہ ۲۳ دسمبر ۱۹۱۷ء کو کلکتے سے شائع ہوا۔ اس اخبار کے لیے دس ہزار کا سرمایہ فراہم کیا گیا تھا۔ اس اخبار کی تجویز آنریبل مولوی عبدالقاسم فضل الحق (کلکتہ)، ڈاکٹر مختار احمد انصاری (دہلی)، آنریبل مولوی عبدالقاسم (بردوان) اور آنریبل سید رضا علی (الہ آباد) نے پیش کی تھی۔

چونکہ جمہور کی پالیسی قوم پرستانہ تھی اور قاضی عبدالغفار کے خیالات باغیانہ تھے، اس لیے حکومت کی اس اخبار پر کڑی نظر تھی۔ ۷ جولائی ۱۹۱۸ء کے جمہور کے ساتھ قاضی صاحب نے ایک پمفلٹ جاری کیا، جس میں مسلمانوں سے اپیل کی گئی تھی کہ مسلمان اپنے ہم مذہب قیدیوں اور ان کے خاندان کے لوگوں کے لیے تحفے روانہ کریں۔ اس پمفلٹ پر حکومت نے ۱۳ اگست ۱۹۱۸ء کو اخبار کے اڈیٹر اور پبلشر دونوں کی سرزنش کی اور ۱۴ ستمبر کو قاضی عبدالغفار کو کلکتہ چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا۔ اس طرح نو مہینے کی شاندار زندگی کے بعد "جمہور" بند ہو گیا۔ ۵ اکتوبر ۱۹۱۸ء کے "مدینہ" اخبار میں درجِ ذیل خبر شائع ہوئی تھی۔

قاضی عبدالغفار صاحب اڈیٹر "جمہور" کی نظر بندی

ہم عصر لیڈر اپنی قریبی اشاعت میں لکھتا ہے کہ مراد آباد کے نامہ نگار نے اطلاع دی ہے کہ پولس کی رپورٹ کے مطابق قاضی صاحب نے "جمہور" بند ہونے کے بعد "ترجمان" اور "صداقت" کی بھی ادارت کی۔ یہ دونوں اخبار تھے یا رسالے، یہ کب جاری ہوئے اور کب بند۔ اس سلسلے میں ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ حکومت مغربی بنگال کے محافظ خانے میں ۱۹۱۷ء کے اخباروں کے بارے میں ایک رپورٹ محفوظ ہے، اس رپورٹ میں "جمہور" کے بارے میں اطلاع دی گئی ہے کہ جمہور کے خیالات بالکل وہی ہیں جو شدید انتہا پسند مسلمانوں کے ہیں۔۔۔ یہ انڈین نیشنل کانگریس، ہوم رول لیگ اور انتہا پسند مسلم سیاست کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ قاضی عبدالغفار وہی ہیں جو پہلے "ہمدرد" دہلی کے اسٹاف میں تھے، جسے پریس

ایکٹ کے تحت بند کر دیا گیا تھا۔ قاضی عبدالغفار مسٹر محمد علی کے، جو ان دنوں نظر بند ہیں' سرگرم عقیدت مند ہیں" (عابدہ سمیع اللہ، "جمہور" ص ۱۱)

"مدینہ" نے ۵ اکتوبر ۱۹۱۸ء کی اشاعت میں اطلاع دی ہے کہ:

"عبدالغفار صاحب اڈیٹر "جمہور" کو صوبہ جات متحدہ کی گورنمنٹ نے ان کے وطن مراد آباد میں نظر بند کر دیا ہے" (جمہور ص ۶۱۵)

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ "جمہور" میں قاضی صاحب کی کسی تحریر کی وجہ سے انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ سری نواس لاہوٹی نے لکھا ہے کہ قاضی صاحب کو ۱۹۱۴ء میں کلکتے میں چھ مہینے کے لیے نظر بند کر دیا گیا اور اس کے بعد انھیں کلکتے سے چلے جانے کا حکم ملا۔ قاضی صاحب مراد آباد چلے آئے مگر انھیں گرفتار کر کے نینی تال بھیج دیا [1]

۱۹۳۴ء کے اوائل میں قاضی صاحب نے حیدر آباد سے روزنامہ "پیام" جاری کیا۔ حیدر آباد کے جاگیرداری ماحول میں قاضی صاحب کے مقامی پولس سے لے کر کتب خانہ آصفیہ کے اہتمام سے اَن بن ہوئی جنھیں گھمنڈ تھا کہ وہ یورپ سے تعلیم پاکر آئے ہیں اور اس گھمنڈ میں وہ لائبریری میں من مانی کرتے تھے۔ بقول سری نواس لاہوٹی قاضی صاحب نے اُن صاحب کے خلاف چودہ اداریے لکھے تھے، وہ صحافتی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔

۱۹۴۲ء میں سر مرزا اسماعیل کی سفارش پر قاضی عبدالغفار حیدر آباد کے محکمۂ اطلاعات کے ناظم مقرر ہوگئے، تین سال تک اس عہدے پر کام کیا "پیام" بند ہو چکا تھا۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اس لیے قاضی صاحب حیدر آباد چھوڑ کر پہلے لکھنؤ گئے اور پھر دہلی آ گئے۔

انجمن ترقی اردو کا صدر دفتر دہلی میں دریا گنج میں تھا ۱۹۴۷ء میں کچھ فسادیوں نے دفتر کو آگ لگا دی انجمن کی لائبریری اور کتب خانے کی لاکھوں روپے کی کتابیں نذرِ آتش ہو گئیں، بہت قیمتی مسودات اور کاغذات جل کر راکھ ہو گئے۔ مولوی عبدالحق کو مجبوراً

---

[1] ہماری زبان، یکم ستمبر ۱۹۸۵ء ص ۱۔

پاکستان جانا پڑا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو قیام انجمن کے وقت ہی سے انجمن اور اس کی سرگرمیوں سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ مولانا مختلف اوقات میں انجمن سے ایک رکن کی حیثیت سے وابستہ رہے تھے ۱۹۴۷ء میں بھی وہ انجمن کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ انھوں نے پولس بھیج کر رہے سہے اثاثے کو بچایا۔ لائبریری کی کچھ کتابیں جو لوہے کی الماریوں میں تھیں اور جلنے سے بچ گئی تھیں انھیں دلی کالج کی عمارت میں منتقل کرایا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں دلی کالج بند ہو گیا تھا۔ کچھ عرصے بعد جب کالج دوبارہ کھلا تو مولانا آزاد نے انجمن کی الماریاں اپنی کوٹھی میں منگوا لیں۔

مولانا کو انجمن کے نئے سکریٹری کی تلاش تھی۔ ان کی نظرِ انتخاب قاضی عبدالغفار پر پڑی۔ مولانا نے قاضی صاحب کو سکریٹری شپ کے عہدے کی پیش کش کی، جسے انھوں نے بخوشی قبول کر لی۔ بقول ایم۔ حبیب خاں صاحب ستمبر ۱۹۴۹ء میں علی گڑھ میں سلطان جہاں منزل کے ایک حصے میں انجمن ترقی اردو کا دفتر منتقل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین انجمن کے صدر نامزد کیے گئے۔

جنوری ۱۹۵۰ء سے انجمن کا باقاعدہ کام شروع ہو گیا ''ہماری زبان'' دوبارہ جاری کیا گیا۔ انجمن کا سہ ماہی رسالہ ''اردو'' تھا۔ مولوی عبدالحق نے کراچی میں انجمن ترقی اردو کا دفتر قائم کیا اور وہاں سے سہ ماہی ''اردو'' جاری کیا۔ قاضی صاحب نے اردو کا نام بدل کر ''اردو ادب'' کے نام سے سہ ماہی رسالہ جاری کیا۔ اس کے اڈیٹر پروفیسر آلِ احمد سرور مقرر ہوئے۔

انجمن ترقی اردو کے سکریٹری کی حیثیت سے قاضی عبدالغفار کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ انھی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اتر پردیش میں اردو کو علاقائی زبان بنانے کے مطالبہ کے سلسلے میں بائیس لاکھ دستخطوں سے صدر جمہوریۂ ہند کی خدمت میں انجمن ترقی اردو نے ایک یادگار میمورنڈم پیش کیا تھا۔ قاضی صاحب نے اس کے لیے ایسے وقت میں آواز بلند کی جب اردو کا نام لینے والوں کو ملک دشمن کہا جاتا تھا۔ اردو کا جائز حق مانگنے کے سلسلے میں اردو والوں نے جو آواز بلند کی

بقول حبیب الرحمٰن مرحوم سکریٹری انجمن ترقی اردو (حیدرآباد)۔

"وہ بہت بڑی حد تک نتیجہ ہے اس جواں ہمت بوڑھے کی انتھک کوششوں کا، جو گزشتہ سات سال سے برابر جد وجہد کرتا آرہا تھا"

(ہماری زبان، یکم مارچ ۵۶ ۱۹ء ص ۰)

یہ حقیقت سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ قاضی صاحب کی رہنمائی میں انجمن ترقی اردو نے نہایت جراءت اور ہمت سے کام لے کر اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کی جدوجہد کی۔ قاضی صاحب کا شمار ان چند ہستیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ہمیشہ حق گوئی سے کام لیا اور جو حق بات کہتے ہوئے بڑے سے بڑے آدمی سے خائف نہیں ہوتے تھے۔ ... جیسے انھوں نے اردو کے سلسلے میں علاقائی اور مرکزی حکومت سے ٹکر لی۔

قاضی صاحب کی وفات خاصی طویل بیماری کے بعد ہوئی۔ ان کی صاحب زادی ... عالم علی نے لکھا ہے:

"قیام حیدرآباد کے آخری دنوں میں وہ آئے دن بیمار رہنے لگے اور علی گڑھ آئے تو بیماری نے مستقل طور پر گھیر لیا۔ مشکل یہ تھی کہ بیماری کی تشخیص میں کئی سال گزر گئے۔ بمبئی میں پتّے کا آپریشن کیا تو معلوم ہوا اصل بیماری جگر کا کینسر ہے۔ آپریشن کے وقت ڈاکٹر مقبول علی، قاضی صاحب کے ساتھ تھے۔ وہ قاضی صاحب کی زندگی سے ناامید ہوگئے تھے۔ لیکن آپریشن کراکے جب قاضی صاحب حیدرآباد آئے اور یہاں سے دہلی جانے لگے تو ایسا لگتا تھا کہ بہت ہشاش بشاش ہیں۔ چہرے سے کسی طرح کی تشویش کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ جب دہلی جانے کے لیے حیدرآباد اسٹیشن پر پہنچے تو بہت سے احباب انھیں رخصت کرنے کے لیے آئے تھے۔ ... صاحب پلیٹ فارم پر کھڑے ان سے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ٹرین ... اور قاضی صاحب بھاگ کر چلتی ٹرین پر سوار ہو گئے۔ بھاگتے ہوئے ... صاحب نے کہا — ارے ڈاکٹر مقبول صاحب! آپ نے مجھے بڈھا سمجھا ہے کیا؟"

کچھ مہینے تک قاضی صاحب کی حالت بہتر رہی اور اس کے بعد حالت بگڑنی شروع ہو گئی۔ کچھ دن بعد بیماری نے زور پکڑا۔ اور قاضی صاحب کو درد کی شکایت رہنے لگی۔ لیکن یہ ان کی عظمت ہے کہ ایسی شدید بیماری کے باوجود وہ لکھنے پڑھنے کے کام میں مصروف رہے۔ اور بقول فاطمہ عالم علی:

"اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ان کے جگر میں درد ہوتا۔ لیکن وہ لکھنا پڑھنا نہ چھوڑتے۔ ان کے ایک ہاتھ میں قلم ہوتا دوسرے ہاتھ سے گرم پانی کی بوتل پیٹ سے لگائے ہوتے۔ چہرے کا رنگ زرد ہوتا۔ پہلو بدلتے جاتے اور لکھتے جاتے۔"

فاطمہ عالم علی نے یہ بھی لکھا ہے:

"سنا ہے کہ انتقال کے دن بھی بارہ بجے تک وہ کام کرتے رہے۔ وفات سے کچھ مہینے پہلے ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ آپریشن ہونا چاہیے۔ لیکن قاضی صاحب ٹالتے رہے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ قاضی صاحب مالی پریشانیوں میں مبتلا تھے۔ ان کے سرپرست اور کرم فرما مولانا ابوالکلام آزاد نے کسی طرح سے یہ اندازہ لگالیا کہ یہ آپریشن صرف اس لیے نہیں کرا رہے کہ ان کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ آزاد صاحب نے قاضی صاحب کو دہلی کے ایک نرسنگ ہوم میں داخل کرادیا اور آپریشن کی ساری ذمہ داری خود قبول کر لی۔"

اس آپریشن کے وقت سے بہت دیر پہلے تک وہ ہنستے بولتے رہے۔ بقول فاطمہ عالم علی:

"وہاں قاضی صاحب کی بڑی لڑکی زہرہ موجود تھیں۔ باپ کی یہ حالت دیکھ کر ان کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ دیکھ کر ہی اندازہ لگایا اور تسلی دینے لگے جیسے واقعی آپا کا آپریشن ہو رہا ہو کہنے لگے "ارے بھئی بالکل معمولی آپریشن ہے ڈاکٹر کہتے ہیں خطرے کی کوئی بات نہیں۔ صرف آدھے گھنٹے کا آپریشن ہوگا۔" ابا اپنی بیماری میں جتنے مضبوط تھے اپنے بچوں کے معاملے میں اتنے ہی بودے اور کمزور۔ بچوں کو انجکشن بھی لگتا تو گھر سے باہر چلے جاتے۔

لیکن اپنے آپریشن کے روز بے حد مطمئن تھے۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اس عمر میں اور اتنے بڑے آپریشن کے لیے اتنا باہمت مریض ہم نے نہیں دیکھا۔ پریشانی سے اکثر نبض اور دل کی حرکت دونوں متاثر ہوتی ہیں لیکن قاضی صاحب کا دل اور نبض دونوں نارمل ہیں۔ جس وقت پہیوں کا پلنگ ان کو لینے آیا تو خود ہی ہنستے ہوئے اٹھے کہنے لگے "لیجئے جناب ہماری سواری آگئی ہم چلتے ہیں اور پلنگ پر لیٹ گئے۔ (یادش بخیر، ص ۱۷)۔

اس آپریشن کے بعد آپا کو کئی دن ہوش نہیں آیا۔ قاضی صاحب کی حالت تھوڑی بہتر ہوئی۔ لیکن آپریشن ناکام رہا۔

۱۷ر جنوری ۱۹۵۶ء کو تقریباً پونے تین بجے قاضی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت ان کی سکونت علی گڑھ میں آفتاب منزل میں تھی۔ رات کو نو بج کر بائیس منٹ پر یونیورسٹی کے قبرستان میں انھیں دفن کیا گیا۔ ۱۸ر جنوری کو انجمن ترقی اردو کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا، جس میں ذاکر صاحب کے علاوہ عبدالمجید خواجہ، حافظ احمد سعید خاں صاحب چھتاری ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر آل احمد سرور اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں شریک تھے۔
اس جلسے میں حسب ذیل تعزیتی قرار داد منظور کی گئی:

"انجمن ترقی اردو (ہند) کے مقامی ممبران کا یہ جلسہ قاضی محمد عبدالغفار، جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) کی اچانک وفات پر اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور ان کی وفات کو انجمن کے لیے خصوصاً اردو زبان وادب کے لیے عموماً ایک بہت بڑا سانحہ سمجھتا ہے۔"

قاضی عبدالغفار

برما چناں گذشت

(قاضی عبدالغفار نے اپنی سوانح عمری لکھنی شروع کی تھی، مگر یہ کتاب ان پانچ صفحات سے آگے نہیں بڑھی ر غ۔ ا)

لائق بنود قطرہ بعمان بردن   خار و خس صحرا بگلستان بردن
اما چہ کنم کہ رسم مورے باشد   پائے ملخ پیش سلیمان بردن
از دست گدائے بے نوا باید ہیچ
جز آنکہ بصدق دل دعائے بکند

زندگانی بیکراں ہے نہ اس کا آغاز معلوم نہ اس کا انجام مگر اس قلزم نا پیدا کنار پہ بہتے ہوئے ایک تنکے کی داستان بھی سارے سمندر کی وسعت سے کچھ کم نہیں، اس وسعت کے متعلق ہم زیادہ سے زیادہ معلوم کر سکتے ہیں وہ صرف ان ہی تنکوں کا تجزیہ کر سکے بس یہ ان اوراق کی ساری حقیقت ہے۔

دوستوں کا اصرار تھا کہ تم "برما چناں گذشت" کے متعلق کچھ لکھو۔ اور میں بضد تھا کہ میں اپنی زندگی کے پس منظر میں کچھ حال روشنی کے ان فسادیوں کا لکھوں جو زندگی کے طوفانی سمندر کے ساحل پہ موجوں میں لپٹی ہوئی کشتیوں کے راہ نما تھے میری زندگی ان ہی کے پرتو سے تابناک تھی۔ اور ان سب کی زندگی کو اس پس منظر سے نکال لیجیے تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا سوائے ایک پرچھائیں کے اسی لیے کہتا ہوں کہ حاشیے کے نقش و نگار میرے نہیں، اور متن ان کا ہے؛ اس تصویر خانہ میں بہت سی تصویریں ہیں۔ ان میں سے کچھ معمولی ہیں اور کچھ شاہکار ہیں، لیکن وہ سب میری زندگی کی ایک ہی زنجیر میں منسلک ہیں اور اس لیے اس

نگار خانہ از بکو بھی ان کے مقام پر دیکھتے جایئے۔ کوئی اندھی ہوئی روشن ہے۔ کسی کا رنگ ماند پڑ گیا ہے کسی کے خدوخال بگڑ گئے ہیں کسی کی رنگ ریزی آج بھی ایسی ہی باقی ہے جیسی کے اس وقت تھی۔ جب مصوّر نے ازل سے اُن پر اپنا کمال صرف کیا تھا۔ مگر سب اپنی اپنی جگہ دلچسپ ہیں اِن اور اُن درافشاریں اس نگار خانہ کی ترتیب اور تزئین کو میں نے خراب نہیں ہونے دیا۔

تقریبًا نصف صدی گذر گئی جب میری عمر ۸ سال کی تھی لوگ اپنی عمر کو اور دنیا کی عمر کو سالوں قرنوں اور صدیوں میں گنتے ہیں۔ جیسے سمندر کے پانی کو صراحیاں بھر بھر کر ناپا جائے یا اہی کے جسم کو رائی کے دانے سے۔ مگر ہماری عمر کا ظرف اتنا تنگ ہے کہ اس میں آدھی صدی بھی انڈیل دیجیے تو وہ چھلکنے کے قریب ہو جاتا ہے!! اگر عہدِ طفلی کے بعد جوانی کی دیوانگی کو بھی خارج از حساب کر دیجیے اور بوڑھاپے کے چند سال الگ کر دیجیے جو ضعف و امراض کے فلسفہ سے پُر ہوتے ہیں تو یہ ہوش و حواس کا زمانہ ۲۵ سال سے زیادہ نہیں ہوتا۔ تجربات کا یہ پھل پکنے سے پہلے کچا ہوتا ہے اور جب پک جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ گلنے سڑنے بھی لگتا ہے دراصل اس کی پختگی کے لمحے جب وہ خامی سے پاک اور اعبار انحطاط سے دور ہوتا ہے شائد چند ہی ہوتے ہیں۔ ورنہ آغاز اور تکمیل اور انجام کے درمیان ایک اتنا باریک خط ہے کہ یہ معلوم ہو ہی نہیں سکتا کہ کب ہم اس خط کو عبور کر چکے۔!!

جس طرح بگڑی ہوئی سینما کی مشین پردے پر مکمل عکس پیش نہیں کر سکتی اسی طرح آغاز کے یہ اندھے نقوش میرے طاقِ نسیاں پر باقی نہیں!! کس قدر عجیب بات ہے کہ پہلی چیز تو مجھے یاد ہے وہ اپنے گھر کے دروازے کا ایک کونہ ہے جس میں والد کے ایک قلم تراش سے میں نے ان کی ہی ایک پنسل بنانے کی کوشش کی اور کلمہ کی انگلی پر اتنا سخت عمل جراحی کیا کہ اس کا نشان آج تک ۵۰ سال بعد بھی باقی ہے۔ ایک چشم زدن میں چاقو کی تیز دھار نے انگلی کا ایک پوروا اس طرح الگ کر دیا کہ ہڈی کھل گئی۔ اور گوشت لٹک گیا اس زمانے میں "راجس" کے چاقو مشہور تھے اور یہ پہلا دلائتی چاقو تھا جس کی دھار کا میں نے اپنی انگلی پر امتحان کیا۔ اس وقت میں نے شاعر کا یہ مصرعہ سنا بھی نہ تھا کہ ؏

انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

مگر شاید یہ کوئی لطیفۂ غیبی تھا کہ ایک سرانگشت فگار سے زندگی کی داستان شروع ہوئی ہے۔!! اس لطیفے کے محض اور بھی بہت سے پہلو ہیں۔ مثلاً اُس زخم کو اپنے کرتے کے دامن میں چھپانے کی کوشش اور پھر کپڑوں کے عنابی ہونے کا اس پہلے زخم کے راز کو افشا کر دینا۔!! اور پھر والد کے اضطراب سے اس حقیقت کا منکشف ہونا کہ واقعہ سخت اور جان عزیز!!

تیز دھار کا یہ پہلا تجربہ زندگی کے سفر میں اکثر یاد آیا!! اُسی زمانے کا دوسرا واقعہ جو اب بہت معنی خیز معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی رائے میں فالِ بد بھی کہہ سکتے ہیں یہ تھا۔ کہ میں نے پہلی مرتبہ انگریزی لباس پہنا اور اس کو پہن کر ایک شدید ٹھوکر بھی کھائی۔ یہ قصہ یوں ہے کہ والد ریاست بھوپال میں ملازم تھے اور وہ کچھ عرصہ کے بعد وطن آرہے تھے میں اپنے پھوپی زاد بھائی کے ساتھ جو ہمارے ہی گھر میں بڑے بھائی کی طرح رہا کرتے تھے اور والد کی غیر موجودگی میں علاقہ کی نگرانی و انتظامات کرتے تھے والد کا خیر مقدم کرنے ریلوے اسٹیشن گیا تھا اس زمانے کی شکرم گاڑی میں ہم اسٹیشن پہونچے اور گاڑی سے اتر کر انگریزی زبان کی چستی و چالاکی کے اس پہلے تجربہ نے اس ۸ سال کے بیوقوف کو چستی و چالاکی کے مظاہرہ پر آمادہ کیا۔ اسٹیشن کے دروازے پر پلیٹ فارم تک ایک ہی دوڑ میں ایک اچھی پٹخنی کھائی۔ اور اس واقعہ کا نشان بھی بہت عرصہ تک دونوں گھٹنوں پر باقی رہا لندن کے بازاروں اور پیرس کے شاندار Boulevards پر جب میں بانڈ اسٹریٹ کے سلے ہوئے لباس میں خراماں خراماں گذرتا تھا تو اکثر ولائتی لباس کے پہننے کا وہ پہلا دن مجھے یاد آتا رہا اُس دن گھٹنے لہو لہان ہو گئے تھے اور اب تہذیب فرہنگ کی شعلہ سامانیوں میں آنکھیں پھوٹ رہی تھیں۔ اُس آغاز نے انجام کو پہونچایا!! اس پہلے دن کے غرور میں جب عمر صرف ۸ سال ہی تھی اور پیرس و لندن کی سڑکوں پہ اس خود بینی کی سنِ بلوغ میں جب عمر تیئس سال سے زیادہ نہ تھی تو نوعیت کا ذرا بھی فرق نہ تھا مقدار کا کچھ فرق ہو تو ہو!

غرض یہ کہ اس عمر میں پہلے ساتھی جس کو میں آج تک محبت بھرے دن یاد کرتا ہوں۔

قاضی واجد علی تھے جو میرے پھوپی زاد بھائی تھے اور ایک ہی گھر میں رہنے کی وجہ سے میں
انھیں اپنا بڑا بھائی سمجھتا تھا۔ اب وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، مگر ان کی سادہ
اور پاکیزہ زندگی کے سب نقوش میرے وجود معنی پر باقی ہیں۔ علاوہ والدین کے اپنے گھر کی
دوسری ہستیاں جو مجھے اب تک یاد ہیں وہ ملازم سمجھتے تھے۔ ایک کا نام علی بخش تھا اور
ایک کا سیتا۔ یہ دونوں والد کے قدیمی ملازم تھے قدیمی ملازموں میں جو اجارہ داری کی ایک
نشانی پیدا ہو جاتی ہے وہ ان دونوں میں موجود تھی۔ علی بخش سرخ داڑھی والا ایک بڈھا تھا
اور سیتا جوان آدمی تھا جس نے لڑکپن ہی سے ہمارے گھر میں پرورش پائی تھی۔ خدا بخش کو
مجھے اسکول پہنچانے اور وہاں سے لانے کی خدمت سپرد تھی اور شاید اپنی ابتدائی عمر میں نہ
تو میں کسی سے اتنا ڈرا اور نہ کسی سے نفرت کی جتنی کہ خدا بخش سے۔ یہ یاد نہیں کہ یہ بڑے میاں
کب رخصت ہوئے اور کہاں گئے مگر اپنی طفلانہ نفسیات پر ان کا دبدبہ مجھے یاد ہے۔
بارہا یہ ارادہ کیا کہ ان کو اپنی شرارتوں کا ہدف بناؤں کبھی تو ان سے انتقام لیا جائے مگر
جہاں تک مجھے یاد ہے ان کی گول اور گھنی داڑھی ان کے اور میری شرارتوں کے درمیان
سدِ سکندری بنی رہی غالباً جب ان کی تصویر میرے عہدِ طفلی کے پردۂ سیمیں سے محو ہوئی
ہوگی تو میں کتنا خوش ہوا ہوں گا۔ مگر وہ خوشی کے لمحے مجھے یاد نہیں۔ والد کے ملازموں میں
جو دوسرا آدمی مجھے یاد ہے وہ سیتا تھا اس کے متعلق سب سے بڑا واقعہ جو مجھے یاد ہے
یہ تھا کہ ایک دن دوپہر کے وقت گرمی کے موسم میں اصطبل کی چھت پر میں پتنگ اڑا رہا تھا
اور یہ مشغلہ بعینہٖ راز جاری تھا وہ اس طرح کہ زنانہ مکان کی چھت سے اصطبل کی چھت ملی
ہوئی تھی۔ اور گرمیوں کے موسم میں دوپہر کے وقت زنانہ مکان کے تہہ خانے میں ہم سب بچے
بند کر دیئے جاتے تھے دعم "میری سوتیلی والدہ"، جنھوں نے میری والدہ کی حیات ہی میں میری
پرورش کی تمام ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی اُسی تہہ خانے میں آرام کیا کرتی تھیں لیکن ظہر کے
وقت وہ باہر جا کر نماز اور تلاوت میں مشغول ہو جاتی تھیں اور یہی وقت وقت ہوتا کہ تہہ
خانے کے عقبی دروازے سے نکل کر ہم اصطبل کی چھت پر اس طرح پہونچ سکتے تھے جس طرح
سبھانس چندر بوس نکل کر برلن پہونچے۔ آسانی یہ تھی کہ تہہ خانے کے اندھیرے میں والدہ ہمارے

بستر کا خالی ہونا معلوم نہ کر سکتی تھیں اور جب تک بچوں کو بیدار کرنے کا وقت آئے ہم کو اصطبل کی کھلی چھت اور جھلسا دینے والی لُو میں دو چار پیچ لڑانے کا موقعہ مل ہی جاتا تھا۔

گرمائی وہ دوپہریں اور جھلسا دینے والی آتشبار ہوائیں اور جاڑوں کی وہ کڑاکے دار سردیاں! یاد نہیں مگر اب میسّر نہیں آتیں۔ زندگی کے سارے موسم بدل گئے اور اس طرح بدل گئے کہ نہ اب سردی کی شدّت کا وہ کیف ہے اور نہ گرمی کے قہر کا وہ لطف!

آبا کی سوتیلی والدہ جنھوں نے آبا اور ان کے بھائی بہنوں کی پرورش کی قاضی ابرار احمد کی پہلی بیوی اور سسر محمد یعقوب کی خالہ تھیں ان کی ایک لڑکی تھی جو جوانی ہی میں بجلی کی پیدائش کے دوران چل بسیں۔ بیٹی کے انتقال کے بعد اپنے شوہر قاضی ابرار احمد کے لیے اپنی سسرال کی ایک لڑکی پسند کر کے نکاح کر دیا جن کے بطن سے آبا اور ان کے بھائی بہن ہیں۔ اپنی سوتیلی والدہ کو بڑی اماں کہتے تھے۔ ہمارے دادا نے پھر بڑھاپے میں دو نکاح کیے جو محض جاگیردارانہ ماحول اور ذہنیت کی دین سمجھنا چاہیے۔

فاطمہ عالم علی

ابّا کی باتیں

اگر یہ کہوں کہ اپنے والد کے بارے میں بہت کم جانتی ہوں تو شاید کسی کو یقین نہ آئے گا اور انکساری سمجھ کر یہ توقع کریں گے کہ دیکھیے بیٹی کے قلم سے صحافی اور ادیب باپ کی زندگی کے کون کون سے گوشوں سے پردہ اٹھتا ہے۔ اس سے پہلے کہ آپ کی توقعات کو ٹھیس پہونچے میں اس خوش فہمی کو دور کرنے کے لیے چند واقعات کا اظہار ضروری سمجھتی ہوں میں صرف دس دن کی تھی کہ میری والدہ کا انتقال ہوگیا میرے ماموں سر یعقوب لاولد تھے انھوں نے مجھے گود لے لیا۔ ۱۹۲۹ء میں ابّا نے دوسری شادی کرلی ۱۹۳۰ء جنوری میں میری بڑی بہن زہرہ جو مجھ سے تقریباً بارہ تیرہ سال بڑی تھیں سندیلے کے چودھری محمد سلطان سے بیاہ دی گئیں اور ابّا نے مراد آباد کو خیرباد کہا۔ دلّی اور گوالیار میں کچھ دن گذارنے کے بعد ۱۹۳۲ء میں مستقل حیدرآباد میں سکونت اختیار کرلی۔ میں لکھنؤ کے "کرامت حسین کالج" جو اُس وقت "مسلم گرلز ہائی اسکول" کہلاتا تھا اس کے بورڈنگ میں داخل کردی گئی۔ میرے بہنوئی چودھری سلطان لکھنؤ یونیورسٹی میں لیکچرر تھے اس لیے چھٹیوں میں آپا کے یہاں آجایا کرتی تھی ایسی ہی ایک چھٹی پر آئی تھی گول کمرے میں ریڈیو سے لگی بیٹھی تھی کہ چلمن سے دیکھا ایک صاحب معہ سامان تانگے سے اُتر کر برآمدے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ میں تقریباً دوڑتی ہوئی آپا کے پاس پہونچی اور کہا "ایک صاحب آئے ہیں بالکل آپ کے ابّا جیسے ہیں" "ابّا کا نام سنتے ہی آپا بے قرار ہوکر چلمن تک پہونچیں ایک نظر اُدھر ڈالی اور غصّے سے میری طرف پلٹ کر بولیں "چڑیل تو ابّا کو بھی نہیں پہچانتی" یعنی وہ صاحب ابّا ہی تھے۔!

آپا ہر سال گرمیوں میں حیدرآباد جایا کرتی تھیں اس حادثے کے بعد ماموں میاں کی اجازت سے کبھی کبھی میں بھی ان کے ساتھ جانے لگی کہ کم از کم باپ کی صورت تو پہچان سکوں۔!! جب میں وہاں جاتی تو آبا بڑی خاطرداری اور دلداری کیا کرتے تھے جیسے ان کا جی چاہتا ہو کہ میں ان کے پاس ہی رہوں۔ طرح طرح کے کھیل کھیلتے، کھلونے لاکر دیتے۔ رات کو اپنے پاس لٹاکر کہانیاں سناتے پھر میرے لیے خود بھی ایک کہانی لکھنا شروع کی نام تھا "ہٹمنو پٹمنو بغلولو خاں" کہانی یاد نہیں رہی البتہ یہ عجیب وغریب نام یاد رہ گیا۔

پھر میری زندگی کا وہ منحوس دن آیا جس کے لیے میں بالکل تیار نہ تھی یعنی ۲۲ر نومبر ۱۹۴۲ء کو ماموں میاں کا اچانک انتقال ہوگیا اس سانحہ کے بعد میری زندگی یکسر بدل گئی اور "پھر آگئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم" کے مصداق قاضی صاحب کے گھر دوبارہ جنم لینا پڑا اور یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ "ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اس کا ناؤں" اب جو کچھ میں لکھوں ان ہی واقعات کی روشنی میں دیکھیے۔

جس وقت میں آبا کے پاس آئی ہوں اخبار "پیام" تمام مخالفتوں اور رقابتوں کے تھپیڑے سہنے کے بعد ترقی کی راہ پر گامزن تھا اور آبا اس کو خوب سے خوب تر کی طرف لے جانے میں منہمک! ان دنوں کا ذکر ایک مضمون "آبا کے ساتھ گذرے ہوئے چند لمحے" میں کر چکی ہوں جو میرے مضامین کے مجموعہ "یادش بخیر" میں شامل ہے۔ میرا خیال تھا اور ہے کہ جو کچھ لکھ چکی اس کے بعد کچھ اور لکھنے کی میرے پاس گنجائش نہیں ہے۔ ادھر چند سالوں سے کچھ ایسے طلباء کے خطوط وصول ہوئے جو قاضی صاحب پر یا تو مقالہ لکھ رہے ہیں یا تحقیق کر رہے ہیں یہ طلبا قاضی صاحب کی نجی زندگی کے بارے میں سوال نامے بنا کر بھیج رہے ہیں یقین مانئے ان خطوط سے جتنی خوشی ہوتی ہے اُس سے زیادہ اپنی نالائقی پر شرمندگی کا احساس تکلیف دہ بن جاتا ہے شاید "چراغ تلے اندھیرا" ہم جیسوں ہی کے لیے کہا جاتا ہوگا۔ ان طالب علموں کو تو بہلا پھسلا کر کام چلا لیا لیکن ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی راج ہٹ خدا کی پناہ۔! مجبوراً اپنی یادوں کو جھاڑا جھٹکا کچھ سنے سنائے واقعات کو سمیٹا اور کچھ قاضی صاحب کے پرانے کاغذات کی تلاشی لی اگر کہیں قاضی صاحب کے سامنے کاغذات کو ہاتھ لگا دیتی تو شامت ہی آجاتی بہرحال کچھ

آنکھوں دیکھا حال بھی شامل کر لیا تو ایک مضمون کی شکل نکل آئی اب اگر قاضی صاحب کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہو تو انھیں کا روحانی فیض سمجھیے ورنہ ڈاکٹر گوڑ تو موجود ہی ہیں۔! مضمون شروع کرنے سے پہلے یہ بتاتی چلوں کہ قلم سے میرے تعلقات بس یوں ہی سے ہیں گذارش ہے کہ اس کو ادبی سانچوں میں فٹ کرنے کی کوشش نہ کیجیے گا ورنہ کوفت ہو گی۔!

قاضی صاحب مرادآباد کے ایک خوشحال گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ کہتے ہیں ان کے آباؤ اجداد عربی النسل تھے اور دورِ مغلیہ میں محکمۂ قضات کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے ۱۸۵۷ء کے غدر کی افراتفری میں ایک شہزادے کو پناہ دینے کی پاداش میں قاضی صاحب کے دادا قاضی حامد علی کو سولی دی گئی اور جائداد ضبط کر کے خاندان کو بے خانماں کر دیا گیا کچھ عرصے بعد عدالت نے ان کو بے قصور ثابت کیا ظاہر ہے جان تو واپس نہ آسکی البتہ جائداد و مکانات واپس مل گئے اس واقعہ کی تفصیل بھی اپنے اس اکلوتے مضمون میں من و عن بیان کر دی ہے جو آبا کی زبانی سنی تھی قاضی صاحب دسمبر ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے پورا نام محمد عبدالغفار تھا گھر میں پیارے میاں کہلاتے تھے بہت عرصے تک "خاموش" کے قلمی نام سے رسالوں اور اخباروں میں لکھتے رہے صحافت میں قدم رکھا تو اپنے اصلی نام سے مشہور ہوئے کبھی کبھی اختصار کی خاطر ع غ بھی لکھ دیا کرتے تھے۔

قاضی صاحب کے والد قاضی ابرار احمد کو انگریز سرکار سے خان بہادر کا خطاب عطا ہوا تھا اور پنشن بھی۔ اپنے دادا کے کچھ خطوط جو انگریز کلکٹروں اور کمشنروں نے انھیں لکھے تھے میری نظر سے گذرے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی ابرار احمد انگریزوں میں کافی مقبول اور ان کی سرکار میں خاصا دخل رکھتے تھے۔ ایک طرف خان بہادر ابرار احمد کی انگریز سرکار سے وفاداریاں اور دوسری طرف قاضی عبدالغفار کا انگریز سرکار کے ساتھ حقارت آمیز رویہ۔! ایک ہی چھت کے نیچے دو متضاد مزاجوں کا یہ ٹکراؤ سمجھنا ذرا مشکل ہے۔!

قاضی صاحب نے اپنے حالات زندگی "برما چناں گذشت" کے نام سے لکھنا شروع کیے تھے معلوم نہیں کیوں ادھورا چھوڑ دیا یہ یادداشت اگر مکمل ہو جاتی تو شاید اس دور کی ایک دستاویز ہاتھ آجاتی پھر بھی انگریز دشمنی کی کچھ جھلکیاں تو اس میں ضرور دکھائی دیتی

ہیں ۔ لکھتے ہیں کس قدر عجیب بات ہے کہ پہلی چیز جو مجھے یاد ہے وہ اپنے گھر کے دروازے کا وہ کونہ ہے جس میں والد کے قلم تراش سے میں نے اُن ہی کی ایک پنسل بنانے کی کوشش کی اور کلمہ کی انگلی پر اتنا سخت عمل جراحی کیا کہ اس کا نشان آج پچاس برس بعد بھی باقی ہے ایک چشم زدن میں چاقو کی تیز دھار نے انگلی کا پورا اس طرح الگ کر دیا کہ ہڈی کھل گئی اور گوشت لٹک گیا ا" راجس" کے چاقو مشہور تھے اور یہ پہلا ولایتی چاقو تھا جس کی دھار کا میں نے اپنی انگلی پر امتحان کیا ۔ اس وقت تک میں نے شاعر کا یہ مصرعہ سنا بھی نہ تھا کہ

انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

مگر شاید یہ بھی کوئی لطیفہ غیبی تھا کہ ایک سرانگشت فگار سے میری زندگی کی داستان شروع ہوتی ہے "گویا انگلی کے زخمی ہونے میں قاضی صاحب کی شرارت کو کوئی دخل نہیں تھا بلکہ انگریزوں ہی کی شرارت کا ہاتھ تھا ۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی آگے کہتے ہیں "تیز دھار کا یہ پہلا تجربہ زندگی کے سفر میں اکثر یاد آیا اسی زمانے کا دوسرا واقعہ جو اب بہت معنی خیز معلوم ہوتا ہے ۔ کیا آپ کی رائے میں اس کو فال بد بھی کہہ سکتے ہیں ۔ ؟ یہ تھا کہ میں نے پہلی دفعہ انگریزی لباس پہنا اور اس کو پہن کر ایک شدید ٹھوکر کھائی تھی ! یہ قصہ یوں ہے کہ والد ریاست بھوپال میں ملازم تھے اور وہ کچھ عرصے کے بعد وطن واپس آ رہے تھے میں اپنے پھوپی زاد بھائی کے ساتھ جو ہمارے گھر ہی میں بڑے بھائی کی طرح رہا کرتے تھے اور والد کی غیر موجودگی میں علاقے کی نگرانی کرتے تھے ۔ والد کا خیر مقدم کرنے ریلوے اسٹیشن گیا تھا ۔ اس زمانے کی شکرم گاڑی میں ہم اسٹیشن پہونچے اور گاڑی سے اتر کر انگریزی زبان کی چستی و چالاکی کے اس پہلے تجربے نے اس ۸ سال کے بے وقوف کو چستی و چالاکی کے مظاہرے پر آمادہ کیا ۔ اسٹیشن کے دروازے سے پلیٹ فارم تک ایک ہی دوڑ میں ایک اچھی پٹخنی کھائی اور اس واقعہ کا نشان بھی بہت عرصہ تک دونوں گھٹنوں تک باقی رہا ۔ لندن کے بازاروں اور پیرس کے شاندار (BOULEVARDS) پر جب بانڈ اسٹریٹ کے سلے ہوئے لباس میں خراماں خراماں گذرتا تھا تو اکثر ولایتی لباس کے پہننے کا وہ پہلا دن مجھے یاد آتا رہا اس دن گھٹنے لوٹے تھے اور اب تہذیب فرنگ کی شعلہ سامانیوں میں آنکھیں پھوٹ رہی تھیں !! اس آغاز نے اس انجام تک پہونچایا ۔ !!" انگریزی لباس معلوم نہیں آبا نے کب تک پہنا کیونکہ

میں نے انھیں ہمیشہ شیروانی میں دیکھا۔ راجوں، نوابوں اور تعلق داروں کا ایک بڑا طبقہ انگریز سرکار کا دعا گو تھا غالباً یہی وجہ رہی ہوگی کہ اس طبقے کی طرزِ زندگی کو احمقوں کی دنیا سے تعبیر کرتے تھے ان کو ہمیشہ اس طبقہ سے بیزار دیکھا۔

مذہب اور عقائد کے معاملے میں غالب کا یہ مصرعہ ان پر صادق آتا ہے کہ "ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم" ان کے مزاج کے اس پہلو کے مظاہر بارہا دیکھنے میں آئے۔ ایک واقعہ یاد آرہا ہے میرا خیال ہے ان کی افتادِ طبع کو سمجھنے کے لیے کافی ہوگا، ہوا یوں کہ گرمیوں کے دن تھے آبا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی صحن میں پلنگ پر لیٹے تھے کہ ایک مولانا تشریف لائے ادھر ادھر کی دو چار رسمی باتوں کے بعد آبا نے بات چھیڑی "میں نے سنا ہے مولانا! آپ نے کسی کمسن لڑکی سے شادی رچالی آپ کو یہ کیا سوجھی؟" مولانا کچھ سٹپٹائے پھر نہایت گاڑھی آواز میں فرمایا "کیا بتاؤں قاضی صاحب مجھے حکم ہوا" آبا نے دریافت کیا "کیا وحی نازل ہوئی تھی؟" کہنے لگے "جی نہیں قاضی صاحب اصل میں بشارت ہوئی اور رسول اللہؐ نے فرمایا یتیم لڑکی ہے اس کے سر پر ہاتھ رکھو" آبا نے بہت سلجھے ہوئے انداز میں کہا "مولانا آپ خود قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ بجائے اس کے کہ اس کو دوبارہ یتیمی کا منہ دیکھنا پڑے آپ نے اس کے لیے کوئی ہونہار لڑکا دیکھ کر نکاح کر دیا ہوتا" مولانا نے پھر صفائی پیش کرنے کی کوشش کی "دراصل اس کو نکاح میں لینے کا حکم ہوا تھا" ابھی مولانا کا جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ باوجود نقاہت کے آبا اٹھ کر بیٹھ گئے اور دانت پیس کر بولے "خدا کی قسم مولانا وہ میرے رسول اللہؐ نہیں ہو سکتے" مولانا بدحواس ہو کر دروازے سے ایسے نکلے کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ ایسے لوگوں کو آبا ضمیر فروش کہا کرتے تھے۔

آبا نے بڑی معروف زندگی گذاری بچپن میں شرارتوں کی مصروفیت رہی اپنے والد کے ایک قدیم ملازم خدا بخش کا حال انھیں کی زبانی سنیے "خدا بخش کو مجھے اسکول پہونچانے اور وہاں سے واپس لانے کی خدمت سپرد تھی اور شاید اپنی ابتدائی عمر میں نہ تو میں کسی سے اتنا ڈرا اور کسی سے میں نے نفرت کی جتنی کہ خدا بخش سے! یہ یاد نہیں کہ وہ بڑے میاں کب رخصت ہوئے اور کہاں گئے مگر اپنی طفلانہ نفسیات پر ان کا دبدبہ مجھے یاد ہے۔ بارہا ارادہ کیا کہ ان کو اپنی شرارتوں کا ہدف بناؤں کبھی تو ان سے انتقام لیا جائے۔ مگر جہاں تک مجھے یاد ہے ان کی گول اور گھنی داڑھی

ان کے اور میری شرارتوں کے درمیان حدِ سکندری بنی رہی غالباً جب ان کی تصویر میرے عہد طفلی کے پردۂ سیمیں سے محو ہوئی ہوگی تو میں کتنا خوش ہوا ہوں گا مگر وہ خوشی کے لمحے مجھے یاد نہیں"

جنوری ۱۹۰۲ء میں ابا نے مڈل انگلش امتحان پاس کیا اس وقت ان کی عمر ۱۲ سال اور ۱۱ مہینے تھی اس حساب سے سن پیدائش ۱۸۸۹ء ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ابا علیگڈھ کب پہونچے لیکن M.A.O کالج علیگڈھ کے پرنسپل W A Archbcal کا ایک خط ابا کے والد کے نام انگلش میں لکھا ہوا ملا اس پر تاریخ ۲۹ اکتوبر ۱۹۰۶ء پڑی ہوئی ہے۔ پرنسپل نے شکایت کی ہے کہ آپ کا لڑکا الگ گھر لے کر رہنا چاہتا ہے لیکن وہ ابھی بہت کم عمر ہے اس لیے میں اجازت نہیں دے سکتا آپ اس کو سمجھائیے کہ بیوقوفی سے باز آئے وغیرہ وغیرہ۔ گویا شرارت کی دوسری قسم ہے۔ اتنا تو معلوم ہوا کہ ۱۹۰۶ء تک وہ علیگڈھ میں تھے۔

ابا کو جتنا پڑھنے کا شوق تھا اتنا ہی ضد کرنے اور لڑنے کا بھی! بچپن میں میری کسی سے لڑائی ہو جاتی تو ماموں میاں کہا کرتے تھے "پیارے میاں کی طرح ہر وقت لڑنے پر آمادہ رہتی ہے" مطلب یہ کہ ان کے مزاج کے اس رنگ سے سب ہی واقف تھے ہو سکتا ہے کہ خدا بخش کی کھسی داڑھی کا ردِ عمل ہو۔!! لیکن حقیقت بھی یہی ہے کبھی اپنے ہی گھر کے جاگیردارانہ ماحول سے ٹکراتے رہے اور گھر کے باہر انگریزوں کے خلاف لڑی جانے والی لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور کبھی اصولوں کے لیے کمربستہ ہو گئے۔

قاضی صاحب اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے کہتے ہیں ایک مرتبہ مرادآباد میں شدید طاعون پھیلا محلّے کے محلّے صاف ہو گئے ان کا محلّہ تمباکو والا بھی اس کی لپیٹ میں آگیا اور ایک ہفتہ میں قاضی صاحب کے سات افرادِ خاندان لقمۂ اجل ہو گئے ان افراد میں ابا کے بھائی بہن اور والدہ شامل تھیں حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ سوا مہینے کے بھائی اور ۲ سال کی بہن بچ گئے جب کہ ان سے بڑے ہنستے کھیلتے بھائی بہن چل بسے۔ ابا کے دو سوتیلے بھائی بھی تھے جو میری بہن سے بھی چھوٹے تھے یہ ننھے منے، کہلاتے تھے میں اپنی ننہال میں رہنے کی وجہ سے ان دونوں سے زیادہ واقف نہیں معلوم نہیں اب کہاں ہیں! میں نے اپنے چچا قاضی حمید اسا

اور پھوپی خدیجہ کو دیکھا ہے چچا کا انتقال ابا کے سامنے ہی ہوا ان کے بچے پاکستان میں ہیں پھوپی زندہ ہیں ان کی شادی ماموں میاں کے پھوپی زاد بھائی سے ہوئی تھی اب کئی سال سے وہ بھی پاکستان میں ہیں۔

ابا اپنی سوچ و فکر میں اپنے زمانے سے بہت آگے تھے۔ جہاں ذرا ذرا سے فرق کے ساتھ سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوں ابا کی باتیں سمجھ میں آنا ان کے لیے مشکل ہی تھا۔ ابا کا تعلق زمیندار گھرانے سے تھا جہاں دوسروں کی محنت پر عیش و عشرت کا دار و مدار تھا یہ رویہ ان کے مزاج کے خلاف تھا اسی لیے خود کو علم روزگار سے کبھی آزاد نہ کر سکے۔ اپنے والد کی سفارش اور اصرار پر ایک مرتبہ ملازمت بھی کی بسا بقہ ایک انگریز افسر سے پڑا اس نے وہی طریقہ اپنا اختیار کیا جو اس ... ہندوستانیوں کے ساتھ ہوا کرتا تھا ایک دن طیش میں آکر ... دی اور استعفا دے کر آرام سے گھر آ گئے۔ پھر تجارت کا شوق ہوا جو ان کے مزاج سے قطعی میل نہ کھاتا ... ہے۔ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار شروع کیا پیرس میں دوکان ... نام رکھا The oriental Emporium ۱۹۲۶ تک یہ شوق جاری رہا پیرس سے اور ... گھر آنکھوں بن گئے آخرہ رسول سو کے ہزار کرکے واپس آ گئے۔ اسی دوران میری والدہ کا ... کیا جس نے ان کے دل و دماغ کو ماؤف کر دیا۔ ان کے پاس دکھ کا اندازہ اس ڈائری ... ہوتا ہے جو میری والدہ کے انتقال کے دن سے شروع ہوئی ہے۔ پھر حکیم اجمل خاں کی موت ... پر تیل کا کام کیا حالت ابتر ہو گئی دوست احباب نے ان کو دوسری شادی کے لیے راضی ... را چھا ہی کیا سوتیلی والدہ سے جب مجھے واسطہ پڑا تو ان کو بہت ہمدرد اور خدا ترس ... ابا کی جو خدمت انھوں نے کی اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ان کی اولاد نہیں تھی میری بڑی ... کے چھوٹے لڑکے طارق کو پانچ ماہ کا گود لیا اور اولاد کی طرح پرورش کی یہاں میں آپا ... ن محبت اور چاہت کی قائل ہو گئی جو انھیں ابا سے تھی۔ باپ کی دلبستگی کی خاطر اپنے دل کا

... چچا سے سمینار کے افتتاحیہ جلسے میں غالباً پچاس سال بعد ملاقات ہوئی۔

... کتابیں پڑھنا ہے خاص طور پر تاریخی کتابیں جس کی وجہ سے انکی معلومات بہت وسیع ہیں۔

(فاطمہ عالم علی)

ٹکڑا انکال کرسوتیلی ماں کے حوالے کر دیا آپا کے ماشاء اللہ چار بچے ہیں سب سے بڑی ثریا جو نانا کی بہت چہیتی تھیں پھر خالد، نجمہ اور طارق ۔

کہنے کو تو ابا کے یہاں بھی سات اولادیں ہوئیں یعنی چار لڑکے اور تین لڑکیاں لیکن زندگی ہم دو کو نصیب ہوئی زہرہ آپا سب سے بڑی تھیں جو ابا کے انتقال کے چار سال بعد ۱۹۶۰ء میں دنیا سے رخصت ہو گئیں ان کے بعد چار لڑکے اور ایک لڑکی اور آخیر میں فاطمہ یعنی ناچیز بیٹیوں کا سکھ والدین کے نصیب میں نہ تھا چاروں لڑکے معذور پیدا ہوئے ڈاکٹروں کی تشخیص تھی کہ ان بچوں کی ریڑھ کی ہڈی میں وہ مغز نہیں تھا جس کی مدد سے اعضاء پر قابو پایا جاتا ہے تین بھائی دو دو سال کی عمر میں چلے گئے لیکن منجھلے بھائی ارشاد کو میں نے دیکھا ہے ۔ یہ ۲۲ سال زندہ رہے لمبا قد رنگ گورا کھڑی ناک نقشہ کوئی اجنبی دیکھ کر سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ جوان لڑکا جو پلنگ پر لیٹا ہے وہ معذور ہے ۔ ان کی کیفیت ایک تین ماہ کے بچے جیسی تھی نہ گردن ٹھیری تھی نہ ہاتھ پیر پر اختیار تھا آوازنکالتے تھے لیکن زبان نہ پلٹتی تھی عجیب بات تو یہ تھی کہ گھر والوں کو پہچانتے تھے تکلیف میں روتے اور خوشی میں قہقہے لگاتے ۔ ابا کے حیدرآباد چلے جانے کے بعد وہ بھی ماموں میاں کے پاس آ گئے تھے آپا جب لکھنؤ سے ہمارے یہاں مرادآباد آتیں اور ارشاد بھائی کو بتایا جاتا تو ہنسی سے بے حال ہو جاتے اور جب ان کی واپسی کا وقت آتا تو اتنا روتے کہ ہچکی بندھ جاتی آپا لاکھ بہانے بناتیں کہ فلاں خالہ کے یہاں جارہی ہیں لیکن وہ سمجھ جاتے کہ آپا لکھنؤ واپس جارہی ہیں ۔ ابا نے بہت چاہا کہ ارشاد بھائی کو حیدرآباد بلالیں لیکن جب بھی ماموں میاں نے ان سے کہا کہ ابا تمھیں بلارہے ہیں تو زار و قطار روئے جس کا مطلب یہی لیا گیا کہ ارشاد بھائی جانا نہیں چاہتے غرض ۲۲ سال کی عمر میں ۱۹۴۱ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ ان کی موت کا واقعہ خود ایک الگ عنوان چاہتا ہے آپا کہا کرتی تھیں کہ ہماری والدہ کو کوئی بیٹے کی دعا دیتا تو کانوں پر ہاتھ رکھ لیتیں کہ خدا کے لیے مجھے بیٹے کی دعا نہ دو ۔ کس قدر بے حقیقت ہے یہ زندگی اور کتنی بے معنیٰ ہے لیکن پھر بھی زندگی کے بارے میں دیکھئے ابا اپنی سوانح میں کیا کہتے ہیں " زندگی بیکراں ہے نہ اس کا آغاز معلوم نہ انجام ۔ امگر اس قلزم ناپیداکنار پر بہتے ہوئے ایک تنکے کی داستان بھی سارے سمندر کی وسعت سے کچھ کم نہیں " یعنی زندگی کی داستان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا !

مراد آباد شہر کی حد تک مجھے گیارہ سال کی عمر سے برقعہ پہنایا گیا لیکن جس دن میں نے ابا کے گھر میں قدم رکھا پہلا کام یہ کیا کہ میرا برقعہ اٹھا کر پھینک دیا جب کہ حیدرآباد کا وہ زمانہ سخت گوشے پردے کا تھا۔ ابا کے یہاں عورت دیوی کا درجہ رکھتی ہے عورت کی سرلغزش کی ذمہ داری وہ مرد پر ڈالتے ہیں یہاں ایک چھوٹا سا واقعہ سنا دوں تو بے محل نہ ہوگا۔" ہمارے مالی کا یہ دستور تھا کہ خوب پی کر آتا اور مالن کی پٹائی کرتا بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس پر اثر نہ ہوا آخر ایک رات صبر کا پیمانہ چھلک گیا شاگرد پیشے سے ہنگامے کی آوازیں تیز اٹھنے لگیں تو ابا بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور منی آپا (میری سوتیلی والدہ) سے بولے "آج میں مالن کے ہاتھ سے مالی کو پٹوائے بغیر نہیں چھوڑوں گا" دونوں کو بلوایا اور مالن کے ہاتھ میں چپل تھما کر بولے" اب لگا اس کے دو چار چپل اس کو بھی تو معلوم ہو کہ چوٹ کھانے والے پر کیا گذرتی ہے!" غریب مالن رونا دھونا بھول کر ابا کا منہ تکنے لگی جیسے سوچ رہی ہو کہ سرکار آج کیسی باتیں کر رہے ہیں !!

ابا کو اپنے بیوی بچوں میں گھر رہنا بہت اچھا لگتا تھا ان کی چھوٹی چھوٹی مسرتوں اور دلچسپیوں میں حصہ لیتے۔ آپا سنایا کرتی تھیں کہ آپا جان (ہماری والدہ) کی زندگی میں ابا کا فرصت کا وقت گھر کے اندر گذرتا تھا آپا جان کے دوپٹے رنگتے چنتے اور بڑے چاؤ سے لچکا ٹانکتے بیوی کے ہاتھوں میں مہندی لگاتے چوڑیوں کا انتخاب کرتے ہمارا مختصر سا خاندان پیار و محبت میں مثالی حیثیت رکھتا تھا" اسی قسم کی زندگی میں نے حیدرآباد میں بھی دیکھی دوپٹے رنگتے اور مہندی لگاتے تو نہیں دیکھا لیکن بیوی بچوں کے درمیان ہوتے تو طبیعت میں چہل پیدا ہو جاتی جس دن اخبار کی تعطیل ہوتی ایک دن پہلے سے پروگرام بننا شروع ہوتے جس میں پکنک اور سینما بھی شامل ہوتا۔ ابا کی سسرال ابھی تعلق دارانہ رنگ میں رنگی ہوئی تھی اس لیے وہاں گھر سے باہر تفریح کرنے کا سوال ہی نہ تھا اس لیے جب آپا مع بچوں کے حیدرآباد آتیں تو ان کو اتنی تفریح کراتے کہ سال بھر کی کسر پوری ہو جاتی۔ میں بھی ابا کے ساتھ یوں رہتی جیسے ہم عمر دوست ہوں لکھوں تو کوئی یقین نہ کرے۔ رمضان میں سحری کو اٹھتی تو میرے ساتھ اٹھتے ایک دن میں نے کہا سحری کو تو آپ اٹھ ہی جاتے ہیں کیوں نہ آپ کی روزہ رکھائی کی جائے فوراً راضی ہو گئے اور میں نے ان کو روزہ رکھوا دیا اور ان کے دوستوں کو باقاعدہ یہ کہہ کر دعوت دیدی کہ آج میرے ابا کی روزہ رکھائی ہے آپ سب ان کے ساتھ

افطار اور کھانے میں حصہ لگایئے سب آئے اور بڑے ٹھاٹ کے ساتھ افطار اور کھانا ہوا کیسے پیارے دن تھے اکثر رمضان میں مجھے وہ دن یاد آتا ہے۔

ابا کو اگر تندرست اور شگفتہ دیکھنا ہو تو نوجوانوں کے حلقہ میں بٹھا دیجئے ترقی پسندانہ رجحان کے حامل نوجوان قاضی صاحب کے گرویدہ تھے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ "دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی"، میں جب ان کے پاس آئی ہوں ان کی عمر ۵۶، ۵۷ سال رہی ہوگی لیکن صحت زیادہ اچھی نہیں دمہ کے پرانے مریض تھے اب جگر میں بھی تکلیف رہنے لگی تھی اکثر بخار رہو جاتا اور ایسے میں منچلے نوجوانوں کے آنے کی اطلاع ملتی تو لیجیئے کہاں کی بیماری اور کیسا بخار فوراً کمرے میں بلا لیتے منی آپا بار بار یاد دلاتیں کہ آپ کو بخار ہے لیٹے رہیئے۔ بڑی ادا سے مسکرا کر کہتے "اجی بیگم صاحب دیکھتی جایئے ابھی بخار بھاگا جاتا ہے"۔ مضمون ختم کرنے سے پہلے آیئے ایسی ہی ایک شام آپ بھی دیکھ لیجیئے۔ یقین کرنا مشکل ہوگا کہ بخار کی حالت میں ابا کے اندر بیٹھا ہوا ادیب پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا تھا ہر جملہ اپنی جگہ ترشا ہوا اور لاجواب! اردو اور فارسی کے اشعار کا ایک خزانہ ہوتا جس کو وہ دل کھول کر لٹاتے رہتے اس کیفیت میں یہ دیکھیئے ابا نوجوان شعراء میں گھر سے پلنگ پر بیٹھے ہیں، منہ میں پان کا بیڑا دبائے شاہد صدیقی، ہونٹوں میں سگریٹ کو سنبھالے مخدوم محی الدین بالوں کی لمبی لٹوں سے آدھے چہرے کو چھپائے سلیمان اریب (یہ سب سے کم عمر تھے) کبھی کبھی کنول پرشاد کنول اور سکندر علی وجد بھی شریک محفل رہتے ان سب ہی کا ترنم مانا ہوا، شعر پڑھے جا رہے ہیں ساری فضا شعر میں ڈھل گئی ہے ابا جی کھول کر داد دے رہے ہیں اگر اتفاق سے سردار جعفری اور کیفی اعظمی پہونچ جاتے تو یہ رنگین شام مشاعرے کا روپ دھار لیتی آدھی رات تک محفل گرم رہتی لیکن ابا کا بخار دیکھا جاتا تو پارہ نارمل بتاتا۔ جی چاہتا کبھی اس شام کی صبح نہ ہو لیکن ہر صبح کے بعد شام اور ہر شام کے بعد صبح مقدر ہو چکی ہے صبح و شام اب بھی وہی ہیں لیکن آج نہ ابا ہیں نہ شاہد و مخدوم اور نہ ہی وجد اور اریب پھر بھی زندگی کا سفر جاری ہے اور یہ یادیں تو ہیں جو سفر کی صعوبتوں کا مقابلہ کرنے کے لیئے تازیانے کا کام کرتی ہیں لیکن سچ پوچھیئے تو۔

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

حمیدہ سلطان

قاضی عبدالغفار — کچھ یادیں

میں نے ان سنہرے دنوں کی یاد کو ماضی کے دھندلکے سے نکالا جب ہندوستان کو آزادی ملے ہوئے تیسرا سال شروع ہو گیا تھا۔

تین مورتی ہاؤس میں پنڈت نہرو براجمان تھے، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد وزارت تعلیم کی رہنمائی کو عزت بخش رہے تھے۔

ملک چین کی بنسی بجا رہا تھا، لیکن دلّی کی ادبی فضا پر ابھی جمود طاری تھا، کیونکہ وہ دلّی والے ادیب، شاعر یہاں سے جا چکے تھے جن پر دلّی کو ناز تھا اور جن کی ذات ادب کی آبرو تھی نہ یہاں ملّا واحدی رہے تھے نہ پروفیسر محمد سعید، خواجہ شفیع کی اردو مجلس باقی تھی نہ مشتاق احمد زاہدی کی ادبی نشستیں، انجمن ترقی اردو کا بھی شیرازہ بکھر چکا تھا۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق پاکستان سدھار گئے تھے، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اپنے قیمتی کتب خانے کے لٹ جانے پر شکستہ علی پور روڈ میں بیٹھے آہیں بھر رہے تھے۔ انجمن ترقی اردو کو ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی دارالسلام سے مولانا آزاد نے بہت کوشش کر کے واگزار کروایا تھا اور کچھ دن بعد علی گڑھ سلطان جہاں منزل میں منتقل کر دیا تھا۔

اس افراتفری کے عالم میں مولانا صاحب نے قاضی عبدالغفار کو حیدرآباد سے بلا کر انجمن کا کام سونپا اور وہ دل و جان سے اس کی حالت سدھارنے میں لگ گئے۔

یوں تو دلّی کے کوچہ و بازار بارونق ہو گئے تھے، پنڈت نہرو کی دن رات کی لگن رفیع احمد قدوائی اور مولانا آزاد کی بدولت مسلمان بھی اب سکون سے بیٹھے تھے، لیکن دلّی کی ادبی زندگی

نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی میں نے اِس سنسان فضا سے گھبرا کر علامہ کیفی اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ، منشی عبدالقدیر کی مدد سے ہارڈنگ لائبریری میں اردو مجلس قائم کی، اس کی نشستوں میں یہاں کے بچے کھچے ادیب اور شاعر شریک ہونے لگے۔ ان میں ڈاکٹر محمد اشرف، عتیق صدیقی، مرزا محمود بیگ ڈاکٹر عابد حسین، خواجہ احمد فاروقی، صالحہ بیگم انیس قدوائی، محمودؔ دہلوی، طالبؔ دہلوی، عمارؔ دہلوی، خنداںؔ دہلوی، منور لکھنوی، واقفؔ امروہوی، شمیمؔ کرہانی، فرقتؔ کاکوروی، عزیزؔ وارثی، گلزارؔ دہلوی، اور امنؔ صاحب شامل تھے۔ دِلی کی جھولی میں پنجاب سے جو مالِ غنیمت آپڑا تھا اس میں تلوک چند محرومؔ، جگن ناتھ آزادؔ، پنڈت ہری چند اخترؔ، نریش کمار شادؔ، ساحرؔ ہوشیارپوری پریم ناتھ پنڈت، بسمل سعید، ظفر ادیب اور کچھ اصحاب تھے جن کے نام مجھے اِس وقت یاد نہیں یہ سب اردو مجلس کی نشستوں میں شامل ہوتے۔ میں نے جب مولانا آزاد کو یہ خوش خبری دی انھوں نے فرمایا تم اردو مجلس کو انجمن ترقی اردو شاخ کی شکل دیدو، مرکزی انجمن کے جنرل سکریٹری قاضی عبدالغفار پرسوں آنے والے ہیں یہیں ٹھہریں گے ان سے آکر مل لینا وہ قواعد اور ضوابط انجمن کے تم کو بتادیں گے۔ میری لیلیٰ کے خطوط کے مصنف سے یہ پہلی ملاقات تھی، عمر کے کافی تفاوت کے بعد بھی میں نے ذہنی طور پر ان کو اپنے قریب پایا وہ بہت بذلہ سنج انسان تھے ان کی گفتگو کا انداز بہت دل نشین تھا جس میں مزاح کی چاشنی ہوتی کاروباری گفتگو میں بھی انداز دل کش ہوتا تھا۔

مجھے یہ کہتے ہوئے فخر حاصل ہوتا ہے کہ میں نے ادبی کام کرنے کی تربیت مولانا آزاد کے قدموں میں بیٹھ کر حاصل کی اور قاضی صاحب کی ہدایات نے میری بہت رہنمائی کی دلی شاخ نے جو بھی اچھا کام کیا ہے وہ قاضی صاحب کے مشورے کی بدولت۔ دوسری مرتبہ قاضی صاحب تشریف لائے تو اپنے پہنچنے کی تاریخ کی اطلاع خط سے دے دی میں ملنے پہنچا انھوں نے دوران گفتگو کہا "آپ کو ادبی کاموں سے دلی شغف ہے میں سمجھتا ہوں کہ دلی شاخ کا سب سے ضروری کام غالبؔ کے مزار کی طرف توجہ کرنا ہے ادھر حکومتِ ہند کو جلد از جلد دیکھنا چاہیے آزاد ہندوستان کا ادبی فریضہ ہے کہ غالبؔ کا مزار اور اس کے ساتھ ایک لائبریری بنوائے قوم پر غالبؔ کا بہت بڑا قرضہ ہے اِس کو اتارنے میں آپ ہماری مدد کریں پھر غالبؔ آپ کے نانا بھی تو ہوتے ہیں۔"

میں نے قاضی صاحب کے ارشاد کی تعمیل بہت جلدی کی دو مہینے بعد مئی کے آخر میں ایم

غالب منانے کی تیاری کی مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا اس تقریب میں تشریف لائیں انھوں نے مجھے جھڑک دیا "کون جانتا ہے اب غالب کو اور کس لیے میں تقریر کروں اب دلی میں دلی والے نہیں رہے یہ کیمپ ہے جس میں بقول غالب کچھ اہل حرفہ رہتے ہیں کچھ اہل کار ان میں ادب شناسی کہاں ہے" میں نے حوصلہ کر کے کہا ایسی بات تو نہیں ہے دلی میں اب بھی ادیب اور شاعر کچھ تو ہیں کچھ یو پی کے آگئے ہیں اور پنجاب کے تو کافی پڑھے لکھے اور ادب شناس لوگ یہاں آچکے ہیں میں نے مجلس عاملہ کی میٹنگ میں یہ کہا "حضرت مولانا آزاد کو یوم غالب کا افتتاح کرنے کے لیے لانے کی کوشش کروں گی تو سب ممبر بہت خوش ہوئے آپ ان کا لو دل نہ توڑیے" مولانا نے چند منٹ کے سکوت کے بعد جواب دیا ابھی تو میں بہت مصروف ہوں اس مرتبہ تو نہیں آسکتا البتہ تم ان کی وفات کی تاریخ پندرہ یا سولہ فروری کو یوم غالب رکھو تو میں اس میں آنے کی کوشش کروں گا" اور پھر ہم نے یہ یوم غالب اس شان سے منایا کہ حضرت جوش ملیح آبادی جو کبھی طرح میں غزل نہیں کہتے تھے اس شام غالب کی طرح میں جھوم جھوم کر غزل سنا رہے تھے جلسے کا افتتاح سردار نجیب اللہ سفیر افغانستان نے کیا تھا اور صدارت قاضی عبدالغفار نے فرمائی تھی پورا چونسٹھ کھمبا لوگوں سے بھرا ہوا تھا، اس یادگار یوم غالب کی تعریف اجمل خاں اور قاضی صاحب نے مولانا سے کی تو اس کے بعد جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئی تو انھوں نے میری اس محنت کی داد دی اور فرمایا آئندہ یوم غالب میں ضرور آؤں گا۔ تاراچند کو بھی اس میں بلا لینا۔

۱۹۵ کی فروری میں مولانا صاحب نے یوم غالب میں شرکت فرمائی اس وقت کے چیف کمشنر صدر استقبالیہ تھے مولانا آزاد نے پون گھنٹے اپنی دل آویز تقریر سے سامعین کو محظوظ کیا، وہ اس دن بہت خوش تھے کیونکہ ان کے قریب قاضی عبدالغفار مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، مولانا احمد سعید، مفتی کفایت اللہ، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب، آل احمد سرور، ڈاکٹر تاراچند، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو بیٹھے تھے۔ اس سلسلے میں ایک تاریخی واقعہ جس کی تفصیل یہ ہے مولانا آزاد نے تقریر کے دوران فرمایا تھا "ہندوستان کی دو زبانیں ایسی ہیں جن کے ادب کو بیرونی زبانوں کے ادب کی برابری کا درجہ حاصل ہے اردو اور بنگلہ" کچھ دن بعد ٹنڈن جی نے پارلیمنٹ میں مولانا آزاد پر اعتراض کیا۔

امام الہند بھلا ان کو کیا گردانتے تھے برہمی سے بہت تلخ جواب دیا ساتھ ہی پنڈت نہرو آستینیں چڑھا کر ان کی ہاں میں ہاں ملانے کھڑے ہو گئے پھر تو ٹنڈن جی پر اس قدر جھاڑ پڑی کہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے میں اپنی یادوں میں کھو کر موضوع سے دور نکل گئی ذکر تھا قاضی صاحب کا ۱۹۵۲ کے دسمبر میں وہ دلی تشریف لائے تو میں نے ان سے درخواست کی پرسوں دوپہر کو آپ علی منزل میں کھانا تناول کریں اور انجمن کا دفتر بھی دیکھ لیں انھوں نے بہت مسرور ہو کر آنے کی حامی بھری بمعہ اپنی بیگم کے تشریف لائے کھانوں میں دلی کی سردی کی مشہور ڈش شب دیگ بھی شامل تھی بہت تعریف کر کے کھائی اور فرمایا حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم ہر سردی میں شب دیگ کی دعوت دیگ پکوا کر کرتے تھے ان کے بعد آج میں نے یہ کھائی ہے" جب تک قاضی صاحب کی صحت نے اجازت دی وہ برابر انجمن کے سالانہ اجلاس اور یوم غالب میں صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے اور مجھے اپنے مشورے سے نوازتے رہے ۱۹۵۴ میں مجلس عام کا ممبر بھی انھوں نے مجھے بنایا کاش انجمن کی حالت کو سنوارنے اور گیسوئے اردو کی شانہ کشی کے لیے کچھ سال اور قاضی صاحب جیتے ہوتے تو غالباً اردو کو اس کا حق ان کی دلی لگن کی بدولت جلدی مل جاتا اور اس کو ایڑیاں رگڑنا نہ پڑتیں کیونکہ وہ تو پنڈت نہرو کو بھی اس سلسلے میں کھری کھری سنا دیتے تھے بقول میرؔ ؎

پیدا کہاں ہیں اب ایسے پراگندہ طبع لوگ

پروفیسر نثار احمد فاروقی

سیّد جمال الدین افغانی اور قاضی عبد الغفّار

اگر یہ سوال کیا جائے کہ انیسویں صدی کی اسلامی دنیا میں وہ ایک شخصیت کون سی ہے جس کے انقلابی افکار نے سب سے زیادہ وسیع رقبے کو متاثر کیا، مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی، مغرب کی استعماری قوتوں کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا اور کئی ملکوں کی تقدیر ہی بدل کر رکھ دی تو سیّد جمال الدین افغانی کے سوا کسی اور کا نام شاید ہی ذہن میں آئے۔

جمال الدین محمد بن صفدر الحسینی الافغانی ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے وہ انیسویں صدی میں عالم اسلام کے بہت بڑے مفکّر، فیلسوف اور مُصلح تھے جن کے انقلابی افکار نے پورے مشرق کو متاثر کیا اور تجدّد و اصلاح کی کئی تحریکیں اُن کے اثر سے شروع ہوئیں۔ مصر کے دورِ تجدّد کی تو پوری تاریخ افغانی کی شخصیت کے محور پر گھوم رہی ہے۔

جمال الدین افغانی پر ایران اور افغانستان دونوں کا دعویٰ ہے۔ کسی نے اُن کا وطن احمد آباد (افغانستان) بتایا ہے اور کوئی اُنھیں اسعد آباد (ایران) سے منسوب کرتا ہے لیکن زیادہ قرینِ صحت یہی ہے کہ وہ افغانی الاصل تھے۔

اُن کی ابتدائی تعلیم اور نشو و نما کابل میں ہوئی۔ پھر اُنھوں نے کچھ عرصہ بمبئی میں رہ کر بھی علوم جدیدہ کی تعلیم حاصل کی۔ وہ اسلامی علومِ منقول و معقول کے علاوہ فلسفہ، منطق، سیاسیات، اقتصادیات، تاریخ، ریاضی، طبیعیات، وغیرہ میں بھی اچھی نظر رکھتے تھے، متعدد زبانوں پر بھی اُنھیں قدرت حاصل تھی۔ فارسی، عربی، انگریزی کے علاوہ جرمن، فرنچ اور روسی زبانوں میں بھی تحریر و تقریر پر

قادر تھے۔

اُن کی ساری زندگی سیر و سیاحت میں گذری۔ ہندستان سے وہ مصر گئے وہاں سے ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ - ۱۸۶۸ء) میں آستانہ (ترکی) پہنچے۔ ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۲ - ۱۸۷۱ء) میں آستانہ سے جلاوطن کر دیے گئے تو پھر مصر میں مقیم ہوئے۔ یہاں آٹھ سال تک جامعۃ الازہر میں درس دیتے رہے۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کی ایک ایسی کھیپ پیدا کر دی جس نے دین اور سیاست میں تجدید و اصلاح کی روح پھونک دی۔ مصر کے مشہور عالم شیخ محمد عبدہٗ اور ممتاز صحافی ادیب اسحٰق اور دوسرے بہت سے صاحبانِ فکر و نظر اُن کے شاگرد ہوئے۔

ادیب اسحٰق نے اُن کی تحریک سے جریدہ مصر جاری کیا اُس میں افغانی بھی کبھی "مظہر بن وضاح" کے قلمی نام سے کبھی السید الحسینی یا صرف السید کے نام سے مضامین لکھا کرتے تھے مصر میں صحافت کی قوت کا شعور افغانی ہی نے پیدا کیا۔ ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں اُنھیں مصر سے بھی دیس نکالا دے دیا گیا اور وہ حیدر آباد آ گئے۔ مگر یہاں اُنھوں نے اپنا وقت خاموشی سے گذارا۔ حیدر آباد سے ایک رسالہ معلم نکلتا تھا اُس میں افغانی نے کئی مضامین لکھے، ایک مضمون "گھوریانِ باشوکت و شان" سرسید کے نظریۂ نیچر کے رد میں لکھا تھا اُس کا عربی ترجمہ شیخ محمد عبدہٗ نے کیا جو الرد علی الدھریین کے نام سے شائع ہوا۔ حیدر آباد میں اُن کا قیام تقریباً پونے دو سال رہا، مگر اُس کی زیادہ تفصیلات دستیاب نہیں ہیں اور اس پہلو پر مزید بحث و تحقیق کی گنجائش ہنوز باقی ہے۔ افغانی حیدر آباد سے نکل کر کلکتہ ہوتے ہوئے پیرس پہنچے، یہاں مصر کے شیخ محمد عبدہٗ بھی آ گئے اور دونوں نے مل کر ایک جریدہ العروۃ الوثقیٰ شائع کرنا شروع کیا، اس کے صرف ۱۸ شمارے نکلے مگر عربی صحافت کی تاریخ میں العروۃ الوثقیٰ ایک بلند مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔

افغانی کی سیاحت کا دائرہ افغانستان، ہندستان، مصر، ترکی، پیرس، انگلستان، جرمنی، روس، ایران تک پھیلا ہوا ہے۔ روس کے دارالخلافہ پیٹرس برگ میں بھی وہ چار سال تک رہے۔ یہیں اُن کی ملاقات ناصر الدین شاہ قاچار شاہِ ایران سے ہوئی اور اُس کی دعوت پر جرمنی ہوتے ہوئے ایران گئے۔ مگر اُن کی بے باکی، صاف گوئی، انقلاب دوستی اور تجدید و اصلاح کی تڑپ کو ایران بھی برداشت نہ کر سکا، اور اُنھیں سات ماہ تک درگاہ شاہ عبدالعظیم میں پناہ گزین بن کر

رہنا پڑا جسے ایران کی اصلاح میں "بست" کہتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی وہ شاہِ ایران کے خلاف مضامین لکھتے رہے اور اُس سے مطالبہ کرتے رہے کہ وہ تخت سے دست بردار ہو جائے شاہ قاچار انگریزوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا اُس کی پالیسیوں سے صرف برطانوی استعمار کو فائدہ پہنچ رہا تھا۔ افغانی کی تحریک کا یہ اثر ہوا کہ آخر شاہ قاچار ایک ایرانی کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ افغانی ایران سے نکالے گئے تو یورپ میں گھومتے ہوئے لندن آ گئے یہاں سے سلطان عبدالحمید نے انھیں ترکی میں بلایا، وہاں بھی انھوں نے تحریر و تقریر میں دستوری حکومت کا مطالبہ جاری رکھا ظاہر ہے کہ عثمانی خلیفہ یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا۔

ترکی ہی میں وہ مرض سرطان میں مبتلا ہوئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھیں زہر دیا گیا۔ آستانہ ہی میں اُن کا انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ ۱۳۶۳ھ میں اُن کا تابوت افغانستان کو منتقل کر دیا گیا۔

افغانی تمام عمر مجرّد رہے اور نہایت پاکیزہ زندگی بسر کی۔ وہ قدیم و جدید علوم کی حیرت انگیز واقفیت رکھتے تھے نہایت ذہین و فطین خوش اخلاق، کریم النفس، خوش گفتار اور پسندیدہ اطوار کے انسان تھے جو اُن سے ایک بار ملتا تھا اُن کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ یورپ کے بڑے گھاگ سیاست داں بھی اُن کی دِقّتِ نظر اور دور بینی کے قائل تھے۔

انھوں نے تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا۔ خفیہ اور علانیہ طریقوں سے اپنی دعوت کو عام کرتے رہے اور اُسے نافذ کرنے کے لیے ہر علاقے کے ذہین افراد کو اپنی مجلسی گفتگو سے متاثر کر کے آمادہ کرتے رہے۔ پھر بھی اُن کی مندرجہ ذیل تصانیف طبع ہو چکی ہیں:

(۱) تتمۃ البیان فی تاریخ الافغان ــــ طبع مصر ۱۹۰۱ء

(۲) رسالۃ الرّد علی الدہریین۔ یہ انھوں نے زمانہ قیام حیدرآباد میں سرسیّد احمد خاں کے مذہبی نظریات کے خلاف فارسی میں لکھا تھا اور اس کا عربی ترجمہ شیخ محمد عبدہ نے کیا۔

(۳) محمد باشا المخزومی نے اُن کے افکار جمع کر کے "خاطرات جمال الدین افغانی" کے نام سے شائع کر دیے تھے۔

(۴) العروۃ الوثقیٰ کے مضامین حسین محی الدین نے جمع کر کے مصر سے ۱۹۱۰ء میں شائع کیے تھے۔

جمال الدین افغانی پر فارسی، عربی، انگریزی اور فرنچ میں کتابیں لکھی گئی ہیں۔
عربی میں ادیب اسحٰق بی الدزاھمی کی آثارِ جمال الدین افغانی (۱۹۰۱)، شکیب ارسلان کی حاضر العالم الاسلامی اور جرجی زیدان کی اشہر مشاہیر الشرق میں اُن کے حالات و افکار آگئے ہیں محمد سلام مذکور کی جمال الدین افغانی باعث النھضۃ الفکریہ فی الشرق بھی ان کی سیرت اور افکار کے موضوع پر ہے۔
فارسی میں سعید پارس کی جمال الدین افغانی (طبع استنبول) اور لطف اللہ کی شرح حال و آثار جمال الدین افغانی (برلن ۱۳۰۴ھ) ہیں۔
انگریزی میں اُن کے دوست بلنٹ نے اپنے روزنامچے میں افغانی کا کثرت سے تذکرہ کیا ہے اردو والوں نے افغانی کی طرف زیادہ التفات نہیں کیا۔ آج بھی ایسے لوگ کم ہی ملیں گے جو اس عبقری کے افکار اور اُن کے دُور رس اثرات سے پوری واقفیت رکھتے ہوں۔
مکتبہ جامعہ ملیہ سے ایک چھوٹا سا کتابچہ (۱۰۲ صفحات) کا دیانی پریس برلن کے ٹائپ میں چھپا تھا جس پر مصنف کا نام اور سنہ اشاعت بھی نہیں ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ یہ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا ہوگا۔
۳۶ صفحات کا ایک کتابچہ مولانا ظفر علی خاں نے بھی لکھا تھا یہ جارج اسٹیم پریس لاہور سے اس صدی کے تیسرے دہے میں چھپا ہوگا۔ سنہ اس پر بھی نہیں ہے۔ ۳۲ صفحوں کا ایک مختصر رسالہ حالی پریس پانی پت سے شائع ہوا۔ اس پر بھی مصنف کا نام نہیں ہے ممکن ہے برطانوی حکومت کے خوف سے نام نہ دیا جاتا ہو۔ اردو میں سب سے پہلے مکمل، مفصل اور مستند سوانح عمری جو ۴۸۰ صفحات میں سمائی ہے قاضی عبد الغفار مرحوم نے لکھی۔ وہ برسوں تک اس کتاب کے لیے مواد جمع کرتے رہے اپنے سفرِ یورپ و انگلستان کے زمانے میں بھی بہت سی تفصیلات جمع کیں مصر گئے تو وہاں سے بھی ضروری معلومات اکٹھا کر کے لائے۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے حیدر آباد میں بیٹھ کر اپنی یہ عظیم الشان اور قابلِ قدر کتاب "آثارِ جمال الدین افغانی" لکھی اور اگست ۱۹۴۰ء میں اسے انجمن ترقی اردو نے اپنے سلسلۂ مطبوعات کی ۲۴ ویں کتاب کے طور پر شائع کیا۔ یہ اردو میں تو اس موضوع پر بلا شبہ سب سے اچھی اور مستند کتاب ہے، لیکن بے تکلف کہا جا سکتا

ہے کہ عربی و فارسی میں جو کتابیں افغانی پر لکھی گئی ہیں اُن کے سامنے بھی اسے کسی شرمندگی کے بغیر رکھا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کے مقدمے میں عالم اسلام کا سیاسی پس منظر اختصار کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے اور اس سے قاضی صاحب کے سیاسی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے دور اوّل میں اُن کی ابتدائی زندگی کا احاطہ کیا ہے۔

دورِ ثانی میں ہندستان، مصر اور ترکی کے اسفار کی تفصیلات آگئی ہیں، دورِ ثالث و آخر میں یورپ، روس، جرمنی، ایران، ترکی میں اُن کی سیاحت اور اُن کے اثرات کا بیان ہوا ہے۔

ایک حصّے میں اُن کے اقوال ہیں۔ پھر ضمیموں میں اُن اہم شخصیات کے حالات بیان کر دیے ہیں جن کا نام افغانی کی سیرۃ و سوانح کے سلسلے میں آتا ہے۔ آخر میں جریدۂ عُروۃ الوثقیٰ کے چار مقالے بھی درج ہوئے ہیں۔

اردو میں ایک کتاب حیات جمال الدین افغانی رضا ہمدانی کی ہے (۱۹۱ صفحات) یہ انشا پریس لاہور سے ۱۹۵۱ء میں چھپی، دوسری ضیاء الدین احمد برنی نے ۱۹۵۴ء میں یونائٹڈ پریس کراچی سے شائع کی (صفحات ۲۰۲) ۹۴ صفحات کی ایک کتاب مرزا ادیب نے بھی لکھی جو ۱۹۴۷ء میں گیلانی پریس لاہور سے چھپی تھی۔

مبارز الدین رفعت مرحوم نے افغانی کے مضامین کا سلیس اردو ترجمہ کیا جو ۱۹۴۲ء میں حیدرآباد سے چھپا تھا (صفحات ۲۶۱) اس کے بعد بھی کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ ایک کتاب "سید جمال الدین افغانی؛ حیات و افکار"، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور نے ۱۹۷۹ء میں چھاپی ہے اس کے مصنّف شاہد حسین رزّاقی صاحب ہیں (صفحات ۲۲۰)، یہ اردو کی کل کائنات ہے۔ ممکن ہے دو چار چھوٹے موٹے رسالچے اور بھی رہے ہوں مگر جس سنجیدگی کے ساتھ قاضی عبد الغفار نے جمال الدین افغانی کا مطالعہ کیا ہے اُسے زمانی تقدم کی فضیلت تو حاصل ہے ہی طرزِ انشاء، اور سیاسی شعور کے اعتبار سے بھی قاضی صاحب کی کتاب سب سے منفرد اور ممتاز ہے۔ دوسری سب کتابیں اِس کے بعد ہی لکھی گئی ہیں اور سب نے قاضی صاحب سے استفادہ کیا ہے۔

ضرورت یہ ہے کہ انجمن ترقی اردو (ہند) اس قابلِ قدر کتاب کا نیا عکسی ایڈیشن شائع

کرے۔ آج عالمِ اسلامی میں عموماً اور خلیج میں خصوصاً جو بحران آیا ہوا ہے اُس کو پس منظر میں رکھ کر افغانی کے افکار کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ وہ کیسی بے چین روح تھی جو استعماری طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا انجام آج سے ایک صدی قبل دیکھ رہی تھی۔

افغانی کو ایک ناکام مصلح تو نہیں کہا جا سکتا۔ اُن کی تحریک کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اقوامِ مشرق کو اغیار کی غلامی سے نجات ملے اور عالمِ اسلام سیاست کے پلیٹ فارم پر متحد ہو جائے۔ مغرب سے دہریت کا جو سیلاب آ رہا ہے اُس کو روکا جائے۔ مسلمان عقل اور آزادیٔ فکر کی اہمیت کو سمجھیں اور مسلم ممالک میں آئینی اور دستوری حکومت ہو، سماجی اصلاحات نافذ کی جائیں اور یورپ کی بے جا سیاسی و اقتصادی مداخلت پر روک لگائی جائے۔ حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں اُنھوں نے ہی یہ تجویز پیش کی تھی کہ اپنی زبان میں تعلیم دینے والی ایک یونیورسٹی قائم ہو۔ اُن کا یہ خواب جامعہ عثمانیہ کی صورت میں نمودار ہوا، مگر جب اپنی حکومت آئی تو وہ خواب ہم نے اپنے ہاتھوں سے چکنا چور کر دیا۔

قاضی صاحب نے افغانی کے ان سب خیالات پر شرح و بسط گفتگو کی ہے۔ میری نظر میں اُن کی یہ تصنیف مجنوں کی ڈائری اور لیلیٰ کے خطوط سے بہت اعلیٰ و ارفع درجے کی چیز ہے۔

پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی

نقشِ فرنگ ـــــ ایک مطالعہ

نقشِ فرنگ، جو قاضی عبدالغفار کا سفرنامۂ یورپ ہے، ان کی پہلی تصنیف ہے۔ یہ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا تھا لیکن اس کی اشاعت میں کافی وقت لگا تھا کیوں کہ قاضی صاحب نے اس کا انتساب جو مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے نام ہے، مئی ۱۹۲۳ء میں سپردِ قلم کیا اور "پھر دل طواف کوئے ملامت کو جائے ہے" کے زیرِ عنوان پیش لفظ جون ۱۹۲۳ء میں۔ اِس پیش لفظ میں انھوں نے لکھا ہے: "گذشتہ سال موسمِ گرما میں یورپ سے واپس آنے کے بعد چند ہفتے بمقام سولن جناب قبلہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کی پاکیزہ اور دل فریب صحبت میں گزرے۔ ان ہی چند ہفتوں میں یہ اوراق مرتب کیے گئے مگر ان کی تکمیل نہ ہو سکی" اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یورپ کا یہ سفر ۱۹۲۱ء میں ہوا تھا اور "نقشِ فرنگ" کا مسودہ بھی اسی سال لکھا گیا تھا۔ اس وقت قاضی عبدالغفار کی عمر ۳۳ سال تھی۔ ایک طرف "لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" اور دوسری طرف آثارِ جمال الدین افغانی، حیاتِ اجمل اور آثارِ ابوالکلام آزاد کے مصنف کی حیثیت سے قاضی صاحب نے جو شہرت اور امتیاز حاصل کیا اس کا اوّلین نقش ہمیں نقشِ فرنگ میں نظر آتا ہے۔ اس کتاب کو اپنی اوّلین تصنیف خود قاضی عبدالغفار نے بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "عمر کے بہترین ۱۵ برس اخبار نویسی کے اس عہد میں گزرے جو ہندستان کی قومی زندگی کا ایک متلاطم اور یادگار عہد تھا۔ ۔ ۔ اس زمانے میں قلم ٹوٹا نہ تھا، بُرا لکھا مگر بہت کچھ لکھا لیکن قومی دریا کی دھار پر یہ سب کاغذ کی کشتیاں تھیں جو بہتی ہوئی نکل گئیں، کوئی ایک نقش بھی ایسا نہ تھا کہ باقی رہ جاتا۔

بدنصیبی ہے نہ کبھی اتنی توفیق حاصل ہوئی۔ نہ البتّہ نصیب کہ ان کاغذ کی ناؤں کے علاوہ چند باقی رہ جانے والے اوراق بھی مرتّب ہوتے۔۔۔ ارادے کیئے بھی تو پورے نہ ہوئے کسی مستقل تصنیف و تالیف کی صورت میں اپنے وطن کی کوئی خدمت کرنی چاہی تو بن نہ آئی۔۔۔ یہ نام نہاد سفرنامہ جو محض سرسری مشاہدات کا ایک عکس ہے، میرے اوراقِ پریشاں کا پہلا مجموعہ ہے جو کتابی صورت میں شائع ہوتا ہے۔" اس سفرنامے کی اشاعت سے پہلے قاضی صاحب یوروپ کا ایک اور سفر کر آئے تھے جو اگلے ہی سال یعنی ۱۹۲۲ء میں ہوا تھا لیکن پیشِ نظر سفرنامہ پہلے ہی سفر کی روداد ہے، البتّہ اس میں کہیں کہیں دوسرے سفر کے بارے میں بعض اشارے ملتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس سفرنامے کی تکمیل بقول قاضی عبدالغفار ۱۴ر جون ۱۹۲۲ء کو دوسرے سفر کے دوران اس وقت ہوئی جب ان کا جہاز جزیرہ کریٹ کے سامنے گزر رہا تھا۔

یوروپ کا پہلا سفر قاضی عبدالغفار نے وفدِ خلافت کے سکریٹری کی حیثیت سے کیا تھا۔ یہ خلافت کمیٹی کا دوسرا وفد تھا جو خود حکومتِ برطانیہ کی طلبی پر لندن گیا تھا۔ پہلا وفد مولانا محمد علی کی قیادت میں وہاں جاکر ناکام واپس آچکا تھا۔ اس کے بارے میں قاضی صاحب کا تاثر تھا کہ "مولانا محمد علی اور دیگر اراکینِ وفدِ خلافت کی واپسی کے بعد ہر شخص نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جہاں تک اہلِ برطانیہ اور رہبرِ طانوی وزراء کا تعلق ہے مسلمانانِ ہندوستان نے آخری حجت پیش کردی۔ اس کے بعد عرض و معروض اور دلایل و براہین کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔ ہم نے اپنے بہترین ترجمان ان کی خدمت میں بھیج دیئے۔۔۔ بالآخر ہم اس منزل سے گزر گئے جہاں انصاف و حق کا نام لے کر گدایانہ ہاتھ پھیلایا جاتا ہے۔ پس کسی دوسرے وفد کا بھیجا جانا خیال و گمان سے بھی باہر تھا۔" اس لیے جب ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے قاضی صاحب کو بلا کر بتایا کہ وزیر اعظم برطانیہ مسٹر لائڈ جارج نے خلافت کمیٹی کے صدر سیٹھ چھوٹانی کو لندن طلب کیا ہے "تاکہ خلافت اور مسئلہ شرقیہ کے متعلق جو معاملات سپریم کونسل کے سامنے پیش ہیں ان کی نسبت کچھ مشورہ کریں" اور سیٹھ صاحب نے مہاتما گاندھی سے دریافت کیا ہے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے، گاندھی جی کا مشورہ ہے کہ انھیں جانا چاہیے لیکن ڈاکٹر انصاری کو بحیثیت مشیر و ترجمان ساتھ لے جانا چاہیے تو قاضی

صاحب کو تعجب ہوا اور جب ڈاکٹر انصاری نے تجویز کیا کہ قاضی صاحب وفد کے ہم راہ بطور سکریٹری جائیں تو انھیں اور زیادہ اچنبھا ہوا لیکن وہ بخوشی آمادہ ہو گئے۔ اس وفد میں سیٹھ چھوٹانی ڈاکٹر انصاری اور قاضی صاحب (جنھیں ایک حد تک خلافت کمیٹی کا نمائندہ کہا جا سکتا تھا اگرچہ قاضی صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ خلافت کمیٹی نے کسی وفد کا بھیجنا طے ہی نہیں کیا تھا) کے علاوہ ہز ہائنیس سر آغا خاں، سید حسن امام اور مسٹر مشیر حسین قدوائی شامل تھے اور یہ بھی وزیر اعظم برطانیہ کے طلبیدہ تھے۔ اِس صورتِ حال کا مضحکہ خیز پہلو قاضی صاحب سے چھپا نہیں رہ سکا اور اگرچہ وہ خود اس نام نہاد وفد میں شامل تھے، انھوں نے اس کا نقش فرنگ میں جی بھر کر مذاق اڑایا ہے۔

"نقش فرنگ" روایتی سفر نامہ نہیں ہے اور اس لیے اس میں خود بقول قاضی عبدالغفار "آئندہ یوروپ کے جانے والوں کو جہاز کا کرایہ، ٹھہرنے کے لیے ہوٹل، سیر و سیاحت کے لیے مشہور مقامات کا حال" بیان نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس قاضی صاحب کا کہنا ہے کہ "ان اوراق کے اندر ایک شخص واحد کے دماغ و دل کی ان کیفیات کا پرتو ہے جو انگلستان، فرانس، سوئٹزرلینڈ و اٹلی کے مناظر کو ایک نظر دیکھتا ہوا گزر گیا۔ ۔ ۔ ۔ یہ سطور جس نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں وہ ایک معمولی حیثیت کے مسلمان اور ایشیا نژاد کا نقطۂ نظر ہے"۔ لیکن میری رائے میں اس سے بھی بڑھ کر یہ اس زمانے کے ہندستانی مسلمانوں کی سیاست کے ایک خاص رخ کی روداد ہے جو قاضی صاحب نے اس سیاست کے شریک کار ہونے کے باوجود بڑی حد تک معروضیت اور غیر جانب داری سے لکھی ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ اپنی جماعت اور خود اپنے پر ہنسنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ میرے نزدیک سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر قاضی صاحب ایک طنز نگار تھے اور ایک اچھے طنز نگار کی یہ خصوصیت اس کتاب سے پوری طرح آشکار ہوتی ہے کہ اس کے طنز کی گرفت سے اس کے آس پاس کے لوگ بلکہ وہ خود بھی آزاد نہیں رہتا ہے۔ سب سے پہلے تو اس وفد کی ہیئت ترکیبی ہی، جسے قاضی صاحب نے "معجون مرکب" کہا ہے، انھیں کھٹکی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، اس وفد میں ایک طرف سیٹھ چھوٹانی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور قاضی عبدالغفار تھے جن کا خلافت کمیٹی سے تعلق تھا اور دوسری

طرف سر آغا خاں مسٹر حسن امام اور مسٹر شیر حسین قدوائی تھے جو کسی کے نمائندے نہیں تھے۔ مسٹر حسن امام کے بارے میں قاضی صاحب کا کہنا ہے کہ وہ "بلحاظ اپنی اعلیٰ شہرت و قابلیت کے ایک قابلِ احترام شخصیت رکھتے تھے۔ ہندستانی سیاست کے گذشتہ دور میں ان کا پایہ بلند تھا، اتنا بلند تھا کہ ایک سال کانگریس کے صدر بھی منتخب ہو گئے تھے لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب ہنوز اعتدال و احتیاط و مصلحت وقت کے بلند میناروں پر بابو سریندر ناتھ بنرجی اور فیروز شاہ مہتا کے جھنڈے اڑ رہے تھے . . . مسٹر حسن امام اسی پیچھے رہ جانے والی صف اوّل کے "آزمودہ کار" ہیں۔ ان کی قومی زندگی کے ساتھ جو روایات وابستہ ہیں وہ ایسی نہ تھیں کہ عہدِ نو کے کام کرنے والوں کو سید صاحب کی رائے پہ بھروسہ کرنے کے لیے تیار کرتیں" اور سر آغا خاں کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ "اگرچہ ان کی شخصیت بہت زیادہ دل کش اور دل چسپ اور دل رُبا ہے مگر وہ بھی باوجود اپنی اعلیٰ دماغی قابلیت کے سوئٹزرلینڈ و اٹلی کی پُر فضا وادیوں اور جھیلوں اور پیرس و لندن کی گوناگوں دل چسپیوں میں ہندستانی سیاسیات کے مد و جزر کو بظاہر بھول چکے ہیں" سیٹھ چھوٹانی کی شخصیت بہت دل چسپ تھی۔ وہ خلافت کمیٹی کے صدر تھے لیکن ایک سرمایہ دار بھی تھے۔ ممکن ہے خلافت کمیٹی کے صدر اسی وجہ سے بنائے گئے ہوں کہ سرمایہ دار تھے۔ لوگوں کی نظر ان کی سیاسی حیثیت سے زیادہ ان کے سرمائے پر رہتی تھی۔ قاضی صاحب نے اپنے دل چسپ انداز تحریر میں لکھا ہے: "میں خزانے کا سانپ بن گیا تھا یوں، تو ہمارے لندن پہنچتے ہی دور دور کے رفقاء و احباب جمع ہو گئے مگر بدقسمتی یہ حالت تھی کہ ہر ہمدرد و دوست جو ملنے آتا تھا اس کی نظر سیٹھ چھوٹانی کی جیب پر پڑتی تھی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ وفد آیا ہے، لاکھوں لایا ہوگا۔ پھر خود سیٹھ صاحب کا وزن بھی بحساب زر سرخ کچھ کم نہ تھا اچھے اچھے خوش پوش، بظاہر نہایت خوش حال، باتوں کو سنتے تو نہایت مزیدار مگر ساری گفتگو میں گرہ کا مصرع یہی ہوتا تھا کہ ہو سکے تو وفد یا سیٹھ صاحب کے بینک کی کتاب کا کوئی ورق ہاتھ آجائے" اس قماش کے لوگوں کی حرکات و سکنات کا ذکر قاضی صاحب نے جس لطف کے ساتھ کیا ہے وہ بہت دل کش اور جاذبِ توجہ ہے۔ لیکن تنگیٔ داماں مزید پھول چننے کی اجازت نہیں دیتی ہے۔

وفد کا پہلا سابقہ وزیر ہند مسٹر مانٹیگو سے پڑا۔ قاضی صاحب کا ارشاد ہے کہ "دوران سفر میں سید حسن امام صاحب اور ہز ہائینس آغا خاں نے وزیر ہند کی تعریفوں کے اتنے دریا بہائے تھے کہ مجھ جیسا بد عقیدہ بھی اپنی جگہ سے ہلنے لگا تھا۔" ان سے مل کر قاضی صاحب ان کی شخصیت کی "دل نوازی" اور "عشوہ طرازی" کے تو قائل ہو گئے لیکن ساتھ ہی یہ بھی سمجھ گئے کہ وہ "اپنے فن تدبر میں کچھ زیادہ سبک دست اور دل فریب ہیں۔" قاضی صاحب نے ان کی خوش اخلاقی کا اعتراف کیا ہے لیکن اس کے کھوکھلے پن سے صرف نظر نہیں فرمایا ہے اور وزیر اعظم کے سامنے ان کی لاچاری و بے بسی کا مذاق اڑایا ہے۔ وزیر اعظم برطانیہ مسٹر لائڈ جارج سے وفد کی دو ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کی روداد قاضی صاحب نے بہت تفصیل سے اور دلچسپ انداز میں لکھی ہے۔ مسٹر لائڈ جارج کی "ادائے تفاخر" "کیف پندار" موقع کی مناسبت سے اراکین وفد کے ساتھ ان کا تلطف یا بے توجہی اور بات ٹالنے کی غیر معمولی صلاحیت کی نقشہ کشی اس طرح کی ہے کہ آنکھوں کے سامنے تصویر کھنچ جاتی ہے۔ ساری تگ و دو کا نتیجہ حسب توقع صفر رہا۔ قاضی صاحب رقم طراز ہیں، "ملاقاتیں ختم ہو گئیں، بارگاہ وزارت کے دروازے بند ہو گئے بندگان فرمان حاضر رہے اور رخصت کر دیے گئے۔ ایک تماشہ تھا کہ ختم ہو گیا۔ ۔ غلام بھی وہی تھے، آقا بھی وہی تھا، ہماری پیشانی بھی وہی تھی، ان کا سنگ آستاں بھی وہی تھا، ہماری التجائیں بھی وہی تھیں اور ان کا انداز بھی وہی تھا۔ پھر آخر یہ سب تھا کیا؟ چھ ہزار میل کا سفر وہ بھی اس طرح کہ تین دن کے اندر بستر باندھ لیا گیا۔ پھر چھ ہزار میل واپسی۔ مہینے بھر کا قیام، وزیر ہند اور وزیر اعظم سے ملاقاتیں۔ یہ سب ایک خواب ہے کہ چند روز یاد رہے گا۔ میں اس خواب کو حوالۂ قلم کرتا ہوں کہ اگر کہیں یہ صفحات ہندستان کے آئندہ مورخ کے ہاتھ پڑ جائیں تو وہ بھی دیکھے کہ ہندستان کس طلسم میں مبتلا تھا!"

وزیر اعظم برطانیہ سے ملاقاتوں میں وفد کے ترجمان سید حسن امام صاحب تھے۔ قاضی صاحب نے ان کی بعض باتوں پر سخت گرفت کی ہے۔ دوران گفتگو مسٹر لائڈ جارج بار بار کہتے تھے کہ "برطانیہ کبھی کسی مذہبی معاملے میں دخل نہیں دیتا۔" گفتگو میں یہ موڑ خلافت اسلامی کی سیاسی یا مذہبی حیثیت پر بحث کے تناظر میں آیا تھا۔ وفد کے ترجمان سید حسن امام صاحب نے اس کا جو جواب دیا اس

پر قاضی صاحب نے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا ہے۔ ان ہی کے الفاظ میں سنیے: "ہمارے ترجمان نے وزیر اعظم کی جادو بیانی سے بار بار دھوکا کھایا۔۔۔ انڈین نیشنل کانگریس کے سابق پریسیڈنٹ نے فرمایا کہ "اگر آپ ہم کو اس امر کا یقین دلادیں۔۔۔ اور اگر برطانوی سلطنت میں مسلمانوں کے مذہبی جذبات ملحوظ رکھے گئے اور ان کو تسکین قلب دی گئی تو کیا وہ پھر بھی کسی دوسری گورنمنٹ کے تحت میں رہنا چاہیں گے؟ وہ کیوں ایسا چاہیں گے؟ وہ تو خود ایک ایسی حکومت کے تحت میں زندگی بسر کرنا پسند کریں گے جو ان کے مذہبی محسوسات میں ان کو آزادی دیتی ہے"

حیران ہوں کہ سید صاحب کہاں سے کہاں پہنچ گئے! صاحب موصوف نے شاید سمجھا ہو کہ ان الفاظ کے ذریعہ سے وزیر اعظم کو وہ یہ اسلوبِ احسن بتا رہے ہیں کہ اگر طمانیت نہ دی گئی تو ہندستان آپ کی حکومت میں رہنا پسند نہ کرے گا لیکن واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی عجلت میں ہندستانی قوم پرستو کے بنیادی اصولوں پر ٹھوکر ماردی، ہوم رول اور سوراج کے سارے تخیل کو درہم برہم کردیا۔۔۔ سید صاحب نے ہندستان کی جدید قومیت کے سنگِ بنیاد پر بے تکلف ایک ضرب لگائی ایک پتے کے حاصل کرنے کے لیے سارے درخت کی جڑ اکھیڑنے کی کوشش کرنا ایک ذوقِ غلط اندیش کی دلیل ہے۔" اسی طرح کا ایک موقع اس وقت آیا جب مسٹر لائڈ جارج نے ترکوں کی "غلطیوں" اور "غلط کاریوں" کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "خود ان ترکوں نے جو (یہاں) آئے ہوئے ہیں مجھ سے کہا کہ ہم انور بے کے افعال کو قابلِ ملامت سمجھتے ہیں۔" اور بقول قاضی صاحب "ہمارے قابل وکیل نے ایک نہایت غیر ذمہ دارانہ بات کہی۔ انھوں نے فرمایا تو یہ فرمایا کہ "میں بھی نہیں کہہ سکتا کہ انور پاشا نے اپنی نسل کو (اپنے افعال سے) کوئی فائدہ پہنچایا۔ جب ۱۹۱۴ء میں اعلانِ جنگ ہوا تھا تو میں نے اسی وقت محسوس کیا تھا کہ یہ ایک غلطی ہے۔"

اس پر قاضی صاحب کا تبصرہ ہے "برطانوی وزیر اعظم کے سامنے ہم اس لیے نہیں گئے تھے کہ ترکوں کی خطا معاف کرائیں اور ان کو بھیک کے چند ٹکڑے دلوائیں ہم مسلمانانِ ہندستان کے ان مطالبات کو پیش کرنے گئے تھے جو سراسر حق و انصاف پر مبنی تھے۔ یہ بحث ایسی نہ تھی جن دکندا، پر مسٹر حسن امام کو ہمارے ترجمان کی حیثیت سے اپنی ذاتی رائے ظاہر کرنے کا حق حاصل ہوتا۔" قاضی صاحب نے اس پر بھی حیرت اور افسوس کا اظہار کیا ہے کہ

حسن امام صاحب نے ہندستان واپس آکر بیان دیا کہ "وزیر اعظم نے مسلمانوں کی عرض داشت کو ہمدردی کی نظر سے دیکھا اور اگر وہ ہندستانی مسلمانوں کی امید کو پورا نہ کرسکے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ ایسا کرنا نہ چاہتے تھے بلکہ وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ مجبور تھے۔"

انگلستان اور بعض دوسرے یورپی ممالک میں وفد کے اراکین کی (بہ استثنا، سرآغا خاں اور مسٹر حسن امام)، ان ترکوں سے ملاقاتیں ہوئیں جو وہاں مقیم تھے یا اس زمانے میں آئے ہوئے تھے۔ ان ملاقاتوں میں اسلامی اخوت اور مقصد کی ہم آہنگی کے جاں نواز اور روح پرور تجربے جانبین کو ہوئے۔ قاضی صاحب نے ان ملاقاتوں کا ذکر بہت والہانہ انداز میں کیا ہے جو اس قابل ہے کہ من و عن نقل کر دیا جائے لیکن طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ تاہم یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ قاضی صاحب نے صرف ترکوں کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ نہیں انھوں نے ان کی بعض خامیوں اور کوتاہیوں کی نشان دہی میں کبھی تامل نہیں فرمایا ہے۔ مثلاً انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ ترکوں نے اتحاد اسلامی پر پوری توجہ مبذول نہیں کی تھی بلکہ تحریک اتحاد تورانی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی تھی۔ ترکی کے سرکاری وفد کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ وہ "اپنی کمزوری کے علاوہ برطانوی اثرات کے تحت میں اپنی مجبوری و معذوری کو اس قدر محسوس کرتا تھا کہ اگر ہم سے دل کھول کر باتیں کرنا بھی چاہتا ہو تو ظاہر ہے کہ یہ امر اس کے امکان سے باہر تھا۔ وہ کوئی آزاد وفد تو تھا نہیں۔" اس کے برخلاف حریت پسند ترکوں کا وفد جسے قاضی صاحب نے انگورا کا وفد کہا ہے کہ ان کا مرکز انگورا ہی تھا، ان کے الفاظ میں "زبان بھی رکھتا تھا اور ہاز وبھی۔" اس وفد کے قائد بکر سامی بے تھے جن کے متعلق مسٹر لائڈ جارج کی رائے تھی کہ وہ "اپنے معاملے کو اچھی طرح پیش نہ کرسکے"، لیکن قاضی صاحب نے رائے قائم کی کہ "ان کی شخصیت کافی وزن رکھتی ہے" اور ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ "انگلستان کے اخبارات نے ان کی ہوش مندی اور معاملہ فہمی کا اعتراف کیا" اور انھوں نے "مخالفین کو بھی تحسین و آفرین پر مجبور کر دیا۔" سرکاری وفد کے قائد رشید پاشا کی بھی قاضی صاحب نے اس لیے داد دی ہے کہ انھوں نے "اپنی معذوریوں پر نظر کر کے مصلحت وقت کو محسوس کیا اور اپنی ضعیف العمری کا عذر کر کے گفت و شنید کے عام سلسلے کو بکر سامی بے کے سپرد کر دیا۔"

نقشِ فرنگ کے مطالعے سے قاضی عبدالغفار کی شخصیت کا جو نقش پردۂ ذہن پر ابھرتا ہے وہ ایک پین اسلامسٹ ہندستانی مسلمان کا نقش ہے چوں کہ حصولِ آزادی کے بعد علی گڈھ میں قاضی صاحب سے ذاتی طور پر نیاز حاصل رہا اس لیے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ان کے اس وقت کے سیاسی خیالات میں ہندوستانیت کا رنگ پین اسلامزم کے ایک خاص دور سے متعلق ہیں جن میں بعد میں خاصی تبدیلی ہوگئی تھی۔

قاضی صاحب کی دینی حمیت اور ان کے ایشیائی جذبۂ تفاخر کو اس وقت سخت ٹھیس لگی جب ان کا جہاز عدن پہنچا اور وہاں انھوں نے عدن کے سیاہ فام باشندوں کے افلاس اور اس افلاس سے پیدا شدہ رکاکت کا نظارہ کیا۔ اس کی منظرکشی انھوں نے بڑے دلدوز اور اثر آفریں انداز میں کی ہے، فرماتے ہیں: "عدن کے کوچہ بازار میں حبشی بہت سے تھے مگر میری آنکھیں اس "بلالیت" کو ڈھونڈھتی رہیں جو وہاں نہ تھی۔ بلامبالغہ سیکڑوں حبشی اور سیاہ فام عرب دیکھے کہ وہ شہر سے ساحل تک اور ساحل سے شہر تک مسافروں کے ساتھ بھاگتے ہوئے آتے تھے، شاید کہ ایک پیسہ مل جائے! جب ان کے ہاتھ خیرات لینے کے لیے بڑھتے تھے تو میں آسمان کی طرف دیکھتا تھا کہ اے کارساز! یہ ہاتھ جو آج خیرات لینے کے لیے بڑھ رہے ہیں کیا وہی ہاتھ ہیں جو صدیوں تک دینے کے لیے بڑھا کرتے تھے؟ یہی ہاتھ تھے جو اس ارضِ پاک کی حرمت کا جھنڈا لے کر اکنافِ عالم میں ڈنکے بجا آئے؟ دنیا میں طوفان لانے والے آج کیوں دنیا کے طوفان میں غرق ہیں؟

اے دُرّتابندہ، اے پروردۂ آغوشِ موج
لذّتِ طوفان سے ہے ناآشنا دریا ترا!"

جیسا کہ عرض کیا گیا، قاضی صاحب کا یہ سفر ۱۹۲۱ء میں ہوا تھا۔ اس کے ۳۵ سال کے بعد ۱۹۵۶ء میں (جو قاضی عبدالغفار کا سالِ وفات بھی ہے) جب راقم الحروف کا جہاز عدن سے گزرا تو وہاں کا نظارہ کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ عدن ان مقامات میں سے ہے جہاں برطانوی سامراج بہت دیر تک اپنے قدم جمائے رہا۔ میں نے ۱۹۵۶ء میں عدن میں عربوں کی جو حالت دیکھی، اس سے میرا دل بھی بہت متاثر ہوا تھا۔ وہاں کے باشندے اُس وقت تک افلاس اور

لاچاری کی تصویر بنے ہوئے تھے اور افلاس اپنے ساتھ جو خرابیاں لاتا ہے ان کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جو وہاں نہ پایا جاتا ہو لیکن الحمد للہ بالآخر مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں بیسویں صدی کے ہوائے حُرّیت" نے ان کی "غلامی کی زنجیریں" بھی کاٹ پھینک دیں اور اب عرصے سے عدن آزاد عالمی برادری کا ایک باوقار رُکن ہے۔ افسوس ہے کہ قاضی عبدالغفار یہ دن دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہے۔

قاضی صاحب کی اسلامیت اور مشرقیت کا ایک اور ثبوت ان کے اس تاثر سے ملتا ہے جو جہاز میں سفر کرنے والی یورپین اور ان کی نقّال ہندستانی پارسی و یہودی خواتین کی بے حجابی اور ناز و انداز کو دیکھ کر ہوا اور پھر جب انھوں نے ہندستان کی ایک رانی صاحبہ اور ان کی نوجوان صاحب زادی کی "پاکیزہ نسوانیت" کا مشاہدہ کیا تو انھیں کس قدر مسرّت و طمانیت ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں: "کرشموں اور تجلّیوں کا وقت ہمیشہ سے وہی ہے جب سورج کی روشنی باقی نہ رہے . . . شب کے دسترخوان پر جہاز کی ساری پونجی سفید کھال، باریک کپڑے، خوب صورت بال درخشاں جواہرات، ان سب کی ڈھیریاں لگی ہوتی ہیں۔ ہر کرسی پر ایک چھوٹی سی دکان ہوتی ہے اور اس دکان پر ہر قسم کی جنس رکھی ہوتی ہے . . . اس جلوہ گاہ میں چند پارسی اور یہودی خواتین بھی تھیں جن کو اپنی یورپین بہنوں سے ایک قدم بھی پیچھے رہنا گوارا نہ تھا۔ دن بھر اور رات کو بھی گیارہ، بارہ بجے تک ان خواتین کا پُرشور ہجوم عرشے پر رہا کرتا تھا . . . چیخنا صرف آواز ہی کا فعل نہیں ہے، کبھی کبھی بعض بہنوں کی وضع قطع گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختی ہے، ان کا لباس چیختا ہے، ان کی نگاہیں چیختی ہیں، ان کے موزوں کی باریکی اور جوتوں کی نزاکت چیختی ہے، ان کی ساڑیوں کا رنگ چیختا ہے۔ جنسِ لطیف کا یہ "غوغا" بازاروں کی عامیانہ چیخ و پکار سے اکثر سننے والے اور دیکھنے والے کے لیے بہت زیادہ دلدوز اور درد ناک ہوتا ہے۔ میرا تخیّل یہ ہے کہ عورت چیخ نہیں سکتی، شعر چیخ نہیں سکتا، بول سکتا ہے تصویر چیختی نہیں، مسکراتی ہے یا بسورتی ہے اور اگر اس کا رنگ و روغن چیخنے لگے تو پھر وہ نظر فریب نہیں" اس کے مقابلے میں رانی صاحبہ اور ان کی صاحب زادی کی کیفیت قاضی صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے۔ "اسی جہاز میں ایک ہندستانی رانی صاحبہ اور ان کی نوجوان لڑکی

بھی انگلستان جارہی تھیں۔ اس ہنگامے میں صبح سے شام تک وہ دونوں اپنی کرسیوں پر سب سے الگ بیٹھی رہتی تھیں۔۔۔ (میں) ایک طرف یوروپ کے تمدن و معاشرت کے تمام مصنوعات اور نقاشیوں کو دیکھا تھا، چیختی ہوئی۔۔ نسوانیت سے اکتایا اور بعض اوقات جھنجھلایا کرتا تھا اور دوسری طرف ہندستان کی ایک عورت اور لڑکی پر نظر جاتی تھی جو اس فریب نظر میں گھری ہوئی تھیں تاہم اس سے دور تھیں، بے پردہ تھیں مگر پردے میں تھیں، بے نقاب تھیں مگر نقاب بیں تھیں۔ حیا کا مفہوم اگر کچھ ہے تو اب بھی ہندستانی عورت کے وجود روحانی میں موجود ہے۔۔۔ جب اس ہنگامے میں رانی صاحبہ کو دیکھا تھا تو اپنے دماغ میں پاکیزہ نسوانیت کی ایک عجیب تصویر پاتا تھا۔" اقتباس طویل ہوگیا لیکن قاضی صاحب کی ذہنی کیفیت، ان کے ذوق لطیف اور ان کے پندارِ مشرقیت کو واضح کرنے کے لیے اس کا نقل کرنا ناگزیر تھا۔

مضمون میں مختلف مقامات پر "نقش فرنگ" سے جو اقتباسات دیئے گئے ہیں ان سے قاضی عبدالغفار کے حسن بیان کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے اور بعض جگہ طنز کی ہلکی سی جھلک بھی مل جاتی ہے۔ تاہم اس پہلو کو مزید اجاگر کرنے کے لیے چند اور اقتباسات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ وفد کی بمبئی سے روانگی کے وقت لوگوں کی عقیدت کا اظہار کس طرح ہورہا تھا اس کا نقشہ قاضی صاحب نے کتنی خوب صورتی سے کھینچا ہے۔" اگر ان پھولوں کو یک جا وزن کرسکوں جو میں نے اپنی عمر میں دیکھے یا استعمال کیے ہیں تب بھی ان کا مجموعی وزن ان پھولوں اور گل دستوں سے یقیناً کم ہوگا جو ۱۹ (فروری) کی صبح کو میرے جسم پر لادے گئے تھے۔۔۔ وہ ہار جو شب کی بے خودی میں مسل کر رہ گئے ہوں، وہ پھول جو اوّل شام کی بدمستیوں میں کچل گئے ہوں، وہ لڑیاں جو محبت سے گوندھی گئی ہوں اور بے پروائی سے توڑ ڈالی گئی ہوں، ان سب میں شراب کا سا نشہ ہوتا ہے، بدمستی ہوتی ہے بے خودی ہوتی ہے، کیفِ گناہ ہوتا ہے مگر دھوکا اور فریب نہیں ہوتا۔ آج جو پھول گلے میں پہنے جارہے تھے ان میں حظِ نفس ہی نہیں، فریب بھی تھا، پہننے والے کی خود فریبی اور پہنانے والے کی توہین بھی تھی۔ پجاری جب مندر میں اپنی مورتیوں پر پھول چڑھاتا ہے تو وہ پھول اس کی (دکھا) انکسارِ عبودیت کا مظہر ہوتے ہیں، معبودیت کے طمطراق سے اس کا نفس محظوظ ہوتا ہے لیکن اب جبکہ قومی زندگی کے چشموں کا پانی گندہ ہوگیا

ہے موجودہ ہنگامے میں ظاہر پرستوں نے جوشِ ملی کا معیار یہ قرار دیا ہے کہ بہت سے پھول ہوں، بہت سے ہار ہوں، اونچی آوازیں ہوں، تکبیر کے نعرے ہوں، جلوس کے ہنگامے اور تقریروں کے دریا بہیں۔ گویا کہ قومی جدوجہد کا فرض مین ادا ہو گیا!" ملاحظہ فرمایا آپ نے قاضی صاحب کی نظر حقیقتِ حال کی تہہ تک کس طرح پہنچی اور کیا آج تقریباً ستر سال گزر جانے کے بعد ہماری ملی زندگی کا حال اس سے کچھ بہت زیادہ مختلف ہے!

ہماری عوامی زندگی اور اجتماعی مزاج کے دکھاوے اور رخ، جن میں آج بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ہے، درج ذیل اقتباس سے واضح ہو جاتے ہیں اور ان سے قاضی عبدالغفار کے طرز تحریر پر بھی بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ عدن کی ایک ضیافت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"دعوت خوب تھی۔ یہ نہ سمجھ سکا کہ محض چاء کی دعوت تھی یا ضیافتِ شب یا دونوں کا مرکب تھا۔ غرض جو کچھ بھی تھا میرے لیے یہ صدمہ کافی تھا کہ کچھ کھا نہ سکا، وقت کم تھا اور سب سے مجھے اس دعوت کی خبر ہندستان کے اخبارات کو بذریعۂ تار روانہ کرنی تھی! دعوت کھانے سے زیادہ اس کی خبر کا شائع کرانا ضروری تھا، اس لیے کھانا اور کھلانا سب بے کار رہے اگر کھانے والے کے کھانے اور کھلانے والے کی دلدادہ کھلانے کا حال دنیا پر روشن نہ ہو جائے۔ ۔ ۔ سیٹھ چھوٹانی صاحب کو بہت تردد تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ضیافت کا پورا حال ہندستان کو معلوم نہ ہو سکے اور وفد کی قومی خدمات کی یہ بسم اللہ تفصیل کے ساتھ اخبارات تک نہ پہنچے۔"

دیکھا آپ نے قاضی صاحب کے طنز کی زد سے خود ان کا وفد اور اس کا سربراہ بھی محفوظ نہیں رہ سکا۔

لوگوں کے ذوقِ خود نمائی کی کیفیت کی عکاسی بھی کچھ کم دل آویز نہیں ہے۔ ملاحظہ فرمایئے یہ پیرس سے لندن روانگی کے وقت کا منظر ہے:

"جب دوسرے دن ہم لوگ روانہ ہونے لگے تو اسٹیشن پر بھی اخبار نویسوں کا ایک اچھا مجمع تھا، بہت سے فوٹو گرافر بھی ان کالے آدمیوں کی تصویریں لینے کے لیے آئے تھے۔ ہم سب بلا بلا کر کھڑے کیے جاتے تھے اور بار بار کھینچے جاتے تھے۔

میں اپنے احباب کی اداؤں میں محو تھا۔ کوئی صاحب جلدی جلدی ٹائی درست کر رہے ہیں اور ساتھ ہی کوٹ کی آستینوں پر بھی نظر ہے مگر گوشۂ چشم سے یہ بھی دیکھتے جاتے تھے کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا، کوئی صاحب مونچھوں کی نوک کو صحیح اور مناسب زاویے پر قائم کرنے کی سعی فرما رہے تھے، کوئی بزرگ اپنے چہرے پر ایک گہرے تدبّر کی شان پیدا کرتے تھے، ایک دوست کچھ نہیں تو ایک سنجیدہ مسکراہٹ کا نقش لبوں پر ثبت کرنا چاہتے تھے۔ غرض یہ کوششیں قابلِ دید تھیں۔ پھر لندن میں وہ انتظار کہ فرانسیسی اخبارات آئیں تو ان میں اپنی تصویر دیکھیں۔ مگر یہ نہ سمجھئے کہ اس میں خود بینی و خود نمائی کو ذرا بھی دخل تھا۔ اس قسم کے عامیانہ جذبات برطانوی وزیرِ اعظم کے معزز مہمانوں کے شایاں کب تھے۔ یہ سب تو خلافت کے لیے پروپیگنڈا تھا۔"

یہ خندۂ زیرِ لب کتنا تیکھا ہے اور میں نے جو شروع میں عرض کیا تھا کہ ایک سچے طنز نگار کی مانند قاضی عبدالغفار اپنے قریبی ساتھیوں بلکہ خود اپنے کو بھی بخشتے نہیں ہیں وہ کچھ ایسا غلط تو نہیں عرض کیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالمغنی

قاضی عبدالغفار بحیثیت ادیب

قاضی عبدالغفار ایک صاحبِ علم ادیب تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں سماجی اور سیاسی مسایل سے بھی گہری دل چسپی تھی ۔ اس دل چسپی کا عکس ان کی ادبی تخلیقات پر نمایاں تھا ۔ درحقیقت یہی عکس و اثر ان تخلیقات کو جان دار اور شان دار بناتا ہے، ورنہ محض جمالیات یا نثری فن کاری زیادہ سے زیادہ ایک بے لطف یا بے وزن ادبِ لطیف پیدا کرتی ۔ بلاشبہ قاضی عبدالغفار کی تحریروں میں اسلوبِ بیان کی چاشنی بہت نمایاں ہے، مگر اس کا تعلق اسلوب پرستی سے نہیں ہے، بلکہ یہ ایک طرفہ و عمدہ طرزِ اظہار ہے فکر و خیال کی شوخیوں کا، جس سے ذوق و شوق کی لطافت و نفاست عیاں ہے ۔

جس دور میں قاضی عبدالغفار نے قلم اٹھایا اس پر ایک طرف سیاسی و معاشرتی مسایل کا غلبہ تھا، تو دوسری طرف ان مسایل سے فرار اختیار کرکے جمالیات کے آغوش میں پناہ لینے کی کوشش تھی ۔ چناں چہ نام نہاد "ادبِ لطیف" کا غلغلہ اس کوشش کا آئینہ دار تھا ۔ اس صورتِ حال میں قاضی عبدالغفار نے توازن سے کام لیا، اس لیے کہ ان کا ذہن مرکب تھا ۔ وہ زندگی اور فن یا اخلاقیات اور جمالیات دونوں کے ادا شناس تھے، ان کا شعور بالیدہ اور مزاج تراشیدہ تھا ۔ درحقیقت وہ اپنی تہذیبی قدروں کے شیدا تھے، لہٰذا ان کی شایستگی وسیع النظری کے ساتھ ساتھ فکری پختگی پر مبنی تھی ۔ چناں چہ ان کی فن کاری میں ہرزہ کاری کے بجائے ہنرمندی کا رنگ تھا ۔

ادبی نقطۂ نظر سے قاضی عبدالغفار کی اہم تصانیف دو ہیں :

۱۔ لیلیٰ کے خطوط
۲۔ مجنوں کی ڈائری

بہ ظاہر یہ دو مستقل بالذات کتابیں ہیں، پہلی کتاب مکتوب نگاری کی صنف میں ہے اور دوسری روز نامچے کی صنف میں، لیکن دونوں کا مواد و موضوع ایک ہی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک افسانہ ہے، جس کے دو حصے ہیں، یعنی ایک ہی ماجرا پر مشتمل ایک ناول دو جلدوں میں لکھا گیا ہے، ایک جلد میں لیلیٰ کے خیالات ہیں اور دوسری میں مجنوں کی کیفیات۔ یہ خیالات و کیفیات اس طرح ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہیں کہ اگر انھیں ایک ہی کتاب میں جمع کر کے مکالمے کی شکل دی جاتی تو ایک اچھا خاصا ڈراما بن جاتا۔ بہر حال دونوں کتابوں میں درج قصے کی جان وہ انشا پردازی ہے جس کا جوہر ہیروین اور ہیرو دونوں دکھاتے ہیں، اگرچہ اس میں ہیروین کا پلہ بھاری ہے اور اس کا کردار بھی زیادہ زوردار، کہنا چاہیے کہ مجنوں کی ڈائری لیلیٰ کے خطوط کی بازگشت ہے۔

دونوں کتابوں کی صنفی نوعیت پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ قاضی عبدالغفار کو افسانہ نویس، ناول نگار، یا مکتوب نگار اور روزنامچہ نویس ثابت کرنا اتنا اہم نہیں جتنا ان کے ایک ادیب ہونے پر زور دینا ہے۔ یہ ادبیت یقیناً کسی صنفِ ادب میں ظاہر ہوتی ہے، لیکن اس کا ظہور کسی علمی مضمون نگاری میں بھی ہو سکتا تھا۔ قاضی عبدالغفار کا مقصد کسی مخصوص صنف ادب کی آبیاری نہیں تھی، بلکہ وہ اپنے دور اور ماحول کے بعض موضوعات پر روشنی ڈالنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کے چند بیانات پر غور کرنا مفید ہوگا۔ "مجنوں کی ڈائری" میں "شرح کلام" کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لیلیٰ کے خطوط میں جو داستان میں بیان کرنا چاہتا تھا اس کے لیے موزوں طرز بیان وہی تھا جو لیلیٰ نے اختیار کیا۔ عورت کی مظلومیت کا افسانہ ہندوستان کے ماحول میں کسی شریف گھر کی بیٹی یا بہو کی زبان سے بیان ہونا ممکن نہیں تھا۔ لامحالہ ایک بازاری عورت کے قلم سے وہ عبرت انگیز حقائق بیان کرانے پڑے جن کو ذرا کم بے حجاب اور زیادہ سنجیدہ طرز بیان بے اثر اور بے معنی کر دیتا۔ . . . . . اپنے مقصد میں کس حد تک مجھے کامیابی ہوئی اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکیں گے جنھوں

نے "لیلیٰ کے خطوط" کو محض اس کی ادبی چاشنی کی خاطر نہیں بلکہ اس مقصد اعلیٰ کو پیش نظر رکھ کر پڑھا ہے جو لیلیٰ کے قلم کی روانی میں بہری ساری داستان گوئی کی روح رواں ہے۔" (ص ۶)

آ گے چل کر "مجنوں کی ڈائری" کے بارے میں بھی اظہار خیال کرتے ہیں :

"یہ روزنامچہ بھی اُس قسم کی ایک کوشش اور ایک قلمی تصویر ہے، جس میں عہد جدید کے ایک ہندوستانی نوجوان کی معنوی کیفیات کو بے نقاب کرنے کے چند پہلو پیدا کیے گئے ہیں۔ محض ادبی نقاش نہ لیلیٰ کے خطوط کا مقصد تھا نہ روزنامچہ کا ہے۔۔ . . . . مختصر یہ کہ ان اوراق کی چادر میں چند مقاصد اور حقائق لپٹے ہوئے ہیں۔"

(ص ۶۔ ۷)

فی الواقع اس شرح کلام میں قاضی عبدالغفار نے اپنی ادبی کاوشوں کے موضوع و مقصد کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے، خود ہی کہتے ہیں :

"اس تمہید کے بعد چند الفاظ میں عرض کر دوں کہ میرا موضوع ہے کیا؟ دورِ جدید کے وہ نوجوان جو تعلیم یافتہ کہے جاتے ہیں اور جو زندگی کی کش مکش سے فارغ رہ کر اپنے جذبات اور محسوسات کی زنجیریں کھول دیتے ہیں ہمہ تن ایک جہل مرکب بن جاتے ہیں اور زندگی کے مسلمات سے بے نیاز اور بے خبر ہو کر اپنے لیے جہل مطلق کی ایک نئی دنیا بنا لیتے ہیں، اس بے علمی کے ساتھ ساتھ جس کا نام ہمارے ملک میں تعلیم رکھا گیا ہے، نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اپنے مرکز ثقل سے ہٹتی جاتی ہے، اس کا توازن فنا اور اس کی زندگی میں ایک خوف ناک انتشار پیدا ہو رہا ہے۔ صحیح تربیت کے بغیر ایک ایسی تعلیم جو مشرق و مغرب کے بہت سے علوم کا ایک نامکمل اور غیر مرتب مرکب ہو، یا تو ایسے جانور پیدا کرتی ہے جو کسی نہ کسی طرح دو وقت کی روٹی کماتے ہیں اور مر جاتے ہیں یا ایسے نوجوان پیدا کرتی ہے جو عقل اور مذہب دونوں سے برگشتہ ہو کر زندگی کا مقصد صرف اتنا جانتے ہیں کہ ادنیٰ جذبات کی لگام ڈھیلی چھوڑ دیں اور جوانی کے گرم خون کو اور بھی زیادہ گرم ہو کر دوڑنے دیں۔" (ص ۸۔ ۹)

یہ سطریں ایک عصری حسیت و معنویت رکھتی ہیں، حالاں کہ آج سے دھائیوں پیشتر ۱۹۳۴ء میں لکھی گئی تھیں۔ اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ادیب کی حیثیت سے قاضی عبدالغفار ایک حقیقت پسند اور بصیرت مندذہن کا رکھتے، جو صاحب طرز ہو یا نہ ہو، صاحب فکر ضرور تھا اور اپنے ماحول کا صحیح تجزیہ کر سکتا تھا۔ مذکورہ بالا شرح کلام میں آگے چل کر قاضی عبدالغفار نے بہ یک وقت بے جا قدامت اور بے مہار جدیدیت دونوں کی مذمت کی ہے۔ وہ جس طرح "اجتہادات کا دروازہ بند" ہونے کے قابل نہیں اسی طرح محض "شخصی اجتہاد" کو "غیر متوازن اجتہاد" قرار دیتے ہیں۔ دراصل قاضی عبدالغفار ہر قسم کی انتہا پسندی کے خلاف ہیں اور سلیقے کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے ایک جادۂ اعتدال کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

"مذہب والے ان کو ملعون و مردود کہہ کر دھتکارتے ہیں اور دنیا والے ان کو دو وقت کی روٹی کمانے نہیں دیتے۔ ہر طرف سے تنگ آکر وہ یا تو مذہب والوں کی خامیوں کو مذہب سے منسوب کر دیتے ہیں اور دہریہ اور منکر ہو جاتے ہیں، یا تعلیم دینے والوں کے تمام عیوب کو علم سے منسوب کر کے معاشیات و اقتصادیات کے موجودہ نظام سے بغاوت کرتے ہیں اور سوشلزم کے جھنڈے کے نیچے زندگی کا ایک نیا نقشہ بنانے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں، مذہب اور دنیا کی مسلمہ اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو کر وہ بے تکلف اپنے تمام اضطراری جذبات کی کارفرمائی کو زندگی کا مقصود قرار دے لیتے ہیں، اور یوں اس انتہا یا اس انتہا پر اپنی زندگی کو ختم کرتے ہیں۔"

(ص ۱۱)

اپنے وقت کے "ایک نوجوان کی معنوی زندگی" کا جو نقشہ قاضی عبدالغفار نے سطور بالا میں کھینچا ہے اس سے اس دور میں ان کی عقل سلیم کا اندازہ ہوتا ہے جب ادب میں نام نہاد ترقی پسندی کی دھمک سنی جا رہی تھی اور وہ ان سطور کی تحریر کے دو سال بعد ہی ظہور میں آ گئی۔ اب دیکھیے کہ یہ نوجوان ترقی کی طرح عشق کی بھی حدود سے واقف ہے اور مجنوں کہلانے کے باوجود اپنے جنوں پر خود کے جامے سے باہر آنے کے لیے تیار نہیں۔ ۱۱ ستمبر کے روزنامچے میں وہ محبت کے متعلق اپنے حقیقت پسندانہ رویے کا اندراج حسب ذیل لفظوں میں کرتا ہے:

"حسین عورت کی محبت دل اور دماغ اور جسم کے تمام قویٰ کو متاثر، ماؤف اور مجبور کر دیتی ہے، مگر معدہ اور آنتیں اپنی آزادی اور خود مختاری اس حال میں بھی قائم رکھتی ہیں! عشق کا کتنا ہی شدید حملہ ہو مگر بھوک ضرور لگتی ہے اور رنج بھی لگے تو بھی کھائے بغیر مفر نہیں، تقاضا ہو یا نہ ہو معدہ اور آنتوں کو ان کا خراج ہر حال میں ادا کرنا ہی ہوتا ہے! عشق کی شہنشاہیت کو آنتیں کسی طرح قبول نہیں کرتیں! جو لوگ اس حقیقت کو یاد رکھتے ہیں وہ حسن پرستی کی زندگی کو اپنے لیے قدرے آسان بنا لیتے ہیں۔" (ص ۱۰۶)

کہا جا سکتا ہے کہ یہ اندازِ نظر کلبیت (Cynicism) پر مبنی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک جمال پرست افادیت پسند بھی ہے، جس سے قدرے بوالہوس اور عیش کوشی و نشاط پرستی کی غمازی ہوتی ہے۔ لیکن اس رویے میں ایک اعتدال کا پہلو ضرور موجود ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ مجنوں مجذوب بننے کے لیے تیار نہیں، اس لیے کہ اس کا عشق زندگی کی بنیادی حقیقتوں اور فطری صداقتوں سے صرف نظر نہیں کرتا۔

بہر حال، روزنامچے کا مجنوں شکست آرزو سے دوچار ہے اور وہ ہر چیز کو شبہے کی نگاہ سے دیکھتا ہے اگرچہ یہ تشکیک پسندی (Septicism) ہر قسم کی زیادتیوں اور انتہا پسندیوں کے مقابلے میں ہے۔ ۱۹ ستمبر کا ایک اندراج عصر حاضر میں مذہب اور سائنس کی کش مکش پر دونوں کی شدتوں کے مدنظر اس طرح تبصرہ کرتا ہے:

"علم کی اس ترقی اور عقل کے اس ارتقا کی بدولت جو کام پہلے مذہب کرتا تھا وہ اب سائنس انجام دیتی ہے، اوّل تو مذہب نے انسانوں کو انسانوں سے لڑایا، خون کی ندیاں بہائیں، مخلوق کو بھوکا مارا۔ کسی طرح مذہب کا زور ٹوٹا تو اب سائنس کا عفریت میدان میں بل کھاتا ہوا آیا۔ پہلے اللہ اور رسول کا نام لے کر تہذیب اور انسان کے علم بلند کیے جاتے تھے اور ان علموں کے سایہ میں خون پیا جاتا تھا اور ہڈیاں چبائی جاتی تھیں۔ اب سائنس اور عقل کا دیوتا ہمارے دماغوں پر چھایا ہوا ہے۔ مفر کی صورت کوئی بھی نہیں!! یہ تو سب کہتے ہیں کہ سائنس نے انسان کو بہت فائدہ

پہنچایا مگر ثابت کوئی نہیں کر سکتا کہ فائدہ پہنچایا گیا۔"

ان جملوں سے مایوسی ٹپکتی ہے لیکن یہ گویا ایک دانش ور کا شکست فریب (Disillustion) ہے۔ وہ قدیم و جدید دونوں ادوار کے انحرافات (Perversions) اور تجربات سے بےزار ہے۔ بلاشبہ یہ ایک نہایت حساس انسان کا مبالغہ آمیز ردِ عمل ہے تاریخ انسانی کے ان احوال پر جو چند در چند اسباب و وجوہ کے تحت عدل و انصاف اور اعتدال و توازن سے بیگانہ ہو کر دنیا کے پردے پر رونما ہوئے۔ ایک ذہین ادیب کے احساس کی یہ شدت اس کے تخیل کو اس درجہ مہمیز کرتی ہے کہ وہ مستقبل کے متعلق ہولناک پیش قیاسیاں کرنے لگتا ہے:

"زندگی کا فلسفہ ہزاروں لاکھوں کتابوں سے لدی ہوئے الماریوں میں محفوظ ہے لیکن فلسفہ زیادہ اور زندگی کم ہے۔ کوئی دن آئے گا کہ فلسفہ ہی فلسفہ رہ جائے گا اور زندگی نام کو بھی نہ رہے گی۔ آدمی مشین بن کر رہ جائیں گے۔ آنکھوں اور کانوں اور ناکوں میں سائنس کے عمل کی نلکیاں ٹھسی ہوئی ہوں گی۔ عقل پر فلسفہ کا غلاف چڑھا ہوگا۔"

(ص۔ ۱۱۱)

مستقبل کی اس دہشت انگیز تصویر کشی میں ایک سنگین متانت ہے جو حالات حاضرہ سے مصنف کی آگہی اور اس کی دوربینی پر مبنی ہے۔ اس میں بنی نوع انسان کے لیے ہم دردی و غم خواری بھی مضمر ہے۔ ظاہر ہے کہ مجنوں کی ڈائری کے ایسے اندراجات محض ایک افسانوی شخصیت کی کردار نگاری کے لیے نہیں ہیں، بلکہ ان میں ان شخصیت کے خالق ادیب کا خونِ جگر بھی شامل ہے اور اس کی روشنی طبع اسے اپنے ماحول پر ایک تنقیدی نظر ڈالنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔

قاضی عبدالغفار کا یہی مجنوں ہے جس نے لیلیٰ کے خطوط بھی رقم کیے ہیں، خواہ ان خطوط کی سطور میں ایک مختلف کردار کی نفسیات کا پورا پورا لحاظ کیا گیا ہو، اس لیے کہ لیلیٰ کا خالق بھی وہی ہے جو مجنوں کا ہے اور اس نے اپنے تصنیف کیے ہوئے افسانوں کے ذریعے زندگی، زمانہ اور سماج کے متعلق اپنے مطالعات و خیالات کا ہی اظہار کیا ہے۔

اس حقیقی تناظر میں "لیلیٰ کے خطوط" کا تنقیدی تجزیہ مکتوب نگار کی ادبی حیثیت کو اچھی طرح آشکار کر دے گا۔ خطوط کے ذہنی پس منظر کی طرف ایک اشارہ اس مضمون کے شروع ہی میں کیا

جا چکا ہے۔ لہٰذا صرف چند اقتباسات کے اندازِ فکر اور اسلوبِ بیان کا ایک تنقیدی جائزہ کافی ہوگا۔

"آفتاب کی ایک شعاع اور ماہتاب کی ایک کرن بھی تم چاہو کہ اپنی ساری دولت دے کر خرید لو تو نہیں خرید سکتے! عورت کے قلب کی گرمی اور روشنی اس سے بھی زیادہ گراں ہے۔ یا مفت ملتی ہے یا نہیں ملتی۔" (ص ۶۷ سولہواں خط)

"میری زندگی کے بیابان ریگستان میں کیسے کیسے اونٹ گذرتے ہیں! پھر میں ان سب کی نکیل ہاتھ میں رکھتی ہوں کسی کو ایک قدم اِدھر یا اُدھر نہیں جانے دیتی! یہ کیا ہے اگر توازن نہیں ہے؟ یاد رکھو جس کا ارادہ قوی ہے اس کا توازن بھی صحیح ہوگا! ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی قوت ارادی زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔ خود ظالم کا ظلم مظلوم کے عزم کو قوت بخشتا ہے۔ جس کو تم عورتوں کی عیاری و مکاری کہتے ہو وہ تمہارے تیز پنجوں سے بچنے کے لیے زرہ بکتر ہے جس کو استعمال کرنا تم ہی نے ہم کو سکھایا ہے!

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست" (ص ۱۱۴ تیئیسواں خط)

"تم کہو گے میرا اتار چڑھاؤ بھی عجب ہے۔ کبھی بجلی بن کر چمکتی ہوں، کبھی بادل بن کر گرجتی ہوں، کبھی برستی ہوں تو برسے جاتی ہوں! —— کبھی آندھی کی طرح اٹھتی ہوں تو بڑھتے جاتی ہوں، کبھی پھول کی طرح مسکراتی ہوں اور کبھی شبنم کی طرح آنسو بن جاتی ہوں! —— ہنستے ہنستے رو دیتی ہوں، روتے روتے ہنسنے لگتی ہوں کچھ میرا ٹھکانا ہی نہیں، ابھی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں! تو ابھی گرمیوں کی دوپہر کی لو چلنے لگی۔" (ص ۱۶۸ چالیسواں خط)

"عورت کی زندگی اسی لیے تلخ ہوتی ہے کہ وہ بھول نہیں سکتی، مرد اسی لیے زیادہ مطمئن اور بے پروا ہوتا ہے کہ رات کی بات صبح کو بآسانی بھول جاتا ہے! شب بھر اپنے عیش کی عمارت بناتا ہے اور صبح کو ایک ٹھوکر سے اس کی دیواریں گرا کر اپنا راستہ لیتا ہے! درحقیقت مرد فطرتاً خانہ بدوش ہے اور عورت وطن پرست مرد ہر جگہ اپنا گھر بنا لیتا ہے، ہر جگہ اپنا دل لگا لیتا ہے اور عورت جس دیوار کے

سایے میں بیٹھ جاتی ہے، پھر اٹھ نہیں سکتی، وہیں سے اس کا جنازہ اٹھتا ہے اور
—— اگر اٹھ بھی جائے تو عمر بھر اس دیوار کے سائے کو نہیں بھولتی۔! باغوں میں
رہتی ہے، محفلوں میں جلوہ ریز ہوتی ہے، سمندروں کے طوفان دیکھتی ہے، بیابانوں
میں گذرتی ہے! اور پھر اسی دیوار کے سایے کو تلاش کرتی ہوئی آتی ہے! بھول
نہیں سکتی، تا آنکہ اس کو وہ نیند نہ آجائے جو دنیا کی ہر چیز کو بھلا دیتی ہے!"

(ص ۱۹۴ پینتالیسواں خط)

ان سطروں میں ایک عورت کی زخمی روح بولتی ہے، فریاد کرتی ہے، لیکن ان میں طنز جتنا بھی ہو تلخی نہیں۔ اس سے لیلیٰ جیسی ذہین خاتون کی بالغ نظری، فکری پختگی اور عملی تجربہ کاری کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ ہر حال میں عورت کی مجبوری اور مرد کی آزاد روی کی داستان بیان کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا کہ لیلیٰ کا مقصد فطرت زن کی نشان دہی کر کے سماج سے انصاف طلب کرنا ہے۔ آزادیِ نسواں (Women's Liberty) کا وہ پرچار نہیں جو ہم عصر مغربی معاشرے میں زور و شور سے ہو رہا تھا۔ اس صورت واقعہ کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ قاضی عبدالغفار نے لیلیٰ کے خطوط میں ایک روشن خیال، نہ کہ الٹرا موڈرن (Ultra Modern) خاتون کا خاکہ کھینچا ہے۔ اگر یہ ایک جدید خاتون بھی ہو تو خاتون مشرق ہے، نہ کہ خاتون مغرب۔ اسی لیے اس کی شوخی میں بے حیائی کا عنصر نہیں ہے اور گستاخی جیسی یا جتنی کچھ بھی ہے وہ ایک نا زیبا نہ عبرت ہے، نہ کہ بدتمیزی یا بوالہوسی۔ بہر حال، لیلیٰ خاتون خانہ نہیں، شمع محفل ہے، گرچہ اس کے خالق نے خود ہی واضح کر دیا ہے کہ لیلیٰ کا یہ کردار مشرق کے زوال پذیر معاشرے کی خامیوں اور خرابیوں کو طشت از بام کرنے کے لیے ہے۔

لیلیٰ کے کردار کے ساتھ ساتھ اس کی گفتار بلکہ طرز گفتار پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ ادیب کی حیثیت سے قاضی عبدالغفار کا جوہر پورے طور پر اسی میں کھلتا ہے۔ ان کا شیوۂ بیان، جو لیلیٰ کی زبان میں بروئے اظہار آیا ہے، اردو ادب کے لیے ایک خاص، ممتاز اور منفرد چیز ہے۔ اس اسلوب تحریر میں نفاست بھی ہے، لطافت اور متانت بھی، اور ظرافت و بشاشت اس کے علاوہ۔ یہ ایک شائستہ و شستہ طرز نگارش ہے، جس کی تازگی و شگفتگی سحر انگیز ہے۔ مصنف

کی دقت نظر یا باریکی خیال دقیقہ سنجی یا نکتہ دری پیدا کرتی ہے، جس کا زور و اثر الفاظ کے موزوں انتخاب اور تراکیب کے خوش نما استعمال پر مبنی ہے۔ تشبیہات، استعارات، محاورات اور امثال سے بھی بحسن و خوبی کام لیا گیا ہے۔ تلمیحات اور محاکات بھی نتیجہ خیز اور فکر انگیز ہیں۔ یہ بڑی اچھی طرح لکھی، سجی بنی کڑھی اور ترشی ہوئی نثر ہے، جس میں روانی، برجستگی، سلاست اور وضاحت پائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی ظرافت لسانی ہے جس میں بلاغت فصاحت کے ساتھ مرکب ہے۔ اگر اس میں جا بہ جا خطابت کی جھلکیاں ملتی ہیں تو اس سے جوش طبیعت کا پر قوت اظہار ہوتا ہے، نہ کہ کسی سیاسی شورش کا گمان۔ بعض اوقات کچھ شاعرانہ کیفیت ضرور محسوس ہوتی ہے، مگر یہ لیلیٰ و مجنوں کے عاشقانہ احساسات کا ایک فطری پرتو ہے۔

قاضی عبدالغفار کے اسلوب نگارش میں وہی ہمواری، استواری اور شوکت و صلابت ہے جو شبلی کے طرز بیان سے منسوب کی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس شیوۂ تحریر کی طرح پر مولانا ابوالکلام آزاد کے انداز بیان کا اثر پڑا ہو، اس لیے کہ "لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" کا طرز گفتار وہی ہے جو "غبار خاطر" کے صفحات سے عیاں ہے اور اس کے آثار و مظاہر آزاد کی تحریروں میں بہت قبل سے نمایاں ہو چکے تھے۔ اس تاثر کی ایک واضح علامت قاضی عبدالغفار کے افکار و خیالات کی وہ متین بے باکی اور انداز نظر کی شوخی بھی ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین کی خصوصیت ہے بحیثیت ادیب قاضی عبدالغفار کی روشن خیالی و باریک بینی پر آزاد کی ذہانت و فطانت کا پرتو بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے، خاص کر ان تصورات کے سلسلے میں جن کا اظہار قاضی نے سماج، مذہب اور سائنس کے متعلق کیا ہے۔ لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری کے احساسات کی قوت محرکہ اور مقصود اصلی ایک اصلاحی جوش اور تبلیغی شورش ہے جو اپنے مخصوص دور میں مولانا آزاد کی عالمانہ کوششوں کا ماحصل تھا۔ قاضی کے ادب میں علم کی چاشنی اور جمالیات میں اخلاقیات کی آمیزش بھی اس مکتب فکر سے تعلق رکھتی ہے جس کا سلسلہ عصر حاضر کے اردو ادب میں شبلی سے آزاد تک دراز ہے اور ابھی تک جاری ہے۔

قاضی عبدالغفار کی ادبی حیثیت کا تعین کرنے کے لیے یہ کہنا کافی ہوگا کہ ادب لطیف کی وہ تحریک جو ان کے دور میں چلی اس کے اندر اگر کوئی فکری مواد ہے اور اس کا کوئی مفہوم انسانی سماج

کے لیے ہوسکتا ہے تو وہ بیش تر قاضی عبدالغفار ہی کی انشا پردازی کا مرہونِ منت ہے، اس لیے کہ قاضی کے انشایے من کی موج کی طرح بے راہ یا بے سمت و جہت نہیں ہیں، بلکہ ان کا ایک سنجیدہ مقصد اور واضح رخ ہے، جب کہ اظہار و بیان کی وہ ساری لطافتیں اور نفاستیں ان انشائیوں میں موجود ہیں جو ادبِ لطیف نام کی کسی بھی چیز کے لیے سرمایۂ افتخار ہوسکتی ہیں۔ بلاشبہ ایک ادیب کی حیثیت سے قاضی عبدالغفار اردو کے سربرآوردہ انشا پردازوں میں ایک ہیں اور انشائیہ نگاروں کے درمیان اس لحاظ سے بہت ممتاز ہیں کہ ان کی تحریروں کا حسن و کمال عبارت آرائی اور جملہ بازی کے بجائے سوچے سمجھے ہوئے افکار و خیالات کے بے تکلف، دل نشین اور خیال انگیز اظہار پر مبنی ہے۔ قاضی عبدالغفار نے اس اردو نثر کے ارتقا میں ایک رول ادا کیا ہے جس کی فصاحت و بلاغت کا سلسلہ میر امّن کی "باغ و بہار" سے چلا اور نہ صرف جاری بلکہ ترقی پذیر ہے۔

شریف الحسن نقوی

لیلیٰ کے خطوط — ایک مطالعہ

اردو دنیا سے قاضی عبدالغفار کا پہلا تعارف ایک بے باک صحافی کی حیثیت سے ہوا۔ ایک ایسا صحافی جو فکر و خیال کی آزادی کا پرجوش نقیب اور انسانی روح پر عائد کی جانے والی غیر اخلاقی قید و بند کا زبردست مخالف تھا۔ ریاست حیدرآباد میں رہ کر جہاں ایک قدامت پرست سخت گیر جاگیردارانہ نظام کا دور دورہ تھا، انھوں نے آزادی تحریر و تقریر کا علم بلند کیا اور اپنے اخبار کے ذریعہ کشادہ دلی اور روشن خیالی کی تبلیغ کی۔

قاضی عبدالغفار اپنی اخباری تحریروں میں بھی ادبیت کی شان پیدا کر لیا کرتے تھے۔ پھر جب اپنی صحافتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ انھیں ادب سے بھی اتنی ہی گہری دلچسپی پیدا ہوئی تو وہ ایک صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے بھی سامنے آئے اور ان کی اس حیثیت کا بھی ملک گیر اعتراف ہوا۔

قاضی عبدالغفار نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کی ذمہ داریاں بھی انجام دیں اور یہ ذمہ داریاں انھوں نے ایسے وقت میں سنبھالی تھیں جب اردو زبان بے شمار مشکلات سے دوچار تھی اور تقسیم ملک کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بعض غلط فہمیوں نے ہندوستان میں اس کی بقا کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اس مشکل وقت میں انھوں نے جس پامردی سے اردو کی وکالت کی اور اس لسانی تعصب کے خلاف لڑائی لڑی جو اس کے درپئے جان تھا، اسے ان کی اس اخلاقی جرأت مندی کا عملی اظہار کہا جا سکتا ہے جو ان کی شخصیت کا جزو لاینفک تھی اور جس نے ان کی صحافتی اور ادبی تحریروں میں بھی قدم قدم پر اپنی جھلک دکھائی ہے۔

قاضی عبدالغفار کے ادبی کارناموں میں ان کی دو کتابوں کو بطورِ خاص شہرت اور مقبولیت ملی : "لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری"۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دونوں کتابیں اُسی طرح ایک دوسرے سے قریب اور متعلق دکھتی ہیں جس طرح علامہ اقبال کی دو مشہور نظمیں "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" باہم دگر مربوط ہیں اور جس طرح "شکوہ" میں علامہ اقبال کی شاعرانہ قوت "جوابِ شکوہ" کے مقابلے میں جو بعد میں لکھی گئی زیادہ موثر انداز میں ظاہر ہوتی ہے اسی طرح "لیلیٰ کے خطوط" میں "مجنوں کی ڈائری" کی بہ نسبت، جو بعد میں لکھی گئی، قاضی عبدالغفار کی ادبی صلاحیت زیادہ بھرپور شکل میں سامنے آئی ہے۔

ہم اس بحث میں پڑے بغیر یہاں "لیلیٰ کے خطوط" کا ایک مختصر تجزیاتی مطالعہ پیش کریں گے۔

"لیلیٰ کے خطوط" میں ایک ایسی طوائف کی داستان بیان ہوئی ہے جو اپنے پیشے کے جملہ تقاضوں سے روگردانی نہیں کرتی اور نہ اُن آداب کے برتنے میں جو اس کے پیشے کا لازمی حصہ ہیں، اسے کوئی ہچکچاہٹ ہے۔ وہ ایک پیشہ ور حسن فروش ہے اور اسی طرح سوچتی اور عمل کرتی ہے۔ اس کے تجربات نے اسے بتایا ہے کہ مرد، خواہ وہ کوئی بھیس بدل کر آئے عورت سے صرف جسم کا طالب گار رہتا ہے۔ اس کی نظر جسم کی خوبصورتی اور کشش پر مرکوز رہتی ہے اور عورت کے دل کے نہاں خانوں تک رسائی کی نہ وہ خواہش کرتا ہے اور نہ کوشش۔ عورت کا جسم خاص طور پر اس عورت کا جسم جو طوائف بن گئی ہے یا بنادی گئی ہے۔ ایک قابلِ خرید جنس کی طرح ہے اور مرد کی ہوسناکی اس جنس کی قیمت زر و مال کی صورت میں ادا کرنے پر قادر ہے ہوشیار دکاندار وہی ہے جو اپنی جنس کی قیمت زیادہ سے زیادہ وصول کرسکے۔ چنانچہ "لیلیٰ کے خطوط" کی ہیروئن لیلیٰ بھی اپنے خوبصورت جسم کی زیادہ سے زیادہ قیمت لگاتی ہے اور وصول بھی کرتی ہے۔

لیلیٰ کے پیشے نے اُسے دو طرح کی مادی آسائشیں فراہم کی ہیں۔ شہر بھر میں اس کی خوبصورتی خوش ادائی، خوش گفتاری اور خوش سلیقگی کی دھوم ہے۔ ہر عمر، ہر طبقے اور ہر ملک و مذہب کے لوگ اس کے چاہنے والوں میں شامل ہیں۔ لیلیٰ ہر ایک کی نفسیات سے بھی واقف ہے اور ہر ایک کی جیب کے وزن سے بھی۔ وہ اپنے چاہنے والوں کی نفسیاتی کمزوریوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتی ہے اور انھیں اپنے اشاروں پر نچاتی ہے لیکن خود اسے بھی ان کی خواہشات کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر

رہنا پڑتا ہے ۔ یہ قدرتی ہے کہ اس تک ہماری جیب دالوں کی ہی رسائی ممکن ہے جو کھلے ہاتھ سے اس کے لیے خرچ کر سکتے ہیں ۔

لیلیٰ بظاہر اپنی اس زندگی سے مطمئن ہے لیکن اس کے باطن میں اس زندگی کے خلاف ایک خاموش لیکن پرزور بیزاری اور نفرت ہمہ وقت سر اٹھاتی رہتی ہے ۔ اس کی زندگی نے اسے مرد اور اس کے محبت کے دعووں کی طرف سے بھی سخت متنفر کر دیا ہے چنانچہ اس کا پہلا خط ہی جو اس کے ایک نئے چاہنے والے کے خط کے جواب میں ہے، اسی برہمی اور تنفر کا حامل ہے۔ یہ نیا چاہنے والا ایک تعلیم یافتہ، غیر شادی شدہ نوجوان ہے جس نے اسے رات کے کھانے پر مدعو کیا ہے۔ جواباً لیلیٰ لکھتی ہے ۔

" میری زندگی میں آپ کا یہ عنایت نامہ اپنی قسم کا پہلا مکتوب نہیں ہے ۔ برسوں گذر گئے کہ میرے دن اور میری رات کا زیادہ حصہ اسی قسم کی خط و کتابت میں گذرتا ہے ۔ ۔
آپ نے کیوں اپنے مافی الضمیر کو الفاظ کے پردے میں چھپایا شرمانے کا کوئی محل نہیں!
یہی تو کہ آپ راہ و رسم پیدا کرنا چاہتے ہیں ۔ آپ نے صاف کیوں نہ کہا کہ آپ بھی میرے حسن کے خریدار ہیں ۔ ۔ ۔ بندہ نواز! کسی دکان پر جائیے تو استفسار و اشارہ سے قطع نظر کر کے گاہک کی طرح کھل کر سودا کیجیے ۔"

بظاہر اس خط میں بے حیائی کا عنصر غالب ہے لیکن دراصل یہ بے حیائی نہیں، اس کے پیچھے وہی غصہ، وہی برہمی اور بیزاری ہے جو اس کی پیشہ وارانہ زندگی کی پروردہ ہے اور جس نے تمام اخلاقی تصورات کو لیلیٰ کی نظر میں مشکوک کر دیا ہے ۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں یہ پوری کتاب لیلیٰ کی طرف سے لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہے اور یہ تمام خطوط اس کے اسی نئے تعلق کی داستان بیان کرتے ہیں ۔ اس داستان کا آغاز لیلیٰ اور اس نوجوان کے درمیان پہلی ہی رات جسمانی تعلق قائم ہو جانے سے ہوا ہے لیکن لیلیٰ کے لیے یہ کوئی نیا تجربہ نہیں، اس لیے وہ اسے چنداں اہمیت نہیں دیتی ۔ وہ اس کے ساتھ وقفے وقفے سے متعدد راتیں بسر کرتی ہے اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اس نوجوان کی شب باشی کی دعوت کو اس لیے رد کر دیتی ہے کہ اس رات وہ کسی اور گاہک سے وعدہ کر چکی ہے ۔ وہ نوجوان سے اس کے لیے معذرت

تو کرتی ہے لیکن کوئی بہانہ نہیں بناتی اور اپنی عدم دستیابی کی وجہ صاف بیان کردیتی ہے ۔ یہ صاف گوئی لیلیٰ کے کردار کا نمایاں وصف ہے، جو ہر جگہ ظاہر ہوا ہے ۔ غالباً یہ وصف لیلیٰ کی ہم پیشہ عورتوں کا خاصہ ہے ۔ مرزا رسوا کے ناول " امراؤ جان ادا " اور قاری سرفراز حسین کے ناول " شاہد رعنا " کی ہیروئنیں بھی لیلیٰ کی طرح صاف گو ہیں اور مختلف مردوں سے اپنے تعلقات کی پردہ پوشی خود اُن مردوں سے بھی ضروری نہیں سمجھتیں جو ان پر جان نچھاور کرنے کے دعوے دار ہیں ۔ یہ خیال کرنا درست نہیں ہوگا کہ قاضی عبدالغفار نے اپنی ہیروئن کے لیے یہ وصف مذکورہ بالا دونوں ناولوں کی ہیروئنوں سے، جو ان کے ناول سے پہلے لکھے جا چکے تھے، مستعار لیا ہے ۔ " لیلیٰ کے خطوط " کے دیباچے میں قاضی صاحب نے ناول کی ہیروئن سے اپنے ذاتی رابطے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے ۔ ان کی ہیروئن لیلیٰ " شاہد رعنا " اور " امراؤ جان ادا " دونوں کی ہیروئنوں سے زیادہ ذہین، پڑھی لکھی، مروّجہ سماجی نظام اور اس کے مرموزات سے زیادہ باخبر، انسانی نفسیات، خصوصاً مرد کی نفسیات اور عورت کے تئیں اس کے استحصالی رویّے پر کہیں زیادہ نظر رکھنے والی ہے ۔ کہنے کو تو وہ ایک طوائف ہے جو اپنے پیشے میں سرتا بہ قدم ملوث ہے لیکن ہم عصر زندگی کے تمام پہلوؤں پر، خواہ ان کا تعلق مذہب و اخلاق سے ہو، سیاست سے ہو، ادب و صحافت سے ہو، معاشرتی ماحول سے ہو، ناقدانہ نظر ڈالنے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔ اس نے اپنے خطوط میں اپنے عہد کی ریاکاریوں، منافقتوں اور خباثتوں سے جس طرح پردہ اٹھایا ہے، اُس سے اس کی غیر معمولی ذہانت اور درّاکی ثابت ہوتی ہے ۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں لیلیٰ ابتداءً اپنی مصروف زندگی میں اس نوجوان کی آمد کو چنداں اہمیت نہیں دیتی ۔ وہ اپنے حلقۂ تعلق کے دوسرے مردوں کی طرح اُس کے ساتھ راتیں گذارتی ہے اور اگلی صبح سب کچھ بھلا دینے کی کوشش کرتی ہے لیکن رفتہ رفتہ اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ دوسروں سے کچھ مختلف ہے ۔ اُس کے جسم سے وہ بھی بے گانہ نہیں لیکن وہ اس کے ذہن و دل پر بھی دستک دیتا ہے اور اسے پوری طرح اپنا لینا چاہتا ہے ۔ لیلیٰ اب تک محبت کے تمام دعوؤں کو مرد کی ہوس خیال کرتی رہی ہے لیکن یہ نووارد نوجوان جس انداز میں اظہارِ محبّت کرتا ہے اور اپنے دعوے کے اثبات میں اس کے ساتھ جو مدلّل بحثیں کرتا ہے، وہ لیلیٰ کو اس کے بارے میں ایک نئے انداز سے سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں ۔ قاضی صاحب نے یہ اہتمام کیا ہے کہ نوجوان کی طرف سے کبھی

جانے والی باتوں کا کہیں ذکر نہ آئے، صرف لیلیٰ کے خطوط سے یہ اندازہ ہو جائے کہ وہ کیا باتیں ہوں گی جن کے جواب میں یہ سب کچھ لکھا جا رہا ہے۔ یہ مشکل ٹیکنیک تھی لیکن قاضی عبدالغفار نے اسے بڑی کامیابی سے برتا ہے۔

نووارد نوجوان کے طرزِ عمل کی زد جب لیلیٰ کے اُن معتقدات پر پڑتی ہے، جنھیں اس کے سابقہ تجربات نے بہت راسخ کر دیا ہے تو وہ تلملا اٹھتی ہے۔ اسے اپنے تمام مزعومات اپنی جگہ چھوڑتے محسوس ہوتے ہیں لیکن اگر یہ مزعومات ہوا میں بکھر کر رہ گئے تو اس کا مطلب ہوگا نووارد کے سامنے اُس کی شکست اور اس وقت وہ ذہنی کیفیت کے جس عالم میں ہے، وہاں شکست کا تصور بھی ناگوار ہے۔ وہ پلٹ پلٹ کر نووارد پر حملہ آور ہوتی ہے اور اپنے اور اس کے تعلق کو ایسے نام دینے کی کوشش کرتی ہے کہ نووارد نوجوان کراہیت محسوس کرنے لگے اور اُس سے دور ہو جائے۔ یہ غالباً لیلیٰ کا یا اس کے اندر سانس لیتی ہوئی پیشہ ور عورت کا غیر شعوری فعل ہے۔ جہاں تک لیلیٰ کے فکر و شعور کا تعلق ہے وہاں نووارد بہت پہلے اپنے قدم جما چکا ہے۔

بہرحال نووارد اپنے ارادوں میں مخلص ہے اور اسی لیے اپنی راہ پر ثابت قدم۔ وہ سچے دل سے چاہتا ہے کہ لیلیٰ گناہ کی اس دلدل سے جس میں وہ سر سے پاؤں تک ڈوب چکی ہے باہر نکل آئے اور باعزت سماجی زندگی کی سرزمین پر قدم رکھے۔ وہ لیلیٰ کے نفسیاتی حملوں کا جن میں بسا اوقات رکاکت بھی شامل ہو جاتی ہے، صبر و ضبط سے مقابلہ کرتا ہے اور اس کی طرف سے غیر معمولی قوتِ برداشت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہ مظاہرہ لیلیٰ کو مزید مشتعل کرتا ہے لیکن اس کی سوچ کو متاثر بھی کر رہا ہے۔

جب نووارد نوجوان لیلیٰ کے سامنے شادی کی پیش کش رکھتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لیلیٰ کے مزعومات اس کے ذہنی تحفظات اور مرد کی طرف سے اس کے عملی تعصبات کا سر بفلک قلعہ بس اب زمین بوس ہوا۔ اس قلعے کا انہدام لیلیٰ کی مکمل شکست کے مترادف ہے لیکن وہ کرے تو کیا کرے قلعے کے مضبوط در و دیوار جن کی تعمیر میں اس کی زندگی کے کئی سال صرف ہو گئے تھے، ایک شدید زلزلے کی زد میں ہیں اور یہ زلزلہ وہی ضدی نوجوان لایا ہے جس کی آمد کو اس نے اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہ دی تھی کہ اس کی دکانِ زیبائش کے خریداروں میں ایک اور خریدار کا اضافہ ہوا۔ مگر یہ تو اب اس

کے دل و جان کی خریداری اور اُس کی دکانِ زیبائش کی مسماری کے درپے تھا۔
بے بسی کی حالت میں لیلیٰ کو ایک نئی ترکیب سوجھی۔ وہ نووارد نوجوان کے جذبات کی تحقیر سے دست کش ہو گئی بلکہ دبے دبے لفظوں اور مبہم اندازہی میں سہی' اس کی محبت اور اس سے اپنی انسیت کے اعتراف پر بھی خود کو آمادہ کر لیا اور اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ " راہ و رسم " کی موجودہ روش ہی کیوں نہ برقرار رکھی جائے۔ اس موقع پر لکھے گئے ایک خط کی چند سطریں دیکھیے:

" ہر عورت جو تمھارے بنائے ہوئے قانون کی خلاف ورزی کرے گی تمھاری نظر میں فاحشہ ہو گی۔ مرد کی اس شریعت محکم کی گرفت سے نکل کر ہم تم کہاں جا سکتے ہیں؟
بہتر یہ ہے کہ اس فسق و فجور پر ہی قناعت کرو۔ ہر شب مجھ سے بیاہ کر لیا کرو اور ہر صبح مجھے طلاق دے کر گھر چلے جایا کرو۔"

لیکن لیلیٰ کا یہ حربہ بھی کارگر ثابت نہیں ہوتا۔ وہ مجبور ہو کر اس ضدی نوجوان سے اس کی پیش کش کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے کا وعدہ کر لیتی ہے۔ اس وعدے کے پیچھے کچھ تو نوجوان کے غیر متزلزل اصرار کا جبر ہے اور کچھ خود اُس کی نئی سوچ کا۔ پھر ایک شدید ذہنی کش مکش بے چینی اور زناؤ کے عمل سے گذر کر وہ جس فیصلے پر پہونچتی ہے وہ بظاہر غیر متوقع نظر آتا ہے لیکن اس فیصلے سے اپنے نوجوان عاشق کو مطلع کرتے ہوئے لیلیٰ نے اسے جو خط لکھا ہے اس میں لیلیٰ نے اس فیصلے کا مدلّل جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس خط کے ایک ایک لفظ سے اس کی اندرونی کش مکش اور اس کی بے بسی کا اظہار ہوتا ہے جس میں وہ گھری ہوئی ہے۔
یہ فیصلہ ہے کسی دوسرے شہر میں منتقلی کا اور اس فیصلے کو وہ فوراً ہی عملی جامہ پہنا دیتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جب وہ اس کی نظروں سے دور ہو جائے گی تو اس کا نوجوان عاشق رفتہ رفتہ اسے بھلا دے گا اور کسی شریف زادی سے عقد کر کے نارمل زندگی گذارنے لگے گا۔ رشتۂ عقد پر ایک زہرخند کے ساتھ چبھتے ہوئے لفظوں میں اظہار خیال کرتے ہوئے وہ اسے یہ بھی مشورہ دے جاتی ہے:

" میرے بستر کی آرائشوں کے مالک تو میرے پوڈر سے ڈھکے ہوئے رخساروں سے اپنے ہونٹھ سفید کر لو۔ ایک شب، دو شب، ہزار شب، میرے مہمان

رہو۔ پھر تھک جاؤ تو گھر جا کر کسی شریف خاندان میں کسی نیک بخت لڑکی کو اپنا شریک زندگی بنا لو اور سیدھے حج کرنے چلے جاؤ۔ پھر تم سے زیادہ سچا مسلمان اور تم سے زیادہ نیک نہاد شریف کون ہو سکے گا"

لیلیٰ نے اپنے ضدی عاشق کو جس کی نیک نیتی کی وہ کسی حد تک قائل ہو چکی ہے یہ نہیں بتایا ہے کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ نئے شہر میں پہونچ کر اس نے جو وضع زندگی اختیار کی، اس میں ایک منتقمانہ پہلو بھی نظر آتا ہے اور ایک طرح کی اذیت پسندی بھی۔ اس کا یہ انتقام مرد کی ہوسناکی کے تئیں ہے لیکن اس کی زد اس کی اپنی ذات پر بھی پڑ رہی ہے۔ اب اس کے جسم کے خریداروں کی تعداد پہلے سے زیادہ ہے اور اس نے ان کے لیے خود کو زیادہ سہل الحصول بھی بنا دیا ہے۔ نتیجتاً تھوڑی ہی مدت میں اس کا حسن مرجھانے لگا ہے مگر وہ اس سے پریشان نہیں مطمئن ہے کہ اس کا تیزی سے ڈھلتا ہوا حسن جلد ہی ہوس پرست مردوں کی نظر سے اسے گرا دے گا اور وہ اس گھناؤنی زندگی سے جو وہ جی رہی ہے دور ہو جائے گی۔ اسے یہ بھی گمان ہے کہ اس کا وہ نوجوان عاشق بھی جس کی شادی کی پیش کش ٹھکرا کر وہ اپنا پرانا ٹھکانہ چھوڑ آئی ہے، اگر کبھی اُسے اس حالت میں دیکھے گا تو اُس کے سر سے بھی عشق کا بھوت اتر جائے گا۔

نوجوان کو اس نے اپنے نئے مستقر کا اتا پتہ نہیں دیا تھا لیکن وہ کسی طرح معلوم کر لیتا ہے۔ اس کا خط پا کر لیلیٰ قدرے حیران ہے لیکن اب اس کی جذباتی کش مکش دور ہو چکی ہے۔ وہ اسے ملنے آنے کی دعوت دیتی ہے اور ان کے باہمی تعلقات پھر بحال ہو جاتے ہیں۔

اب قصہ ایک اور موڑ لیتا ہے نوجوان کسی شدید عارضے میں مبتلا ہو جاتا ہے اور لیلیٰ کو اس کی تیمارداری کا موقع ملتا ہے۔ لیلیٰ کے لیے یہ ایک نیا تجربہ ہے۔ اور اس تجربے سے گذر کر اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے نوجوان عاشق نے نہیں، خود اس نے ایک نئی زندگی پائی ہو:

"جب عورت کے دل میں اپنی عزت کا احساس باقی نہیں رہتا، وہ خود اپنے وجود کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتی ہے تو یہی اس کی موت ہے۔ وہ اس موت کے بعد اس دنیا میں زندہ بھی رہے مگر عورت بن کر زندہ نہیں رہتی اور اگر اس حالت میں وہ محسوس کرنے لگے کہ ابھی اُس کے اندر عورت پن کچھ نہ کچھ خواب مرگ سے

بیدار ہو رہی ہے۔ گذشتہ چار ہفتوں کی تیمارداری کے بعد مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میری زندگی کی ظلمت میں ایک ایسی شعاع پیدا ہوئی ہے جو میرے وہم وگمان سے باہر تھی''

یہیں سے ایک آبرو باختہ طوائف کا واپسی کا سفر شروع ہو جاتا ہے اور وہ خود میں ایک غیر معمولی تبدیلی محسوس کرتی ہے۔ نوجوان کی طرف سے یہ یقین دہانی کہ اگر جسمانی تعلق اسے ناگوار ہے تو وہ اس سے دست کش ہوتا ہے' اس تبدیلی کے عمل کو اور تقویت پہونچاتی ہے۔ وہی لیلیٰ جس کا وجود نفرت کی تلخی سے بھرا ہوا تھا، محبت کے شیریں احساس کو اپنے رگ وپے میں دوڑتا محسوس کرتی ہے۔ وہی لیلیٰ جو بے دردی سے اپنے حسن کی دولت لٹاتی رہی تھی' اب اسے کسی کے لیے محفوظ کر لینا چاہتی ہے:

''اپنے باغ کے لاکھوں پھول میں تقسیم کر چکی۔ ایک چھوٹی سی کیاری میں چند پھول باقی رہ گئے ہیں۔ اب میں اپنے دل میں یہ خواہش پاتی ہوں کہ وہ کسی طرح سرسبز رہیں' مرجھا نہ جائیں''

اس طرح ایک گم راہ عورت کا یہ سفر گناہ اور آلودگی کے مراحل سے گذر کر نیکی اور پاکیزگی کی طرف مراجعت کے ساتھ اختتام کو پہونچتا نظر آتا ہے۔

کتاب کے مقدمے میں قاضی صاحب نے لکھا ہے:

''مجھ پر ظلم ہوگا اگر ان صفحات کو ناول یا افسانہ سمجھ کر پڑھا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کاغذی پیرہن میں خراب آباد ہندوستان کی نسوانی زندگی کے چند نقوش پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر اس بدنصیب ملک میں کچھ لوگ ان نقوش کے معنی سمجھ سکیں تو سمجھ لیں اور یہ بھی سمجھ لیں کہ جس وقت تک ہندوستان کی عورت کے ساتھ پورا انصاف نہ کیا جائے گا' سیاسی آزادی اور قومی ترقی کا ادّعا محض حرفِ غلط رہے گا''

ایک طرح سے قاضی عبدالغفار نے یہ کتاب اصلاحی نقطۂ نظر سے لکھی ہے لیکن کتاب کی ادبی اہمیت اس اصلاحی نقطۂ نظر میں نہیں ہے بلکہ اس کی خوبی یہ ہے کہ اپنے نقطۂ نظر کی پیش کش میں انھوں نے ناول نگاری کے فن کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔

کشمیری لال ذاکر

قاضی عبدالغفّار — "لیلیٰ کے خطوط" کی روشنی میں

قاضی عبدالغفار کے "لیلیٰ کے خطوط" کتابی شکل میں غالباً سن ۱۹۳۳ء میں چھپے۔ یہ اندازہ اس لیے لگا رہا ہوں کہ کتاب کے مقدمے کے نیچے ۴ دسمبر ۱۹۳۲ کی تاریخ درج ہے مقام لکھنؤ ہے۔ کتاب کو شائع نرگس پبلشنگ ہاؤس، میرٹھ نے کیا تھا۔ میں ان دنوں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا لیکن یہ کتاب میں نے آٹھ سال کے بعد پڑھی، جو سال پرنس آف کالج جموں میں پڑھائی کا میرا آخری سال تھا، اور اب میں اس کتاب کے بارے میں پچاس سال کے بعد بات کر رہا ہوں۔ میں اس تمہید کے پس منظر میں دو بڑے اہم پہلوؤں کی طرف اشارے کرنا چاہتا ہوں۔

پہلا یہ کہ "لیلیٰ کے خطوط" کا تاثر جنھیں میں نے پچاس سال پہلے پڑھا تھا آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے اور شاید اسی کارن میں نے اس سیمینار میں مختصر سی باتیں کرنے کے لیے اپنا موضوع "لیلیٰ کے خطوط" تجویز کیا تھا۔ مجھے خلیق انجم کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ انھوں نے مجھے اس کتاب کی زیراکس کاپی مہیا کروا کر میرا کام آسان کر دیا ورنہ یا تو مجھے موضوع بدلنا پڑتا یا پھر سیمینار میں شرکت کے لیے معذرت پیش کرنی پڑتی۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ آج سے لگ بھگ ساٹھ برس پہلے، جب یہ خطوط لکھے گئے تھے (اور نیرنگ خیال لاہور میں قسط وار شائع ہوئے تھے) سماج میں عورت کی وہی پوزیشن تھی جو آج ہے۔ ہندوستان کی کل آبادی کے آدھے حصے کی حالت میں، اتنا فرق تو ضرور ہوا ہے کہ اب اسے

"کمزور طبقے" کا نام دے دیا گیا ہے۔ یعنی مرد آج بھی طاقتور طبقہ ہی ہے۔ مرد کی فوقیت کم ہونے کے بجائے زیادہ تہہ دار اور پیچیدہ ہو گئی ہے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ خطوط لکھے گئے تھے بازاری عورت کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور دن کے اجالے میں مرد اس کے کوٹھے پر جانے کی جرات نہیں کرتا تھا۔ اب کوٹھے اجڑ گئے ہیں لیکن ان کی جگہ کوٹھیوں نے لے لی ہے۔ وہ کام جو رات کے اندھیرے میں کرنا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا آج دن کے اجالے میں بڑی بیباکی اور کھلے پن سے کیا جاتا ہے اور اسے اونچی سوسائٹی کا ایک Sofisticated انداز سمجھا جاتا ہے۔ ان خطوط کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں، اس زمانے میں نوجوان طبقے میں یہ خطوط بے حد مقبول تھے۔ ہندی ادب میں دلچسپی رکھنے والے بھی قاضی صاحب کی طرز نگارش سے بہت متاثر ہوئے چنانچہ پانڈے بچن شرما اگر نے جو ہندی کے ایک جانے پہچانے ساہتیہ کار تھے "چند حسینوں کے خطوط" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جو ہندی جاننے والے لوگوں نے بڑے دھڑے سے خریدی اور اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

میں نے قاضی عبدالغفار کی صرف دو ہی کتابیں پڑھی ہیں۔ ایک "لیلیٰ کے خطوط" اور دوسری "مجنوں کی ڈائری" کاش مجھے دوسری کتاب بھی کہیں سے دستیاب ہو جاتی تو میں ان دونوں کتابوں کے بارے میں بات کر سکتا۔ دراصل یہ دونوں کتابیں ایک دوسرے کو supplement کرتی ہیں۔ لیلیٰ کے بارے میں مجنوں کا ذکر کئے بغیر کچھ کہنا، ایک ایسا افسانہ لکھنے کے مترادف ہے، جس کا عنوان 'مرکزی خیال' آغاز تو سب دل آویز ہو لیکن کلائمکس کمزور ہو گیا ہو۔ بات تو ساری کلائمکس ہی کو ہے چاہے وہ افسانے کا ہو چاہے انسانی زندگی کا۔

قاضی عبدالغفار کی یہ تخلیق نہ افسانہ ہے نہ ناول۔ اس لیے اس کی پرکھ کے لیے کچھ نئے قسم کے اصول وضع کرنے ہوں گے۔ قاضی صاحب نے کتاب کے مقدمے میں خود اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"مجھ پر ظلم ہوگا اگر ان صفحات کو ناول یا افسانہ سمجھ کر پڑھا گیا حقیقت یہ ہے کہ اس کاغذی پیرہن میں خراب آباد ہندوستان کی نسوانی زندگی کے چند نقوش پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے،

اگر اس بدنصیب ملک میں کچھ لوگ ان نقوش کے معنی سمجھ سکیں تو کچھ نہیں اور یہ بھی سمجھ لیں کہ جس وقت تک ہندوستان کی عورت کے ساتھ پورا انصاف نہ کیا جائے گا سیاسی آزادی اور قومی ترقی کا ادعا محض حرف غلط رہے گا۔

لیلیٰ کے قلم سے جو خطوط لکھوائے گئے ہیں ان کا یہ مجموعہ نہ انشاء پردازی کی مشق ہے نہ زور قلم کا مظاہرہ ہے بلکہ ان خطوط میں وہ جو دیکھ سکتے ہوں، ان کے لیے لیلیٰ کا تبسم ایک فوارہ خون، اس کی بذلہ سنجی ایک فریاد، اور اس کی ظرافت ایک دھمی پکار ہے۔ اس کی شوخیوں میں اس کے دل کا درد مستور ہے، اس کی شرارتوں میں اس کی جراحتیں پوشیدہ ہیں! لیلیٰ کی زندگی کا فلسفہ اس قدر نفرت انگیز نہیں اس قدر درد انگیز ہے! وہ ہنس ہنس کر اپنے ان زخموں سے کھیلتی ہے جو اس کے وجود معنوی پر ناسور بن کر رہ گئے ہیں! اپنی مختصر داستان میں وہ اپنی ان لاکھوں بہنوں کی روداد زندگی بیان کرتی ہے جو اس ملک میں مردوں کی نفس پرستی پر قربان کی جاتی ہیں۔ لیلیٰ کی زندگی کا ہر نقش 'فریادی' ہے۔"

لیکن ان باون خطوط کو پڑھ کر (جنھیں اس کتاب میں یک جا کیا گیا ہے اور جو ایک عورت نے (جو اپنے آپ کو ایک عصمت فروش کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتی) دو سال کے دوران تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد، اپنے ایک گاہک کو لکھے ہیں۔ ایک کہانی مرتب کی جا سکتی ہے۔ کہانی کا لوکیل واضح نہیں ہے۔ لیکن لگتا ہے کہ یوپی کے کوئی سے دو شہر ہیں، جہاں اس وقت عصمت فروشی کے اڈے باقاعدہ موجود ہوں گے۔ لیلیٰ (جس کا اصلی نام کہیں بھی ظاہر نہیں ہوتا) ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے، جسے بائیس سال کی عمر میں محبت کا پہلا نشہ آور تجربہ ہوتا ہے۔ اس کی دوستی ایک تعلیم یافتہ نوجوان ممتاز سے ہو جاتی ہے جو اسے اپنی ہوس کا شکار بنا کر آخر اسے چھوڑ جاتا ہے۔ جب کوئی دو سال کے بعد لیلیٰ کو اس کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں، اس وقت وہ مجسٹریٹ کی کرسی پہ براجمان ہے۔ لیلیٰ کا ممتاز کے بعد کن کن مردوں سے واسطہ پڑا اور وہ ایک شریف زادی سے ایک طوائف کیسے بنی، خطوط میں اس نے اس قسم کی تفصیلات کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ لیلیٰ نے اپنے ان خطوط میں بنا کسی کا نام لیے ان مردوں کی کیٹی گریز کا کھل کر ذکر کیا ہے، جن میں بیشتر تعداد

ان مردوں کی ہے، جو شادی شدہ ہیں اور اس کے کوٹھے پر صرف جنسی تسکین کے لیے آتے ہیں ۔ لیکن اس حقیقت سے لگاتار انکار کیے جاتے ہیں کہ وہ صرف اس کے حسن کے گاہک ہیں ۔ اس گروہ کا ہر آدمی لیلیٰ کو نکاح کے لیے کہتا ہے تاکہ وہ اس کی ذاتی ملکیت بن جائے ۔ وہ ایسے مردوں کا مذاق اڑاتی ہے اور ان کی ملکیت بننے سے انکار کر دیتی ہے ۔ اس نے تیئسویں (۲۳) خط میں اس نئے عاشق کے لیے (جس کا نام کہیں بھی موجود نہیں ہے) جو بار بار نکاح کا پیغام لے کر اس کے پاس آتا ہے، اپنے عاشقوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے، جو مختلف اوقات پر اس کے پاس آتے رہے ہیں اور اسے نکاح کا پیغام دیتے رہے ہیں ۔ اس خط کا ایک اقتباس دیکھیے ۔ اقتباس کو میں اور بھی مختصر کر رہا ہوں ۔

" کل تو ازن والا خط ختم نہ کر پائی ۔ ایک پرانے جاننے والے تشریف لے آئے تھے اور میں ان کے تو ازن کا امتحان لینے میں مصروف رہی ! اس سلسلے میں مجھے اپنے عاشقوں کی ایک فہرست یاد آئی جو کچھ عرصہ ہوا میں نے مرتب کرنی شروع کی تھی ۔ ایک دن شام کو سخت بارش ہو رہی تھی عاشقان جانباز اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے پڑے تھے ، میں تنہا بیٹھی تھی ، اسی زمانے میں میرے ایک فدائی نکاح کا پیام لے کر صبح و شام آیا کرتے تھے ۔ بیٹھے بیٹھے میں نے سوچا کہ دنیا میں چھوڑ ہی کیا جاؤں گی لاؤ نکاح کے پیاسوں کی ایک فہرست مرتب کر لوں تاکہ میرے مرنے کے بعد ان موذیوں اور بیوقوفوں کو جو آج میرے وجود پر طعنہ زن ہوتے ہیں اور اپنی جنس کی بلند مقامی پر ناز کرتے ہیں ۔ یہ تو معلوم ہو کہ ان ہی کی بلند مقام جنس کتنے افراد عالی مقام اپنی سوسائٹی کے خود ساختہ اصولوں پر لات مار کر مجھے نکاح کا پیام دیا کرتے تھے ، شاید مردوں کے غرور کو اس فہرست سے کچھ ٹھیس لگے ! انھیں شرمانے کے لیے اس فہرست کا ایک ورق نقل کرتی ہوں ۔ اصلی ناموں سے تم کو کچھ غرض نہیں ، صفات کے متعلق اگر میرے مختصر اشاروں سے لطف اندوز ہو سکو تو سمجھوں گی کہ تمھارے اندر عقل کی ایک رمق باقی ہے ۔ بقدر اشک بلبل ، ناموں کے بجائے صرف نمبر لکھتی ہوں ۔ ان ہی نمبروں میں کہیں تمھارا نام بھی ہو گا !

یہ "لیلیٰ کا خاتمہ کلام ہے، اس کے ان عاشقوں کی بر فہرست جو اس کو نکاح کا پیام دیا کرتے تھے، ان مکار مردوں کے لیے ایک عبرت انگیز ورثہ ہے جو عورت کو بدنام کر کے اپنی جنس کا تفوق ثابت کیا کرتے ہیں۔ خود لیلیٰ نے مرتب کی لیلیٰ بنت لیلیٰ بنت لیلیٰ، پیشہ عصمت فروشی وطن ہندوستان ۔ سمجھدار زود فہم، چالاک، ذہین، شریر، بدمعاش، حرافہ ۔۔۔ ۲۲ برس کی بڑھیا کھوسٹ ۔ آج تاریخ ۱۹۳۱ بمقام ۔ قلمبند کی گئی ۔ تاکہ بعد وفات راقمہ ان نکاح کی خواہش کرنے والے عاشقوں کے لیے سند ہو!

۱۔ عورتوں کا شکاری ہمیشہ صبح کے وقت آتا ہے ۔ جب میری حرارت عزیزی کم ہوتی ہے امید کرتا ہے کہ کسی نہ کسی دن میرے کسی کمزور لمحے میں جیت جائے گا۔

۲۔ ڈیڑھ سو گھوڑوں کی طاقت والا عاشق! کوٹھے کے زینے پر بھاری قدم اس طرح ڈالتا ہے کہ گویا پولیس کا سب انسپکٹر تلاشی کا وارنٹ لے کر آ رہا ہے۔ حملہ براہ راست اور بخط مستقیم کرتا ہے، میرے دو چار طمانچوں، دس بیس گالیوں سے ذرا افسردہ خاطر نہیں ہوتا۔ کھائے جاتا ہے اور اپنی کہے جاتا ہے!

۳۔ سور کی طرح سر جھکا کر سیدھا حملہ کرتا ہے جھونک غضب کی ہوتی ہے ۔ اس کے راستے سے ذرا ہٹ جاتی ہوں تو اپنی جھونک میں گذرتا چلا جاتا ہے ۔ رک نہیں سکتا۔ اسی طرح اس کے حملوں سے ہر دفعہ بچتی ہوں!

۴۔ دیوانہ بیل! سر جھکائے، دم اٹھائے منہ سے جھاگ گراتا ہوا آتا ہے، کھال بہت موٹی ہے!

۵۔ جرأت رندانہ کا بہت بڑا ذخیرہ رکھتا ہے ۔ ایک دفعہ موٹر میں اس کے ساتھ ہوا کھانے گئی۔ عہد کر لیا کہ آئندہ فولادی زرہ بکتر پہنے بغیر ہرگز نہ جاؤں گی!

۶۔ بلی کی سی چمکتی آنکھیں جو اندھیرے میں زیادہ چمکتی ہیں، دبے پاؤں آتا ہے، نرم کھال کے اندر نوکدار پنجے چھپائے ہوئے اس طرح کونے میں آنکھیں نیچی کر کے بیٹھتا ہے جیسے بلی چوہے کے انتظار میں!

۷۔ رات بھر تاش کھیلتا ہے ۔سگرٹ پیتا ہے ۔صبح کو اخبار کا لیڈنگ آرٹیکل لکھتا ہے اور دوپہر کے بعد پھر میرے عشق میں مبتلا ہو کر اور بھی زیادہ سگرٹ پیتا ہے اور بھی زیادہ تاش کھیلتا ہے ۔

۸۔ بیمار ہے بیچارہ ! حکیم صاحب کے مطب سے اٹھ کر سیدھا میرے پاس آتا ہے ۔ مجھے دیکھتے ہی ضیق النفس کا دورہ پڑتا ہے اور واپس چلا جاتا ہے !

۹۔ میں اس سے عمر میں ایک ہزار برس بڑی ہوں ! پیدا ہونے سے پہلے بلکہ اپنے باپ کے پیدا ہونے سے پہلے مجھ پر عاشق ہو چکا تھا ۔

۱۰۔ مالدار، بھدا، بوڑھا، مثنوی زہر عشق اور گلزار داغ کے اشعار پڑھ پڑھ کر روتا ہے !

۱۱۔ نمبر ۱۰ سے مالدار زیادہ بھدا کم ۔ایک زوجہ محترمہ کافی الحال بلا شرکت غیرے مالک ! نکاح ثانی کی تمنا ہے ۔دس بارہ بچے پیدا کر چکا ہے ۔دس بارہ اور میری گود میں پیدا کرنا چاہتا ہے !

۱۲۔ باتونی ! مرتا ہے اور زندہ ہے ! نکاح بھی کرنا چاہتا ہے اور جب تک میں نکاح پر راضی ہوں ناجائز تعلقات سے بھی دستکش ہونا نہیں چاہتا ۔ہر حال میں مجھے چھوڑنا نہیں چاہتا ۔ ضدی مکھی کی طرح ہر وقت میرے کانوں میں بھنبھنایا کرتا ہے ! ۔

۱۳۔ بہت مہذب، معقول، سنجیدہ، علمی مذاق، رکھتا ہے ! فلسفہ جنسیت کا بہت مطالعہ کرتا ہے ۔مجھے بھی عورت اور مرد کے تعلقات کے متعلق ضروری مسائل سمجھاتا رہتا ہے !

۱۴۔ قوم کا لیڈر ہے ! شام کو جلسوں میں لکچر دیتا ہے ۔رات کو کھدر کا لباس پہنے میرے گھر آتا ہے ۔زنان بازاری میں قومی جذبات پیدا کرنے کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے ۔اپنی عشق بازاری کے ذریعے سے مجھے بھی قوم پرست بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے ۔

۱۵۔ سرخ، کبھی سفید، کبھی بھورا ۔ الو ۔ رنگ بدلتا رہتا ہے ۔دن بھر گھر میں لیٹا ہوا طلسم ہوشربا پڑھا کرتا ہے، رات کو میرے بالا خانے پر آکر بولتا ہے ۔تھوڑی سی افیون بھی کھاتا ہے !

۱۶۔ حضرت مولانا! کوٹھے پر نہیں آتے ــــ پیام بھیجا کرتے ہیں، میرے سر میں درد کی خبر سنتے ہیں تو تعویز بھیج دیتے ہیں۔ بظاہر اور فی الحال پدرانہ اور بزرگانہ شفقت فرماتے ہیں۔ اکثر میری موجودہ حالت پر اظہار افسوس فرمایا کرتے ہیں۔ سنا ہے کہ مجھے نکاح پر آمادہ کرنے کے لیے وظیفہ یا کوئی عمل شروع کرنے والے ہیں۔

۱۷۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی خوش رو خوش پوشاک، شرمیلا، جوش عشق کا اظہار زبان سے کم مگر قلم سے بہت زیادہ کرتا ہے۔ آدمی بُرا نہیں۔ ذرا بے وقوف ہے۔ عاشق بنتے بنتے اب وہ خاوند بننا چاہتا ہے بڑھتا آتا ہے! میں ہٹتی جاتی ہوں۔ وہ بڑھتا آتا ہے۔ ڈرتی ہوں کہیں پھنس نہ جاؤں! پیچھے دیوار ہے۔ سامنے وہ ہے، وہ بڑھتا ہی رہے گا، تو میں کہاں تک ہٹ سکوں گی۔ مجھے بھاگ جانا چاہیے!۔

خط میں لیلیٰ نے مردوں کی سترہ کیٹگریز بیان کی ہیں۔

آخری نمبر اسی نوجوان کا ہے جسے یہ تمام خط لکھے گئے ہیں۔

لیلیٰ اب پیشے کے لحاظ سے ایک بازاری عورت ضرور ہے لیکن اس کا شعور بڑا اسلجھا ہوا ہے۔ اپنے بارے میں وہ بار بار لکھتی ہے کہ وہ ایک حسن فروش فلسفی ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

"شام بستر کی چادر اور تکیوں کے غلاف سب بدلوا دیتے تھے۔ تم نے ایک روز خوب کہا تھا کہ اس بستر پر قسم قسم کے عشق مرکب کی بو آتی ہے! کبھی کبھی خوب کہتے ہو۔ ظریف ہو۔ مگر حیف کہ فلسفی نہیں نہیں، عاشق کو فلسفی ضرور ہونا چاہیے۔ غرض یہ کہ اس عشق مرکب سے گھنیا کر شام میں نے بستر بدلوا دیا تھا۔ ہائے تمھیں معلوم نہیں کہ اس بستر کا ہر تار کس قدر آلودہ ہے۔ تمھیں معلوم ہوتا تو میرے بستر پر کبھی قدم نہ رکھتے۔ میرے بستر کے تکلفات کو دیکھ دیکھ کر تم کیسے کیسے پیچ و تاب کھاتے ہو، گویا کہ یہ چادر کی ہر شکن میں تمھارا ایک رقیب پوشیدہ ہے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ کچھ غلط بھی نہیں! مگر تم ان احمقوں کو کیا کہو گے جو اس بستر پر آرام کرنے کے لیے مرے جاتے ہیں۔ گویا کہ وہ دوسروں کا منہ کالا دیکھ کر رشک کرتے ہیں کہ ان کا منہ کالا نہ ہوا۔"

قاضی عبدالغفار نے لیلیٰ سے سماج پر بڑے گہرے طنز کروائے ہیں اور طنز کے حملوں کے لیے خاص طور پر مرد کو چنا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں اپنی فوقیت کا اظہار کرتا ہے۔ طنز کا تیکھا پن دیکھیے۔ سولہویں خط سے ایک اقتباس ہے۔

"خدا کی پناہ! موسیقی نے جو دیوتاؤں کا جادو ہے اس کو بھی ہوس پرست مرد نے اپنے نفس کی جائداد بنا لیا ہے، وہ بازاری عورت کے حسن کی خوشہ چینی کرنے کے لیے موسیقی کا نام درمیان میں لاتا ہے۔ مگر موسیقی کا کیا ذکر وہ تو اپنی نفس پرستی میں بلا تکلف خدا کا نام بھی درمیان میں لاتا ہے۔ کسی نئی اور حسین تر عورت کو پہلو میں بٹھانے کی خواہش ہوتی ہے تو کہتا ہے خدا نے چار بیویوں سے نکاح کی اجازت دی ہے۔ گویا خدا نے اجازت دی ہے کہ تم میرا نام لے کر عیاشی کر سکتے ہو۔ غرض یہ کہ موسیقی اور فنونِ لطیفہ تو کجا مرد کی ہوسناکیوں نے تو خدا اور پیغمبر کے نام کو بھی آلودہ کیے بغیر نہ چھوڑا۔"

"بس یاد رکھو کہ ایک عورت ایک مرد کے لیے کافی سے زیادہ ہے! کاذب اور مکّار ہے وہ شخص جو اپنی بے لگام نفس پرستی اور تعددِ ازدواج کے لیے یہ دلیل لاتا ہے کہ ایک مرد کو ایک عورت کافی نہیں۔ ایک ذلیل اور بازاری عورت کو اگر خودستائی اور پندار کا طعنہ نہ دو تو میں کہوں کہ میں اب بھی ان لوگوں سے بالاتر ہوں جن کی تسبیح کے دانوں میں دل کی سیاہی جذب ہو چکی ہے۔ میں صرف مردوں کی نفس پرستی کا ذریعہ اور اپنی معاش کا وسیلہ ہوں۔ خود نفس پرست نہیں ہوں اور کبھی مجھ پر کوئی ساعت ایسی گذرتی ہے تو میرے پاس قلم نہیں اور زبان نہیں کہ اس لمحہ کی حالت تم کو بتا سکوں"۔

رہنماؤں پر طنز کرتے ہوئے دسویں خط میں لیلیٰ نے یوں کہا ہے۔

"اس زمانے میں قومی لیڈری کے لیے صرف ایک لمبی زبان اور بڑے سے نقّارے کی ضرورت ہے جو کوئی کچھ عرصہ تک اخباروں میں چھپتا رہے وہ بڑی آسانی سے لیڈرِ قوم بن جاتا ہے۔ تم بھی اگر کہیں چھپ جاؤ تو رہنمائے ملت ہو جاؤ گے، یہ انقلاب جنسیت کچھ مشکل نہیں، مطبع کی سیر آدھ سیر سیاہی اور دو چار پتھر، ان دونوں

کام کب لیڈر ہوتا ہے اگر ہندوستان کے بزرگان ملت میں سے کوئی صاحب اپنی سارنگی میں ایک تار کا اضافہ کرنا چاہیں تو میں ان اوراق کا حق تصنیف ان کی نذر کرسکتی ہوں ۔"

اسی خط میں گناہ کی تشریح یوں کی ہے قاضی صاحب نے ۔

"کبھی تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ گناہ کس کو کہتے ہیں ؟ گناہ اس برے عمل کو کہتے ہیں جو چھپا نہ رہے اور ظاہر ہو جائے ، جو گناہ چھپا رہے وہ گناہ نہیں ہے ! تمہارے اخلاقی دستور العمل میں رسوائی گناہ ہے ، گناہ اگر راز ہو تو اس کا جواز ثابت کیا جاسکتا ہے ۔ اگر جذام کے داغ لباس کے نیچے چھپے ہوں تو تم ہرگز جذامی نہیں ہو ۔ عیب تو صرف وہ ہے جو ظاہر ہو جائے ، تمہارے اخلاق کی عمارت کا سب سے بڑا ستون اشتہار ہے ۔ لیکن مرد اپنی زندگی کے اس دائمی فریب سے قطع نظر کر لیتا ہے اور عورت کی مکاری اور عیاری کی داستانوں سے دنیا کے کان بھر دیتا ہے ، شاید تمھیں بھی میرے ہر لفظ سے بوئے مکر آئے گی ۔"

لیلیٰ کی زندگی میں ایک موڑ ایسا آجاتا ہے جب تنہائی کا تلخ احساس اس کی روح پر چھا کے لگتا ہے اور اس کا تمام ماضی زندہ ہو کر اس کے سامنے آجاتا ہے ۔ احساس کی یہ کربناکی ملاحظہ کیجیے ۔

"رات میری خواب گاہ میں کوئی نہ تھا ۔ مگر ایک شمع جو فرش پر رکھی ہوئی جل رہی تھی کچھ سوچتے سوچتے میری نظر اس شمع پر پڑی ۔ نظر پڑی اور وہیں جم گئی ۔ میں اس حالت میں تھی کہ نہ سو رہی تھی ۔ آنکھیں جھپک رہی تھیں مگر دماغ ہوشیار تھا ۔ کمرے کی تاریکی میں شمع کی لو گویا سیاہ چادر کا ایک شگاف تھا ، ایک حلقہ تصویر تھا ۔ جس سے باہر کی روشنی نظر آ رہی تھی ۔ اس روشنی میں کچھ متحرک اجسام بھی تھے ، ہر تصویر اس دریچہ کے سامنے سے گذرتی تھی اور میں اس کو پہچانتی جاتی تھی ۔ یہ میری استانی کا کمرہ ہے اس کے دروازے پر میں اپنی گڑیا سنبھالے کھڑی ہوں ایک حسین عورت مجھے بلا رہی ہے وہ میری ماں ہے ۔ ایک خوشرو متین اور دراز قد شخص میری طرف آرہا ہے وہ میرا باپ ہے ۔ یہ خوبصورت عمارت میرا اسکول ہے ۔ ہم کہیں جا رہے ہیں

ریل کا اسٹیشن ہے۔ میرے والد کے ساتھ ایک خوش رو نوجوان ہے مردانہ حسن کی ایک تصویر جو ہنوز مکمل نہ ہوئی تھی۔ یہ میرا منگیتر ہے جس کے ساتھ میری جوانی اور میرا بڑھاپا گذرنا چاہیے تھا۔ میں اس کی طرف نیچی نگاہوں سے دیکھ رہی ہوں اس کو گویا کہ دیکھ نہیں رہی میرے جسم میں ایک ناقابل بیان لرزہ ہے آغاز زندگی کی اس لرزش کا ترجمہ قلم اور زبان کی طاقت سے باہر ہے۔ عورت کی جوانی کی وہ پہلی لرزش تھی۔ جو اس دن اسٹیشن پر میرے جسم میں پیدا ہوئی! مرد عورت کی اس کیفیت سے کبھی واقف نہیں ہو سکتا۔ شمع کی لو بھی لرز رہی تھی پھر ایک بائیس سالہ جوان رعنا اس دریچہ کے سامنے سے گذرا۔ یہ میرا پہلا مرد ہے۔ جس نے مجھے عورت بنایا، مگر بیوی نہ بنایا۔ جس نے مجھے میری شاخ سے پھول چنکر چند روز گلے کا ہار بنایا اور پھر مسل کر بدرو میں پھینک دیا۔ جس ظالم نے میری دوشیزگی کو وہاں پہنچا دیا جہاں تم اب دیکھ رہے ہو۔ جس نے مجھے وہ بنا دیا جو میں اب نظر آتی ہوں اکھڑکی میں سے ہوا کا ایک جھونکا آیا، شمع کی لو کانپی اور گل ہو گئی! میری آنکھ لگ چکی تھی! تاہم فانوس خیال کا یہ پیکر دماغ کے کسی گوشے میں جہاں غیر کا تخیل نہیں پہنچ سکتا کوئی ایسی تصویر چھپائے رکھتا ہے جو میری گذری ہوئی زندگی کی مکمل تصویر ہے۔ محبت کے اس محفوظ سرمایہ میں میرا کوئی شریک نہیں، رات میں نے شمع کی لرزتی ہوئی لو میں پھر ایک دفعہ وہ تصویر دیکھ لی۔ گویا میں پھر اپنی پہلی زندگی میں ـــــ دوشیزگی کی زندگی میں واپس چلی گئی ہوں ـــ لیکن صبح کی روشنی میں میری یاد کے اس خزانے پر اژدھے بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جن میں سے ایک تم بھی ہو! اس خزانے تک میں پہنچ نہیں سکتی تم لوگ وہاں مجھے پہنچنے نہیں دیتے۔ اپنی حسن پرستی کے ہنگاموں سے تم نے میرے تخیل کے راستے تک بند کر دیئے ہیں۔ تمہاری عشق بازیوں میں مجھے اس کی بھی فرصت نہیں کہ خلوت میں ایک لمحہ فارغ ہو سکوں۔ صبح آنکھ کھلی تو شمع ختم ہو چکی تھی اور سورج کی شعاعیں فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ شمع کس قدر جلد پگھلتی ہے جس قدر تیز جلتی ہے اسی قدر جلد ختم ہو جاتی ہے۔ میری زندگی کی شمع اب بہت تیز روشن ہے اور

انشاء اللہ بہت جلد گل ہو گی' اپنی زندگی کو دونوں ہاتھوں سے لٹا رہی ہوں' تم اور
تم جیسے سب آئیں اور مجھ خانہ برانداز زندگی کی پونجی کو جلد سے جلد لوٹ لیں! یہ سرمایہ
میری گردن پر ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے - لوٹ لو - جس قدر لوٹ سکو - مجھ پر
تم لوگوں کا احسان ہو گا -

کیا ان سطور نے آپ کے ذہن و دل کو تھرتھرا نہیں دیا؟

تنہائی کا یہ احساس اور اس نئے تعلیم یافتہ عاشق کا اصرار کہ وہ اس سے شادی کرے لیلیٰ کو یہ شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیتا ہے - اس کا خیال ہے کہ وہ کسی دوسرے شہر میں منتقل ہو کر ایک گمنام قسم کی زندگی گذار سکے گی - کچھ عرصہ تو وہ واقعی گمنام رہتی بھی ہے - اس دوران لکھے ہوئے خطوں میں وہ ایک فلسفی کی طرح سوچتی ہے - (۹۲)

" بیچارگی اور بے کسی کی گھڑیاں بہت طویل ہوتی ہیں - میرے لیے بھی طویل ہوتیں' اگر گناہ کے ہنگاموں میں اپنے دل کی کلفتوں کو بھول نہ جایا کرتی - پورا ایک سال تو نہ ہوا ہو گا جب میں تمہارے دست طلب سے بچ کر بھاگ گئی تھی - اس عرصہ میں عمر کی صدیاں اس طرح گذار گئیں جیسے تمہارے لیے وصل کی ایک شب - ہر دن اور ہر مہینہ ایک لمحہ اور ساعت کے برابر تھا - گذشتہ سال کی طغیانی کے بعد جب دریا اترا تو اس کے کناروں پر کیچڑ اور متعفن کوڑا اور سڑی ہوئی لاشیں جو باقی رہ گئیں' ان کی گندگی میں میں نے یہ پورا سال گذار دیا - بھاگ جانے کا آخری فیصلہ میرے لیے پہاڑ کی چڑھائی تھی - مشکل سے چڑھ سکی مگر چڑھ گئی - تم کھینچتے ہی رہے - روکتے ہی رہے لیکن وہ ایک شدید ہیجان اور اضطراب کا عالم تھا کہ میں تم سے اپنا دامن چھڑا کر بھاگی - اور پہاڑ پر چڑھتی چلی گئی تاآں کہ اس کی چوٹی پر پہنچ کے دم لیا - اس وقت یک گونہ اطمینان ہوا کہ تم دور رہ گئے - "

لیکن اس کا یہ نیا چاہنے والا اسے تلاش کرتے کرتے یہاں بھی پہنچ جاتا ہے اور لیلیٰ کی زندگی کا تانا بانا پھر ٹوٹ جاتا ہے - وہ ایک بار پھر انتظار کی کیفیت کا سامنا کرنے لگتی ہے - وہ بار بار اپنے اس نئے چاہنے والے کو کہتی ہے کہ وہ اس کا پیچھا چھوڑ دے کیونکہ وہ اس کے قابل نہیں -

"چند ہی روز میں میں نے اپنے کو تمہارے عشق و عاشقی کے مقابلے میں پہلے سے زیادہ محفوظ کر لیا ہے! آؤ اگر آ چاہتے ہو؟ عشق کا کھوٹا سکہ میری دکان پر نہیں چلتا، سونا چاندی جس قدر اپنی جیبوں میں بھر کر لا سکو لیتے آنا، آؤ تو اس طرح جس طرح اہل دول بازار کو جاتے ہیں۔ اس طرح نہ آؤ جس طرح سڑک پر لڑکے کٹی ہوئی پتنگ کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ منہ اٹھائے آسمان پر آنکھیں جمائے، ہاتھ میں بانس کا ایک ٹکڑا لیے ہوئے، بھاگے چلے جاتے ہیں۔ خبر نہیں ہوتی کہ سامنے خندق ہے کنواں ہے دیوار ہے!۔ یوں آنے سے کیا فائدہ؟ اپنے نفس کو اپنا رہنما بناؤ، وہ تمہارا خدا ہے۔ میرے بستر کی آرائشوں کے مالک ہو۔ میرے پوڈر سے ڈھکے ہوئے رخساروں سے اپنا ہونٹ سفید کر لو میرے عطر میں بسے ہوئے جسم سے اپنا لباس معطر کر لو، میری بنائی ہوئی آنکھوں اور پلکوں کے ڈوروں کی شان میں قصیدے پڑھو۔ ایک شب، دو شب، ہزار شب۔ جتنا روپیہ صرف کر سکو میرے مہمان رہو۔ پھر جب تھک جاؤ تو گھر جا کر کسی شریف خاندان میں کسی نیک بخت لڑکی کو اپنا شریک زندگی بنا لو۔ اور سیدھے حج کرنے چلے جاؤ۔"

اس مقام پر پہنچ کر لیلیٰ کی زندگی میں ایک عجیب سا انقلاب آجاتا ہے اور وہ اپنے اس نئے عاشق کے لیے اپنے دل میں بیقراری کا جذبہ محسوس کرنے لگتی ہے۔

(پینتیسواں خط)

"کئی دن سے کہاں ہو؟ نہ تمہارا خط آیا نہ تم آئے، کیا اچھا ہو کہ تمہاری یہ بے رخی اس امر کی علامت ثابت ہو کہ عشق کا پارہ اب گرنے لگا ہے۔ بہر حال تمہاری خیریت معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ اس لیے زیادہ شک ہے کہ تم کئی دن سے مضمحل تھے۔ ایسا تو نہیں کہ طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہو!!"

جب لیلیٰ کو یہ خبر ملتی ہے کہ اس کا دوست بہت دنوں سے بیمار تھا اور اس نے اسے اپنی بیماری کی اطلاع نہیں دی تو اسے بہت برا لگتا ہے! اپنے چھتیسویں خط میں وہ اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کرتی ہے۔

"مجھے خبر بھی نہ کی، اتنے بیمار ہو کہ اپنے قلم سے دو حرف نہیں لکھ سکتے۔ پھر اس تنہائی اور غریب الوطنی میں کیا میں بھی تمھاری تیمار دار نہیں بن سکتی۔ تم سے وہ محبت بھی نہ کر سکوں جس کی تم مجھ سے خواہش رکھتے ہو۔ تب بھی بہر حال میں تمھاری دوست نیاز مند اور خیر طلب تو ضرور رہوں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ بستر علالت پر میں تمھیں تنہا چھوڑ دوں، تم آج تک اتنا نہ سمجھے کہ بہر حال میرے دل میں تمھاری جگہ ہے اور میرا دل وہ نہیں ہے جو دکھ نہ سکتا ہو۔ رہی کہ میں ایک عصمت فروش اور ناموس باختہ عورت ہوں۔ مگر یہ تو شاید تم بھی جانتے ہو کہ انسانیت سے محروم نہیں ہوں۔ یہ معلوم کر کے کہ تم کئی دن سے سخت بیمار ہو اور تم نے مجھے خبر بھی نہیں کی، میرے گنہگار دل کو ایک ٹھیس لگی۔ جو عورت بیوی بنائی جا سکتی ہو۔ وہ بیوی بنائے جانے سے پہلے تیمار دار بنائے جانے کے قابل بھی نہیں سمجھی جا سکتی؟ جو عورت بازاری معشوق بن کر ہر وقت تم کو اپنا نیاز مند رکھتی ہو۔ کیا تمھارے خیال میں اس کا دل نیاز سے بالکل خالی ہے؟ وہ ناز ہی جانتی ہے نیاز نہیں جانتی؟ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ عیش میں تم میرے نیاز مند ہو تو تکلیف کی حالت میں میں تمھاری نیاز مند بن سکوں؟ مجھے! اجازت دو کہ جب تک تم صحتیاب نہ ہو جاؤ میں اپنا فرض انجام دوں وہ فرض جو صرف عورت کا فرض ہے۔"

اسی اظہار کو چار ہفتے کی تیمار داری کے بعد وہ ستیئسویں خط میں یوں دھراتی ہے۔

"یہ چار ہفتے ایسے گذرے کہ گویا میں اس دنیا میں ہی نہ تھی! تمھارے بستر کے پاس صبح سے شام اور شام سے صبح تک بیٹھے ہوئے میں ہر روز اپنے لیے ایک نئی دنیا بناتی تھی اور بگاڑ ڈالتی تھی! تیمار داری میری زندگی کا ایک نیا تجربہ تھا! شکریہ کیسا؟ احسان کس کا؟ مجھے اپنی احسان مندی کا اظہار کر کے شرمندہ کرتے ہو۔ اپنی عمر میں آج تک کسی بیمار کی تیمار داری نہیں کی میرے لیے یہ ایک بالکل نیا کام تھا۔ بہن بیٹی اور بیوی بن کر عورت کو اپنی فطرت کے مظاہروں کے لیے عمل کا ایک نیا میدان ملتا ہے! میں آج تک کسی کی بہن بنی، نہ بیٹی، نہ بیوی،

مجھے کیا خبر تھی کہ خدمت میں عورت کیا مزہ پاتی ہے! "ناز" ہی جانتی تھی "نیاز" سمجھتی تھی کہ میرے نیاز مندوں کا حصہ ہے! لیکن گذشتہ چار ہفتوں میں میں نے ایک نئے مکتب میں کچھ نئے سبق پڑھے۔ اپنی بھولی ہوئی انسانیت یاد آگئی۔ یاد آگیا کہ میں عصمت فروش ہوں مگر عورت بھی ہوں، میری روح نے ایک نئی گھنٹی بجائی، اس کی آواز میں نے پہلے کبھی نہ سنی تھی۔"

اسی بات کو دہراتے ہوئے وہ اس خط کے آخر میں لکھتی ہے۔

"گذشتہ چار ہفتوں کی تیمارداری کے بعد مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میری زندگی کی ظلمت میں ایک ایسی شعاع پیدا ہوئی ہے۔ جو میرے وہم و گمان سے باہر تھی۔ گویا میں نے کچھ پا لیا، گویا مجھے میری محبت کا معاوضہ مل گیا! پھر شکریہ کیسا؟ جو کچھ میں نے کیا وہ میری محبت کا تقاضہ تھا۔ شکریہ ادا کر کے تم کیوں میری فطرت کی توہین کرتے ہو؟"

اس ذہنی اور قلبی انقلاب کے عکس اگلے خطوں میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ اب لیلیٰ یہ محسوس کرنے لگی ہے کہ اسے اپنے نئے چاہنے والے کی شریک حیات بن جانا چاہیے۔ اٹھائیسویں خط کے آخر میں وہ ان سطور پر اپنے خط کو ختم کرتی ہے۔

"اس وقت خواب اور اس کی تعبیر کا فرق تمہیں معلوم ہوتا ہے؟ جب میں تمھارے بستر علالت کے پاس بیٹھے ہوئے رات کی تاریکی اور خاموشی میں یہ خواب دیکھتی تھی، کہ گویا میں ایک شریف اور با عصمت بیوی ہوں جو اپنے شوہر کی خدمت کر رہی ہے! تو اس خواب کے لطف میں رات کے جاگنے کی تکلیف اور تیمارداری کی خدمت کو بالکل بھول جاتی تھی۔ اور بعض راتیں تو ایسی گذری ہیں کہ میں شام سے صبح تک ۔۔ جب تم بخار کی حالت میں غافل پڑے ہوتے تھے اسی دنیا میں رہی لیکن اب تمھاری تیمارداری سے فارغ ہو کر اپنے گھر آئی ہوں۔ اور عشاق کی عشق بازی کا مسئلہ پھر شروع ہوا ہے۔ اور درد فراق میں مرتے ہوئے چاہنے والے پھر جمع ہوتے جاتے ہیں! اب مجھے بھی خواب اور اس کی تعبیر کا عبرت

انگیز فرق محسوس ہو رہا ہے! لیلیٰ! وہ دنیا جو بیمار کے سرہانے نمی نبرسے لیے نہیں ہے " کوئی مجھ سے کہتا ہے۔

لیلیٰ کے اپنے کہنے کے مطابق اس کے مزاج میں بڑا اتار چڑھاؤ ہے۔ کبھی وہ بجلی بن کر چمکتی ہے، کبھی بادل بن کر برستی ہے۔ کبھی برستی ہے تو بس برسے ہی جاتی ہے۔ کبھی آندھی بن کر چڑھے ہی جاتی ہے۔ کبھی پھول کی طرح مسکراتی ہے۔ کبھی ہنستے ہنستے روتی ہے اور کبھی وہ کہتی ہے۔

" کچھ میرا ٹھکانہ نہیں، ابھی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں تو ابھی گرمیوں کی دوپہر کی لُو چلنے لگی۔ میرا کچھ عجب حال ہے۔ میں کچھ عجب انسان ہوں، کس نے مجھے ایسا بنا دیا؟ کیوں میں ایسی بن گئی؟ "

لگتا ہے کہ اب لیلیٰ فلسفی کے ساتھ ساتھ سنکی بھی بنتی جارہی ہے۔ ایک ہی وقت میں وہ کئی باتوں کے متعلق سوچتی ہے۔ کبھی قانون کے بارے میں کبھی گناہ کے بارے میں کبھی مذہب کے بارے میں، کبھی بیوہ کی شادی کے بارے میں۔ اکتالیسویں خط میں گناہ کے بارے میں وہ لکھتی ہے۔

(اکتالیسواں خط)

" گناہ؟ کیا کہا؟ گناہ کس کو کہتے ہیں؟ جو چیز دنیا میں انسان کو مضر نہ ہو، جو اس قدر عام ہو کر ایک سو ایک فیصدی اس میں مبتلا ہوں اس کو برا کیوں کہوں؟ اگر پانی پینا گناہ ہے، آنکھوں سے دیکھنا گناہ ہے؟ کانوں سے سننا گناہ ہے، تو پھر بتاؤ وہ کونسی بات ہے جو گناہ نہیں ہے؟ کون ہے جو جھوٹ نہیں بولتا، اپنے ہم جنسوں کے ساتھ بے وفائیاں نہیں کرتا؟ دوسروں کی ملکیت پر قبضہ جابرانہ نہیں کرتا، ایک ایک گز زمین پر جان نہیں دیتا، ایک ایک کوڑی کے لیے اپنے بھائیوں سے نہیں لڑتا۔ ایک ایک لقمہ کے لیے جھگڑا نہیں کرتا؟ کون ہے؟ بادشاہ سے گدا تک، مسجد کے سب سے اونچے مینار سے، مندر کے سب سے بڑے گھنٹے لے کر، دنیا آنے والی میوا تک؟ دنیا میں نہ گناہ کوئی چیز ہے نہ ثواب! ساری انسانی زندگی کی بنیاد صرف دو عناصر پر ہے۔ قوی اور ضعیف، قوی سراپا ثواب ہے! اور ضعیف سراپا گناہ ـــــ صرف یہی دو قانون ہیں، دو مذہب ہیں۔ دو مسلک

ہیں، دو قومیں ہیں، انسانیت کے دو اصول ہیں۔ ترازو کے دو پلڑے ہیں، بس قوی اور ضعیف ان دو لفظوں میں دنیا کی تمام زندگی کی تفصیل مرکوز ہے! قوی قانون بناتا ہے، ضعیف سزائیں پاتا ہے۔ قوی اپنی شہرت اور طاقت کے مینار بناتا ہے۔ ضعیف اپنی قبریں کھودتا ہے۔ جو شراب قوی پیئے وہ بالکل جائز اور حلال۔ جو ضعیف پیئے وہ علق حرام اور ناجائز جو قتل قوی کرے وہ انصاف اور جائز انتقام اور ضعیف کرے اس کی سزا موت! جو خلاف فطرت قوی کرے وہ عین فطرت اور جو ضعیف کرے وہ مستوجب سزا! عورت کے ساتھ قوی کا برتاؤ جائز، ضروری اور مناسب، لیکن ضعیف اگر وہی کرے جو قوی کرتا ہے تو قیامت آجائے۔ اس ضعیف سے زیادہ ظالم بدکردار، گنہگار کوئی نہیں! قوی جب اپنے محل میں دو ہزار عورتیں اور لونڈیاں بھرے تو سب بیگمات ہیں اور سب پر اپنے مالک کی اطاعت لازم ہے لیکن اگر ضعیف ایک سے زیادہ عورت کو اپنے پہلو میں بٹھائے تو وہ عیاش ہے، بدکار ہے، بڑے سے بڑا قاتل، عیاش شراب خور، امیرالمومنین خلیفۃ المسلمین اور مہاراج ادھیراج بن سکتا ہے! لیکن اس کے غلاموں کو قتل، عیاشی اور شراب خوری میں اسی خلیفۃ المسلمین اور مہاراج ادھیراج کی عدالت سے دن رات سزائیں دی جاتی ہیں! جو سزا اور جزا کا انحصار فریقین کی قوت اور ضعف پر ہے۔ پھر کیوں ناحق اخلاق اور اعمال کے معیار کو آسمانی اور ربانی کہتے ہو؟"

لیلیٰ اب سوچ کے اس مقام پر پہنچ گئی ہے جب وہ محسوس کرتی ہے کہ ہر عورت کے لیے کوئی ایک مرد دنیا میں موجود ہے۔ جسے تلاش کرنے کے لیے نہ جانے کتنا وقت لگے۔ لیلیٰ کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ یہ اس کا نیا چاہنے والا جس کی وہ چار ہفتوں تک تیمارداری کرتی رہی ہے، یہی اس کا مرد ہے، جسے وہ اب تک ڈھونڈتی رہی۔ اس کا اظہار لیلیٰ نے اڑتالیسویں خط میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

"اپنے باغ کے لاکھوں پھول تقسیم کر چکی ایک چھوٹی سی کیاری میں چند پھول باقی رہ گئے ہیں اب میں اپنے دل میں یہ خواہش پاتی ہوں کہ وہ کسی طرح سرسبز رہیں مرجھا نہ جائیں! شاید میرے آنے والے عہد پیری کا پہلا اشارہ ہے! اشرفیاں لٹا دینے کے بعد چند بچے ہوئے پیسوں کو گرہ میں مضبوط باندھنے کی خواہش اس وقت پیدا ہوتی ہے جب افلاس دروازے پر دستک دیتا ہے، شاید کچھ ایسا ہی حال میرا ہے جب تک دولت وافر تھی لٹائی گئی۔ اب جبکہ میرے میخانے کی سب شراب ناب پینے والے بلا نوش پی گئے۔ تو تلچھٹ کے ان چند قطروں کو جو خم میں باقی رہ گئے ہیں بچا بچا کر رکھنا چاہتی ہوں تو یا تو یہ بات ہے یا۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتی سمجھ نہیں سکتی میری زندگی کی سرسبز وادی میں پھولوں کی شاخیں خالی ہو چکی ہیں۔ میری جوانی بھاگی جاتی ہے میں کیوں اس کو واپس لانا چاہتی ہوں میں اس کے پیچھے دوڑ رہی ہوں؟ اگر یہ عہد جوانی کے اختتام کی وہ کیفیت نہیں جو اکثر انسانوں میں پیدا ہوا کرتی ہے تو پھر کیا بات ہے؟ شاید وہی آواز سچ کہتی ہو جو میرے کانوں میں آرہی ہے؟ اپنی تجارت کے لیے جو جنس میں نے دکان پر رکھی تھی، اب اس کو کسی آنے والے کے سامنے ہدیہ محبت بنا کر پیش کرنا چاہتی ہوں تاکہ جب وہ آئے۔ ملک محبت کا وہ بادشاہ ۔ تو میں اپنا ہدیہ حقیر، اپنا حسن اس کی تمام شعریت اپنی جوانی اپنی راگنی اپنا نغمہ، اپنی روح، اپنی ساری پونجی، ایک خوان میں رکھ کر اس کے سامنے پیش کروں اور کہوں ـــــ اے میرے راجہ! یہ مجھ فقیرنی کی نذر محبت ہے۔ اس کو قبول کر تو دیر سے آیا! جب میرا سارا شہر لٹ چکا، میرے خزانوں میں سے جو کچھ باقی ہے وہ تیرا ہے ـــ اس کے بعد میرے پاس کچھ نہیں۔" حیران ہوں کہ الٰہی وہ کون ہوگا کب آئے گا۔ جس کے سامنے میں اس طرح اپنی نذر پیش کروں گی اور جو اس طرح اس کو قبول بھی کرے گا جس کے لیے میں اپنی خشک کھیتی پر پانی چھڑک رہی ہوں۔ کس کے لیے؟ کوئی مجھے بتائے؟

موت کے گھنٹے سے زندگی کی آواز کیوں نکل رہی ہے؟"

اب وہ اپنے اس دشمن کی دوستی میں نیا لطف پانے لگی ہے۔ اب ان دونوں کے درمیان ایک روحانی رشتہ قائم ہونے لگا ہے۔ اس لیے آپسی حجاب بھی ختم ہو رہا ہے۔ اب لیلیٰ کی زندگی میں وہ موڑ آگیا ہے، جب وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگی ہے اور اپنے آپ سے پوری طرح ہار گئی ہے۔ اسی لیے اپنے اکانویں خط میں وہ یوں رقمطراز ہے۔

"رات بھر کے طوفان کے بعد صبح ہو رہی ہے۔ خزاں کے بعد درخت برہنہ ہو گئے تھے۔ بہار ان کے لیے ایک نیا لباس لے کر آرہی ہے اس لباس کے ساتھ زندگی کی نئی مسرتیں ہیں۔ کیا میری خزاں کو بھی بہار کا پیام آیا ہے؟ میرے ویرانے کی شکستہ دیواریں بھی کیا پھر تعمیر ہوں گی؟ میری ظلمت میں یہ شعلے کیوں بلند ہو رہے ہیں؟ کون ہے جو میرے دل میں بادشاہ بن کر بیٹھ گیا ہے؟ کون ہے؟ تم ہو؟ تم نے کہا تھا، تو مجھ سے بھاگتی ہے۔ میں چھپ کر تیرے دل میں جگہ ڈھونڈھ لوں گا تو مجھ سے محبت نہیں کر سکتی ہے میں تجھے محبت کرنا سکھا دوں گا" تم نے جو کہا تھا وہ کیا؟ میں کہا کرتی تھی "میرا مرد پیدا نہیں ہوا۔ میرا جوڑا دنیا میں نہیں آیا۔" آج میرا مرد آگیا،

آج میرا جوڑا آگیا میں اس کی ہوں، میں اس کے لیے ہوں، میری زندگی اس کی ہے، میرا عیش اس کا ہے۔ وہ آگیا جس کے وجود سے میری زبان انکار کرتی تھی اور جس کو میری روح پکارتی تھی۔ تم آگئے۔"

بانواں خط اس کتاب کا آخری خط ہے جسے لیلیٰ نے اس جملے پر ختم کیا ہے۔ جس میں اس کا ایک جہاں مستور ہے۔

"ہاں دوسرے جنم میں میرا انتظار کرو!"
لیلیٰ

میں سمجھتا ہوں قاضی عبدالغفار نے اپنے مقدمے میں جو یہ دعویٰ کیا تھا کہ خطوط کا یہ مجموعہ نہ تو افسانہ سمجھ کر اور نہ ہی ناول سمجھ کر پڑھا جائے۔ وہ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن آخری خط کے آخری جملے پر پہنچ کر انھوں نے جس کلائمکس کو ابھارا ہے وہ یقیناً ایک طویل افسانے یا کسی

ناول کا ہی کلائمکس ہو سکتا ہے۔ خطوط کے مجموعے کا نہیں۔

میں قاضی صاحب کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا ہوں جو کچھ میں نے پیش کیا ہے وہ سب "لیلیٰ کے خطوط" کے حوالے سے ہی لکھا ہے جو کتاب میں نے لگ بھگ پچاس برس پہلے پڑھی تھی اور جس کا تاثر میرے ذہن پر اب تک موجود ہے ان کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں مجھے جو کچھ معلوم ہوا وہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے مضمون "علی گڈھ کی چند شخصیتیں" کے حوالے سے ہے یہ مضمون لاہور سے شائع ہونے والے میگزین "نقوش" کے شخصیات نمبر میں ۱۹۵۶ میں چھپا تھا۔ اس بات کو بھی چونتیس برس ہو گئے ہیں۔

"لیلیٰ کے خطوط" کے جواں طرز اور جوان نگار مصنف جب تقسیم ہند کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) کے سکریٹری ہو کر علی گڈھ تشریف لائے تو اس وقت ان پر نزاں کا عالم تھا صحت جواب دے چکی تھی اور طبیعت بجھ سی گئی تھی پھر بھی شائستگی و نفاست اور تہذیب و شرافت کا ایک پیکر تھے۔ ان کو دیکھ کر کسی ایسے ملبوس کا گمان ہوتا تھا جو ابھی ابھی ڈھل کر آیا ہو اور گرد یا دھبے کا ہلکا سا نشان بھی نہ ہو۔ اپنے لباس اور طرز رہائش کے اعتبار سے قاضی صاحب بھی مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح ایک ارسٹوکریٹ ادیب تھے لیکن مولانا کے برخلاف قاضی صاحب نہ تو خلوت پسند تھے اور نہ ہی انانیت کے اسیر۔ انتہائی ملنسار، نرم طبیعت اور بردبار قسم کے آدمی تھے یہی وجہ ہے کہ فریب کھانا اور پھر اس کی تجدید کرنا ان کی شخصیت کا ایک جزو بن چکا تھا۔ ان کی نرمی اور بھلمنسا ہٹ سے فائدہ اٹھا کر بہت سے نالائق نہ صرف ان کو بلکہ انجمن کو نقصان پہنچاتے اور قاضی صاحب کی افسردگی اور آزردگی میں اضافہ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ سخت علالت کے دوران میں بھی بستر پر لیٹے لیٹے انجمن کا کام کیا کرتے اور سارے خطوط کا جواب خود دیتے۔ آخر عمر میں اپنے ساتھ کام کرنے والوں کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ نوجوان ادیبوں کی ہمت افزائی اور ان کے لیے ہر طرح کمربستہ رہنا قاضی صاحب کا ایسا جوہر تھا جو پرانی نسل کے لوگوں میں مجھے کسی اور میں نظر نہیں آیا۔ آج سے کئی سال پہلے "ادب لطیف" میں میرا مضمون بہادر شاہ ظفر چھپا تو انہیں بہت پسند آیا۔ رقعہ بھیج کر مجھے بلایا اور بہت ہی تعریف کی اور کہا کہ جس نقطۂ نظر سے تم نے بہادر شاہ ظفر پر تنقید کی ہے وہ بالکل ہی نئی چیز ہے اور بہت ہی قابل قدر، میری خواہش ہے کہ تم اسی نقطۂ نظر سے ظفر

کے کلام کا ایک انتخاب مرتب کردو۔ میں اسے انجمن سے شائع کروں گا اور اگر انجمن کی لٹریری کمیٹی نے نامنظور کر دیا تو اپنے خرچ سے طبع کراؤں گا۔ میں نے یہ انتخاب مرتب کرکے دیدیا۔ اتفاق کہ اسی زمانے سے قاضی صاحب پر سخت علالت کا دورہ پڑنے لگا۔ قاضی صاحب کا وطن مراد آباد میں تھا۔ علی گڈھ کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ اس کے بعد صحافتی دنیا میں داخل ہوئے اور مولانا محمد علی کے ساتھ "ہمدرد" "کامریڈ" میں اور پھر مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ کلکتہ میں کام کیا۔ خود بھی کئی اعلیٰ درجے کے اخبار نکالے جس میں "جمہور" اور "صباح" کلکتہ سے اور "پیام" حیدرآباد سے نکالا اور صحافت نگاری کی تاریخ میں ایک نمایاں مثال قائم کی۔ قاضی صاحب کے قلم سے ایک سطر بھی ایسی نہ نکلتی تھی جو ایک مخصوص طرز نگارش کی حامل نہ ہو۔ اس درجہ کے صحافی اردو زبان میں کم ہی گذرے ہیں۔

۱۷ جنوری ۱۹۵۶ کو تین بجے قاضی صاحب کا علی گڈھ ہی میں انتقال ہوگیا۔ علالت کا سلسلہ عرصے سے چل رہا تھا لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ اس قدر جلد ہم سے رخصت ہو جائیں گے۔ یونیورسٹی کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ دوسرے دن یونیورسٹی یونین میں بھی ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس جلسے میں یہاں کے طالب علموں اور استادوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ذاکر صاحب نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے آبدیدہ ہوکر کہا کہ "میں آپ لوگوں کو گواہ بنا کر وصیت کرتا ہوں کہ اگر میں مر جاؤں تو میرے مرنے پر نہ کوئی جلسہ ہو اور نہ یونیورسٹی بند کی جائے۔"

جس طرح قاضی صاحب کی کتاب "لیلیٰ کے خطوط" کا کلائمکس بڑا غیر متوقع تھا اسی طرح ان کی زندگی کی کتاب کو بھی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے بڑا ہی غیر متوقع کلائمکس دے ڈالا۔ قاضی عبدالغفار واقعی کلائمکس کے آدمی تھے۔

حکیم محمد حسین خاں شفا

کچھ آثار قاضی عبدالغفار

قاضی صاحب بڑے باصلاحیت اور بہت بے چین طبیعت کے مالک تھے۔ آپ کی پیدائش مرادآباد میں ہوئی تعلیم و تربیت مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں قاضی صاحب کے خاندان کے روسائے رامپور سے دیرینہ تعلقات تھے۔ اسی بنا پر آپ کا رامپور آنا جانا کثرت سے رہتا تھا۔ اسی سبب سے آپ کی یادیں اور کچھ یادگاریں آج بھی رامپور میں محفوظ ہیں۔ رامپور سے ایک رسالہ نیرنگ شائع ہوتا تھا اس کے ایڈیٹر کی یہ دلی خواہش تھی کہ قاضی صاحب اپنی سوانح اور کوئی اچھی سی تصویر اشاعت کے لیے دیں۔ قاضی صاحب چونکہ بے حد منکسر المزاج اور خود پوش تھے اس بنا پر ٹالتے رہے آخر ایڈیٹر کو بتوسط فضل رب باغ سنبھلی اپنی اس خواہش میں کامیابی ہوئی۔ اور قاضی صاحب نے مختصر سوانح اور تصویر عنایت کی جو نیرنگ مارچ ۱۹۲۹ء کے شمارہ میں شائع ہوئی قاضی صاحب لکھتے ہیں "میں اپنی زندگی کے حالات کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ عمر کے بیالیس ۴۲ سال ایک جستجوئے بے معنی میں گذر گئے۔ ابتدائی عمر سرکاری ملازمت میں گزری اس سے جی اکتا یا تو اخبار نویسی کی بلا میں پھنس گیا۔ شروع سے انیا۔ ہمدرد کا ایڈیٹر رہا پھر کلکتہ سے صداقت اور جمہور روزنامہ نکالا۔ وہاں ۱۹۱۷ء میں ایک بلوہ ہوا اس کے سلسلہ میں مجھے خارج البلد کیا گیا۔ اور آٹھ ماہ نظر بند رہ کر چھوٹ کر دہلی آیا۔ یہاں سے روزنامہ صباح جاری کیا۔ حکیم مسیح الملک مغفور کی ضمنیت میں شعروشاعری کا چرچہ رہا کرتا تھا مغفور حکیم اجمل خاں کبھی کبھی اصلاح فرما دیا کرتے تھے۔ آج تک میرا کلام کبھی شائع نہیں ہوا۔ صباح کی ضمانت ضبط ہونے کے بعد وفد خلافت کے ساتھ انگلستان گیا۔ پھر کچھ اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں دو دفعہ

یورپ کا سفر کیا۔ ۱۹۲۵ء میں واپس آکر مراد آباد میں اقامت اختیار کی ۱۹۲۶ء میں پہلی مرتبہ مراد آباد میونسپل بورڈ کا چیرمین ہوا۔ اب دسمبر میں دوبارہ منتخب ہوا۔ ایک بے معنیٰ اور مہمل زندگی آدھی سے زیادہ گذر گئی معلوم نہیں کتنی باقی ہے۔ کلام کو شائع کرنا نہ کبھی پسند کیا نہ وہ شائع کرنے کے قابل ہے۔ دو چار شعر آپ سن لیجئے اور اگر رسالہ میں درج کرنے کے قابل ہوں تو درج فرما دیجئے۔

(عبدالغفار، رسالہ نیرنگ رام پور صفحہ ۱۳۲) ایڈیٹر نے قاضی صاحب کا ایک بھی شعر تحریر نہیں کیا ہے۔ مراد آباد کی چیرمینی کے بعد قاضی صاحب حیدرآباد چلے گئے اور وہاں سے "پیام" نام کا اخبار نکالا۔ قاضی صاحب کی مستقل تصانیف میں "لیلیٰ کے خطوط" "مجنوں کی ڈائری" "تین پیسے کی چھوکری" اس نے کہا، خلیل جبران، سبب کا درخت، آثار جمال الدین، آثار ابوالکلام اور حیات اجمل ہے قاضی صاحب اپنی تصانیف میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی سوانح کو بہت اہمیت دیتے تھے۔

قاضی صاحب کا کافی وقت صحافت سیاست اور قیادت میں مشاہیر وقت کے ساتھ گزرا لیکن وہ اپنے مزاج اور طبیعت کی وجہ سے ان سب سے بیزار رہے اس سلسلے میں ان کی کچھ مشاہیر سے نوک جھونک اور اختلاف رائے بھی رہا جس کے بارے میں رئیس احمد جعفری نے اپنی کتاب دید و شنید میں قاضی صاحب پر محسن کشی اور احسان فراموشی کا الزام لگایا ہے قاضی صاحب مولانا محمد علی کے شیدائی تھے۔ اور انھوں نے بھی مولانا محمد علی کی طرح اپنا سب کچھ سیاست اور صحافت کی نظر کر دیا۔ آخری عمر بہت کس مپرسی کے عالم میں گذاری۔ وہ کسی معقول ملازمت کے متلاشی رہے۔ اس سلسلہ میں مولانا شوکت علی اور مولانا عرفان سے درخواست کی کہ وہ امیر افغانستان سے سفارش کر کے انھیں سروس دلا دیں لیکن کام نہیں بنا۔ عرفان صاحب نے قاضی صاحب کو میدان سیاست و صحافت میں جمے رہنے کا مشورہ دیا۔ جس کے سلسلے میں ایک دلچسپ خط قاضی صاحب نے مولانا عرفان کو تحریر کیا۔ وہ لکھتے ہیں: "مولانا صحافت اور سیاست کا تو خیال بھی نہ کیجیے میں بہت شکستہ خاطر ہوں . . . . پہلا سوال روٹی کا ہے اگر مجھے سرمایہ مل جائے اور میں کوئی آزاد اخبار جاری بھی کر دوں تو یقین جانیے کہ ہندوستان کے اس عہد میں کوئی ایماندار اخبار نویس دو وقت روٹی بافراغت نہیں کھا سکتا۔ روٹی کی فکر ہو تو اخبار کے ذریعہ سے استحصال بالجبر کیجیے یا قومی چندے جمع کر کے ہضم کیجیے یا طلائے واجد علی شاہی اور حب ملذذ کے اشتہارات

شائع کیجیے۔ مسلمانوں کی سیاست اب صرف یہ ہے کہ ہر مسلم لیڈر نے اپنے چہرے میں چھید کر لیا ہے اور منتظر ہے کہ اللہ میاں چھپر پھاڑ کر دیں گے۔ گلے میں ڈھولک ہے ہاتھ میں طنبورہ ہے حلق بڑا ہے زبان لمبی ہے اور اگر مولوی ہے تو معدہ قوی ہے۔ ایک سے ایک بڑا مقتدر موجود ہے۔ اپنا حال تو یہ ہے کہ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

حکیم صاحب کی سیرت کا کام شروع کر دیا ہے گو دشواریاں بہت زیادہ ہیں اور بدقسمتی سے کچھ لوگ مجھے اس کام کے لیے بلحاظ اپنے اغراض و مقاصد کے موزوں نہیں سمجھتے۔ اس لیے جن اطراف سے کافی امداد ملنا چاہیے وہ نہیں ملتی ہیں مسیح الملک کا سوانح نگار بننا چاہتا ہوں یہ کام مجھ سے بن آئے تو سمجھوں گا کہ زندگی کی تمام ناکامیوں کا نعم البدل مل گیا)

قاضی صاحب کی عملی اور انتظامی صلاحیت کا ظہور انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ہونے کے بعد ہوا۔ انھوں نے انجمن کے توسط سے اردو زبان اور علم و ادب کی جو خدمت کی وہ ناقابل فراموش ہے۔ قاضی صاحب کا بڑا وقت حکیم اجمل خاں کے ساتھ گزرا۔ وہ حکیم صاحب کی شخصیت سے کافی متاثر نظر آتے ہیں ۱۹۲۵ء میں جب حکیم اجمل خاں صاحب نے بحالی صحت کے سلسلہ میں نواب صاحب رام پور کے ساتھ یوروپ کا سفر کیا تو پیرس میں قاضی عبد الغفار صاحب کا بھی ساتھ رہا جب پیرس سے حکیم صاحب نے احباب رام پور کے نام خط لکھا تو اسی میں اپنے دوست ڈپٹی صاحب کے لیے کچھ سطریں قاضی صاحب نے بھی تحریر کر دیں۔ قاضی صاحب کا ۱۷؍ جنوری ۱۹۵۶ء کو باسٹھ سال کی عمر میں علی گڈھ میں انتقال ہوا اور وہیں ان کی تدفین ہوئی۔

حکیم اجمل خاں اور قاضی عبد الغفار صاحب کا مشترکہ خط احباب رام پور کے نام

(۱) چیف سکریٹری صاحب

(۲) ایڈیشنل سکریٹری صاحب

(۳) ہوم ڈیپارٹمنٹ سکریٹری صاحب

(۴) پرائیویٹ سکریٹری صاحب

(۵) سید جمیل احمد صاحب

(۶) ہادی حسن صاحب

برادران

السلام علیکم

معاف کیجیے کہ وقت کی تنگی کے لحاظ سے آپ سب صاحبان کو ایک ہی خط میں یاد کر رہا ہوں ورنہ جدا جدا خطوط لکھتا۔

میں پیرس میں ۲۳ اپریل کو خیریت کے ساتھ پہنچ گیا۔ اور بارہ تیرہ روز یہاں قیام کرنے کا ارادہ ہے۔ پھر سوئزرلینڈ کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔

میں جس ہوٹل میں مقیم ہوں وہ گو چھوٹا ہے لیکن صاف ستھرا ہے اور کھانا بہت اچھا دیتا ہے۔ اس کے کمرہ کا روزانہ کرایہ ۶۰ فرانک ہیں۔ اور چا کے علاوہ دونوں وقت کے کھانے کے دام تقریباً ۴۰ فرانک ہوتے ہیں اس طرح سو فرانک روزانہ قیام و طعام کا حساب ہے۔ اگر میں کفایت پر نظر نہ رکھوں تو آئندہ دشواری کا احتمال ہو سکتا ہے۔

پیرس کا موسم باوجود کبھی کبھی بارش کے آج کل بہت اچھا ہے۔ دسمبر جیسی سردی ہے بھوک اور ہضم کی حالت یقینی طور پر ترقی پذیر ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سفر کا میری صحت پر اچھا اثر ہوگا اگر خدا کو منظور ہے۔

پرسوں ۲۶ اپریل کو نواب صاحب اور ڈاکٹر انصاری صاحب لندن گئے۔ گو میرا بھی ارادہ تھا لیکن کسی وجہ سے جن میں سے ایک وجہ چھوٹے چھوٹے سفروں سے جن کا میری موجودہ حالت پر اچھا اثر نہیں پڑتا احتراز کرنا ہے میں نے اس سفر کو ملتوی کر دیا۔ اس وقت میں تنہا پیرس میں ہوں۔ امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب چار روز کے بعد یہاں واپس آجائیں گے۔ اور چند روز کے قیام کے بعد پھر وہ اور میں آگے جائیں گے۔

نواب صاحب اس سفر سے بہت خوش ہیں۔ کپورتھلہ کے ہاں لنچ پر وہ اور میں دونوں گئے تھے۔ میں لنچ کھا کر واپس آگیا اور وہ مہاراجہ صاحب کے ساتھ سفر کے لیے چلے گئے۔ شب کو واپس تشریف لائے تو بہت خوش تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پیرس کی ملکہ حسن کی نمائش میں جو عورت منتخب ہوتی ہے (ملکہ پیرس میں سے) وہ ملکہ قرار دی جاتی ہے اور یہاں اس کا خاص رتبہ ہوتا ہے جس کی زیارت اور ہم کلامی سے خوشی حاصل ہوتی ہے۔

ڈاکٹر شفیقہ فرحت

تین پیسے کی چھوکری کا تجزیاتی مطالعہ

میں نے اپنے مضمون کے لیے "لیلیٰ کے خطوط" منتخب کیا تھا۔ یہ قاضی عبدالغفار کی پہلی تصنیف ہے قصے کے اعتبار سے دلچسپ ہے۔ تاثر کے اعتبار سے بھرپور اور اس کا اسلوب منفرد۔ اس کی ہیروئن لیلیٰ زندہ کردار ہے جن مسائل میں لیلیٰ گھری ہے اور جن حالات سے وہ دوچار ہو رہی ہے۔ نصف صدی گذر جانے کے بعد بھی کم و بیش وہی مسائل وہی حالات آج کی عورت کو بھی درپیش ہیں۔

بغاوت کی جو آگ آج عورت کے سینے میں بھڑک رہی ہے۔ اس کی چنگاری لیلیٰ کے وجود کو بھی جلا رہی تھی۔

زندہ موضوع۔ زندہ کردار کا یہ فن پارہ عظیم ادب میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

اسی لیے میں نے اس پر قلم اٹھانا چاہا تھا۔

بھوپال کی اہم لائبریریوں میں قاصد دوڑائے گئے۔ دنوں اور ہفتوں کی محنت کے بعد صرف ایک لائبریری میں اس کے وجود کی اطلاع ملی۔ کتاب اشو تھی۔

لیلیٰ کے خطوط کی زندگی اور کامیابی کی ایک اور دلیل کہ اب بھی وہ پڑھی جا رہی ہے۔

سوچا لیلیٰ نہ سہی مجنوں ہی سہی اس کی ڈائری کو نشانہ بنائیں۔ دعوت نامہ میں فہرست دیکھی تو پتہ چلا کہ تقریباً آدھے درجن حضرات مجنوں سے لو لگائے ہیں۔

اور "تین پیسے کی چھوکری" کو کوئی پوچھتا نہیں۔ سو "تین پیسے کی چھوکری" کو جانچنے

پر کھنے کی یہ سرسری کوشش ہے ۔

جائزے سے پہلے میں یہ بتادوں کہ قاضی عبدالغفار کے ساتھ ادب کے مورخوں تبصروں اور نقادوں نے انصاف نہیں کیا ۔ وہ افسانے اور ناول کے ابتدائی دور کے ایک اہم صنف ہیں بلدرم ، نیاز فتح پوری، سجاد انصاری اور پریم چند کے ہم عصر ہیں مگر ان کے فن پر بہت کم لکھا گیا۔ حتیٰ کہ اکثر افسانہ اور ناول نگاروں کی فہرست سے ان کا نام غائب کر دیا گیا ۔

لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے فن کا بھرپور تفصیلی جائزہ لیا جائے ۔ اور ان کے فنی مرتبے کا تعین بغیر لاگ لگاؤ کے بغیر تعصب اور جذباتیت کے کیا جائے تین پیسے کی چھوکری، ان کے افسانوں۔ ڈراموں اور انشائیوں کا مجموعہ ہے ۔ یہ ان کی اولین کوشش ہے۔

میرے سامنے جو اس کتاب کا جو نسخہ ہے اسے مکتبہ شاہرہ نے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا ہے ۔

دیباچہ میں تاریخ تو لکھی ہے ۲۸ جنوری لیکن سن نہیں دیباچہ حیدرآباد میں لکھا گیا۔ حیدرآباد وہ غالباً سن ۲۳ء سے اکتوبر ۱۹۴۷ء تک ۔

اسی زمانے میں یہ کتاب اشاعت کے لیے ترتیب دی گئی ہوگی لیکن اس کے مختلف افسانوں اور مضامین کا زمانہ تصنیف ۱۹۱۸ء سے لے کر ۱۹۳۳ء تک پھیلا ہے ۔

کئی مضامین پر سن تصنیف بھی نہیں دیا گیا۔ لہذا ہو سکتا ہے کچھ چیزیں ۱۹۳۳ کے بعد کی بھی ہوں۔

اشاعت کے متعلق جہاں تک میرا قیاس ہے وہ یہ کہ قلبند شاہرہ کے ۱۹۵۹ والے ایڈیشن سے پہلے اس کا ایک ایڈیشن کہیں اور سے شائع ہو چکا تھا ۔ اس مضمون کی اشاعت سے پہلے اس نکتہ کو حل کر لیا جائے گا "تین پیسے کی چھوکری" کے contents کے متعلق دیباچہ میں قاضی عبدالغفار کہتے ہیں :

"یہ سب کسی زمانے کے چند کفنائے ہوئے مُردے ہیں جن کو ان اوراق

میں دفن کرتا ہوں۔
میں افسانہ نگار کبھی نہ تھا۔ نہ ہوں کبھی کبھی سر راہ قلم کچھ دائرے اور زاویے ایسے بنا دیتا ہے۔ فن کے اعتبار سے نوک و پلک پر غور نہ کیجیے۔ وہ تنقید و تبصرے کے حریف نہ ہوسکیں گے۔
جو کچھ ہے منظم افسانہ نگاری نہیں ہے۔ بلکہ ایک انتشار ہے۔ معذور۔ ناقد اور مبصر سے زیادہ میں اپنے حال سے واقف ہوں اور وہ یہ ہے کہ
انشاپردازی کے لحاظ سے میں فن کے ہر شعبہ پر حاوی ہوں سوائے افسانہ کے۔ بحیثیت ایک ادیب کے میرا قلم فن کے ہر پہلو پر حاوی ہے سوائے ادبیات کے۔
ناقدین کو خطاب کرنے کے بعد آخر میں مضامین کا انتخاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
حقیقت یہ ہے کہ یہ اوراق پریشان صرف ان اصحاب کے پڑھنے کے قابل ہیں اور ان ہی میں سے ان اوراق کو منسوب کرتا ہوں جو میری طرح افسانے لکھ نہ سکتے ہوں مگر لکھنے ضرور ہوں اور اس قسم کے میرے ساتھی بہت ہیں۔ ان کی کثرت میں ہیں اپنے ان شاہکاروں کو بالکل محفوظ سمجھتا ہوں۔
گویا قاضی صاحب اعتراف کرتے ہیں انھوں نے کسی ٹکنیک کی پابندی نہیں کی۔
خود میں افسانے اور ناول کے لیے کسی ٹیکنیک کی قائل نہیں کہ افسانہ اور ناول میز کرسی نہیں کہ انچ ٹیپ سے ناپ ناپ کر اسے بنایا جائے۔ نہ وہ کوئی دیوار ہے کہ اینٹیں گن گن کے چنی جائیں۔
وہ تو بس کسی واقعہ کا کسی جذبے کا کسی احساس کا اظہار ہے واقعہ خود اپنے لیے اظہار کا پیرایہ تلاش کر لیتا ہے۔
احساس لفظ لفظ چن لیتا ہے۔
یہ الفاظ چاہے کنکر ہوں چاہے پتھر۔ ہیرے ہوں یا موتی کہنے کے لیے کوئی بات

[redacted]

ونی چاہیے ۔ اہم، نئی کوئی مسئلہ ہو جو مصنف کے دل میں خلش پیدا کر رہا ہو تیرِ نیم کش کی طرح ۔ اور پڑھنے والے کے دل میں کھٹک رہا ہو نوکِ خار کی طرح ۔

بات کس دنیا کی کہی جا رہی ہے ۔ ؟ اپنے آس پاس کی جانی پہچانی دنیا کی — یا اس دنیا کی جو صرف کہنے والے کے دل میں آباد ہے پھر بھی ہر دور میں اظہار کے کچھ پیرائے مقبول ہو جاتے ہیں ۔

ایک مخصوص اسٹائل بن جاتا ہے ۔

جن کے قلم میں طاقت ہوتی ہے ۔ وہ اسٹائل بناتے ہیں ۔ دوسرے اور وقت کے اعتبار سے بعد میں آنے والے اس اسٹائل کی پیروی کر لیتے ہیں ۔

اردو افسانے کے ابتدائی دور میں یعنی جب وہ داستانوں کے سحر سے نکل رہا تھا ۔ اور حقیقت کی دنیا میں قدم رکھنے والا تھا ۔ اس نے ایک پیرایہ یہاں اختیار کیا ۔ جس میں حسنِ بیان حاوی تھا ۔ گویا گل کھلائے نہیں گل کترے جاتے تھے ۔

اسے مبصرین نے ' ادب شناسوں نے رومانوی تحریک کا نام دیا اس تحریک کو متعارف کرواتے ہیں سجاد حیدر یلدرم اور آگے بڑھاتے ہیں قاضی عبدالغفار ۔ نیاز فتح پوری ۔ سجاد انصاری ۔ مہدی افادی ۔ مجنوں گورکھپوری، حجاب امتیاز علی وغیرہ ۔

اور یہ قاضی عبدالغفار کے مختصر ناولوں میں نئے حسن کے ساتھ ایک بھرپور انداز میں نظر آتا ہے ۔ ان کے ترجموں 'سیب کا درخت' ''اس نے کہا'' اور ''تین پیسے کی چھوکری'' میں یکجا کیے جانے والے مضامین میں بھی ہے ۔

اس مجموعے کا پہلا افسانہ یا قصہ 'تین پیسے کی چھوکری' ترجمہ ہے یا نہیں ۔ یہ وثوق سے کہا نہیں جا سکتا ۔ مصنف نے خود اس سلسلے میں کچھ نہیں لکھا ۔ بہرحال قصہ یا واقعہ کسی دوسری زبان جو کہ انگریزی ہی ہو سکتی ہے ۔ میں قاضی صاحب کو نظر آیا اور انھوں نے اسے اردو کے قالب میں ڈھال دیا ۔

یہ قصہ ''مسیح کی پیدائش کے پانچ سو برس بعد بازنطہ کے دارالسلطنت میں شہنشاہ (Hebtineen) اور اس کی عیش پرست ملکہ تھوڈورا کا زمانہ ہے اور اسی کی

داستانِ حیش ہے مکل سرکس کے جنگلی جانوروں کے درمیان پلنے بڑھنے والی مفلس یتیم مگر بے حد حسین لڑکی ہے ۔ جو اپنے حسن اور شباب کا پہلا سودا تین پیسے میں کرتی ہے ۔ اور آخری سودا تاج و تخت لے کر۔ قدیم مصر، یونان روما وغیرہ میں ایسی ہزاروں داستانیں بکھری پڑی ہیں ۔ قصہ کہیں سے لیا ہو ۔ بیان میں روانی ہے وہ شوخی اور شکوہ جو اس ماحول کی عکاسی کا تقاضہ ہے۔ شروع سے آخر تک قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے اور ملکہ تھوڈورا کا کردار ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا سامنے آتا ہے ۔

سرکس کی شوخ بے باک شیروں سے کھیلنے والی نڈر بے خوف بچی ۔ طاقتوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے والی حسینہ ۔ اور زندگی میں آنے والے صرف ایک اہم لمحہ کو مٹھی میں بند کر کے شاہ کے دل اور تاج و تخت پہ قابض ہو جانے والی ملکہ ۔

دوسرا مضمون" وہ میرا انتظار کر رہی ہے" ۱۹۱۸ میں لکھا گیا اور خالص انشائیہ نگاری کی مثال ہے ۔ جو اس زمانے میں بے حد مقبول تھا اور جس کی مثالیں سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کے یہاں ملتی ہیں پریم چند کی مقبولیت سے پہلے ۔ یہی نثری ادب کی سب سے نمائندہ اور عظیم صنف بھی ۔ اس فن لطیف میں الفاظ مرکزی اہمیت رکھتے ہیں ۔ اور یہی اس کو باقی فنون لطیفہ سے جدا کرتی ہے ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ فن لطیف کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

"ادب وہ فن لطیف ہے جس کے ذریعے ادیب جذبات و افکار کو اپنے خاص نفسیاتی و شخصیاتی خصائص کے مطابق نہ صرف ظاہر کرتا ہے بلکہ الفاظ کے واسطے سے زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق کی روشنی میں ان کی ترجمانی و تنقید بھی کرتا ہے ۔"

وہ میرا انتظار کر رہی ہے ۔ میں عشق کا Flatonic تصور ہے ۔ کہ ہاتھ لگانے ہی محبوبہ آسمانی مخلوق بن جاتی ہے ۔ اور عاشق اس کے وصال کے لیے موت کا انتظار کرتا ہے ۔

یہاں قاضی عبدالغفار دلکش انداز بیان کے ساتھ رومانی انتہا پسندی کی رو میں بہہ گئے ۔

'ہیں' — یہ بھی ۱۹۱۸ کی تخلیق ہے ۔ اور رومانوی انشا نگاری کا عالی نمونہ ۔
غالب کے فکر انگیز شعر

ہے آدمی بجائے خود ایک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

سے شروع کرکے 'میں' یعنی خود کی زندگی کے مختلف پہلو مختلف مدارج مختلف ادوار کی جھلکیاں پیش کرتے ہیں جس میں رنگینیاں ہیں ، کامیابیاں ہیں ۔ کامرانیاں ہیں ۔ اداسیاں اور ناکامیاں بھی ۔ جس میں فکر کی ایک رو بھی ہے اور فلسفۂ حیات کا شعور بھی ۔

الفاظ و بیان موج دریا کی طرح رواں اور پیوستہ ہے ۔ آپ بھی دیکھیے ۔

"ایک زمانہ تھا اور وہ زمانہ کیفِ حیات اور نشاطِ زندگی کا زمانہ تھا جب خاک کا ہر ذرہ زریں ہر قطرۂ خوں لعل بدخشانی ہر زخم ایک تبسم ، ہر آواز نغمہ اور پانی کا ہر قطرہ شرابِ ناب تھا جب دل کی مستانہ کیفیتیں عقل کی رہنمائی پر ہنستی تھیں اور ہر برگِ خزاں رسیدہ ایک صحن چمن نظر آتا تھا ۔ یہ وہ دن تھے کہ خلوت خانۂ خیال میں عجیب عجیب محفلیں جما کرتی تھیں ۔

کتاب کا آخری "ESSAY" "میں اکیلا ہوں" — 'میں' کی اگلی کڑی ہے ۔ سن تصنیف درج نہیں ۔ فکر اور انداز سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے اسی زمانے ۲۰ ـ ۱۹۱۸ میں لکھا گیا ہوگا ۔

"قبض" اناطول فرانس کا تخیل ہے ۔ طبع زاد کم اور ترجمہ زیادہ

اس پر بھی یہاں اس وقت بحث نہیں کی جائے گی ۔ 'دیوتاؤں کا صدقہ' اور 'فریب' ڈرامہ نما اسکیچز ہیں ۔ غالباً تراجم ۔

'سراغ رساں' اور 'سزائے موت' افسانے ہیں ۔ 'سزائے موت' میں حسبِ معمول تخیل کی کارفرمائی ہے ۔ ایک ایسا ملک جہاں اس درجہ امن و امان ہے کہ آج تک کسی کو سزا نہیں دی گئی اور نہ کبھی جیل کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ۔ لہٰذا قتل کی اکلوتی واردات کے اکلوتے مجرم کو شہر بدر کردیا جاتا ہے ۔

قصے کی اصل زبان کی طرف نشان دہی نہیں کی گئی ۔ لیکن یہ طبع زاد نہیں ۔ اور ترجمہ بھی نہیں ۔

البتہ انداز تحریر پر قاضی کے رنگ کی واضح چھاپ ہے۔

دوسرا افسانہ "سراغ رساں" ایک واردات کی داستان ہے۔ جس میں ہمارے نظام پر بھرپور طنز ہے۔ قتل ہوا نہیں بلکہ سرے سے کوئی واردات ہوئی ہی نہیں۔ صرف لوعیہ ہ کے زمیندار بغیر کسی کو اطلاع دیے موہنی طوائف کے ساتھ بمبئی چلے جاتے ہیں۔

داروغہ جی اپنی کارگذاری دکھانے کے لیے ان کی گم شدگی کو قتل کی واردات میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ فرضی گواہ جھوٹے ثبوت، جھوٹی شہادتیں حتیٰ کہ مجرم تک تشدد کے بل بوتے پہ تیار کر لیے جاتے۔

معاملہ بس یہاں آکر اٹک جاتا ہے کہ لاش تک کا پتہ نہیں۔ سو بقول داروغہ جی اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔

قاضی صاحب کے مطابق یہ قصہ ۱۸۸۶-۸۷ کا ہے۔

پوری ایک صدی گذر جانے کے بعد بھی پولیس کا وہی رنگ وہی انداز ویسے ہی جھوٹی شہادتیں۔ فرضی گواہ انتہائی تشدد سے کام لے کر کسی سے بھی اقبال جرم کروانا۔

اتنی سچی اتنی دور تک کی بات کہنا مصنف کے بیدار ذہن اور شعور کی پختگی کی دلیل ہے۔

اور حکومت انگریزی نظام پر اتنی بلند آہنگی۔ اور بے باکی سے طنز اور اعتراض ایک قابل تعریف جرات مندانہ قدم انداز تحریر میں بڑی شگفتگی اور تیکھا طنز ہے۔ مقتول کی لاش کا پتہ نہیں اس پہ جمعدار کہتا ہے۔

"سرکار مقتول کی لاش کہاں ہے — ؟

داروغہ جی جواب دیتے ہیں :

"تو بہ عجیب گھونگے ہو۔ جو بات آدمی کی سمجھ میں نہ آئے اس کا کہنا کیا ضرور ہے۔ پہلے قاتل کا کھوج لگاؤ تو لگاؤ۔ مقتول کی لاش بھی مل جائے گی۔ اور اگر نہ بھی ملے تو قتل تو قتل ہے۔ ابھی تو زندہ پکڑو۔ مردہ تو مردہ ہے۔ اس کی فکر پھر کر لینا۔ سمجھے۔"

اس "سمجھے" میں ناکارہ نظام حکومت کے ہر شعبے کی تصویر ہے — اور یہی قاضی عبدالغفار

کے فن کی عظمت کی دلیل۔

''ہر چیز کا نتیجہ بدلے ''

قصبے کے ماسٹر جی کا مزاحیہ خاکہ ہے۔ جس میں قاضی کا قلم اپنی جولانیاں دکھاتا ہے۔ اور خاکہ نگاری کی کامیاب مثال پیش کرتا ہے۔ ایک آدھ جھلک آپ بھی دیکھ لیجیے۔

''عمر پچاس اور پچپن کے درمیان داڑھی کھچڑی اور اس کے بال الجھے ہوئے۔ الجھے ہوئے اس لیے کہ اس کے سلجھانے کی طرف کبھی بڑے ماسٹر صاحب توجہ کر ہی نہ سکتے تھے۔ وجہ یہ کہ بازار میں کنگھیوں کی قیمت بہت زیادہ تھی تین چار حتیٰ کہ پانچ پیسے۔ اس عام گرانی کے باعث ماسٹر صاحب نے بازار جانا ہی ترک کر دیا تھا۔

آگے کہتے ہیں:

''بات وہ صرف اتنی ہی کرتے تھے جتنی کہ بالکل ناگزیر ہو بہت سے مطالب وہ محض اشاروں ہی سے ادا کر دیتے تھے مثلاً اگر کلاس میں سبق پڑھاتے پڑھاتے ان کو پیاس لگی تو وہ کبھی یہ نہ کہتے تھے کہ پانی لاؤ۔ مجھے پیاس لگی ہے۔ بلکہ اپنے مخصوص اشاروں اور مخففات سے کام لیتے تھے یعنی آہستہ سے کہا 'لاؤ' اور ہاتھ کی انگلیوں سے پیالے کی شکل بنا کر دکھا دی۔''

یہ پورا خاکہ ایسے ہی شوخ اور دلکش رنگوں سے مل کر بنا یا ہے اور پڑھنے والوں کو ہنسایا ہے۔ یا کم از کم زیر لب تبسم پر مجبور کیا ہے۔

غرض یہ کہ قاضی عبدالغفار کا قلم ہر صنف میں ایسا زندہ اور متحرک ادب پیش کرتا ہے جو کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔ وہ ہندوستان کے سماج اور مزاج سے پوری طرح آشنا تھے۔

جو کچھ لکھا وہ پورے خلوص اور ایمانداری سے لکھا۔ اور بقول ان کے قلم میں گرمی بھی ہے۔ نرمی بھی۔ رنگینی بھی سنگینی بھی زمین پیسے کا چھوکری میں ان کا قلم اپنے پورے عروج پر ہے ایک ماہر نفسیات کی طرح زندگی کے پوشیدہ گوشوں پر جس طرح انھوں نے نظر ڈالی ہے۔ عام آدمی کی نظر ان تک نہیں پہنچ سکتی۔

پروفیسر عنوان چشتی

ابوالکلام آزاد کی شخصیت

آثارِ ابوالکلام آزاد کی روشنی میں

میری نگاہ میں شخص اور شخصیت میں فرق ہے۔ شخص کے شخصیت بننے کا عمل فطرے کے گوہر بننے کا عمل ہے۔ دُنیا میں اَن گنت اشخاص ہیں مگر شخصیتیں کم ہیں۔ شخص کا دائرۂ فکر و عمل بہت ذاتی اور محدود ہوتا ہے۔ اکثر اشخاص متاثر ہوئے ہیں، موثر نہیں بن پائے۔ شخصیت اپنے دائرہ فکر و کار کی وسعت، عظمت، افادیت اور اثر انگیزی سے پہچانی جاتی ہے اور اُس کا دائرہ فکر و کار وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ نیز وہ مشکِ نافہ کی طرح اپنے گرد و پیش کو معطر اور متاثر کرتی رہتی ہے۔ شخصیت فعال اور متحرک ہو کر ماحول اور سماج کے مزاج پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کو اپنے رنگ میں رنگتی ہے۔ ہر شخصیت اپنی کسی غالب خصوصیت اور کار آگہی کی بنا پر تہذیب و سماج کے کسی ایک دائرے میں زیادہ سرگرم کار ہوتی ہے۔ اور اُسی نسبت سے پہچانی جاتی ہے۔ مثلاً ادب کی نسبت سے ادبی شخصیت۔ سیاست کی نسبت سے سیاسی شخصیت وغیرہ۔ لیکن بعض شخصیت ایسی ہوتی ہے جو کسی ایک دائرے تک محدود نہیں ہوتی۔ اس کی کئی کئی نسبتیں دائرہ اثر و نفوذ سماج اور زندگی کے کسی ایک دائرے تک محدود نہیں ہوتا بلکہ وہ زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو متاثر کرتی ہے۔ اور سماج کے بہت سے دائروں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایسی شخصیت میں متعدد خصوصیات جمع ہو جاتی ہیں، جو بظاہر ایک دوسرے سے متضاد یا متصادم نظر آتی ہیں لیکن ایسی شخصیت تضاد میں یک رنگی اور تصادم میں ہم آہنگی پیدا کر کے سماج اور زندگی کے متعدد خارزاروں میں اپنے فکر و کار کے پھول کھلاتی ہے۔ اور ”غیر معمولی ہمہ جہت“ شخصیت کہلاتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک ایسی ہی غیر معمولی اور ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے جس نے ادب، تہذیب، مذہب، سیاست اور سماج کے مختلف میدانوں میں اپنے تخلیقی جوہر، بصیرت اور سوز و طرزِ تحریر کار سے سماج اور زندگی کے دامن پر اہم اور اثر انگیز، دیرپا اور دور رس نقوش بنائے ہیں۔ قاضی عبدالغفار نے آثارِ ابوالکلام آزاد میں مولانا آزاد کی تحریروں کا نفسیاتی مطالعہ پیش کر کے اُن کی شخصیت کی ایک دلآویز تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک مشکل کام ہے۔ اس کا اندازہ خود قاضی عبدالغفار کو بھی تھا۔ انھوں نے لکھا ہے

"کتنا مشکل کام ہے۔ کسی بڑی شخصیت کی خصوصیات کا صحیح اندازہ کرنا اور اس سے بھی زیادہ مشکل ہے اس اندیشے کو دل سے نکالنا کہ کہیں ہم غلط اندازہ تو نہیں کر رہے ہیں" (آثارِ ابوالکلام آزاد ص ۳)

واقعہ یہ ہے کہ جس طرح ایک کتاب کسی دوسری کتاب کا بالکل نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ایک شخص دوسرے شخص کا سو فی صدی مثیل نہیں ہو سکتا۔ ناظر منظور کی، شاہد مشہود کی، ناقد تخلیق کار کی شخصیت کا سو فی صدی سچا ادراک نہیں کر سکتا۔ دونوں کی الگ الگ حیثیت ہوتی ہے۔ نقاد اپنی شخصیت کے حدود اور امکانات میں فن کار کی شخصیت کا ادراک کرتا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ نقاد اپنی شخصیت کے آئینے میں ایک خاص انداز سے تخلیق کار کی شخصیت کا جلوہ دیکھتا ہے۔ قاضی عبدالغفار نے ابوالکلام آزاد کی شخصیت کا جو نفسیاتی مطالعہ پیش کیا ہے وہ بھی اس اصول سے مبرا نہیں ہے۔

قاضی عبدالغفار نے ابوالکلام آزاد کو ایک مشکل شخص Difficult personality قرار دیتے ہوئے لکھا ہے۔

"مولانا ایک بہت مشکل 'انسان' ہیں۔ مشکل اس اعتبار سے کہ اُن کی شخصیت اپنی ایک "مخصوص مرکزیت میں خلوت نشیں" رہتی ہے۔ اور عوام کی نظر کا مرکز بننا گوارا نہیں کرتی۔ مشکل اس لیے بھی کہ اُن کی "انفرادیت" عوام کی نفسیاتی سطح سے اس قدر بلند ہے کہ کوئی عامی کسی عام پیمانے سے اُسے ناپ تول نہیں سکتا۔ جس طرح غلّہ تولنے کی ترازو میں ہم موتی نہیں تول سکتے۔ اسی طرح

مولانا کی نفسیات کے لیے بھی کسی "عام پیمانے" کے بجائے ایک "مخصوص پیمانے"، مقیاس اور ایک طاقتور خوردبین کی ضرورت ہے۔" (آثارِ ابوالکلام آزاد ص ۱۷۶)

قاضی عبد الغفار نے مولانا ابوالسکلام آزاد کی شخصیت کو اپنی "مخصوص مرکزیت میں خلوت نشیں" قرار دے کر اُس کو ناقابلِ فہم قرار دیا ہے۔ اور اُس کو ناپنے یا سمجھنے کے لیے کسی "مخصوص پیمانے" کی ضرورت پہ اصرار کیا ہے۔ ایک اور جگہ انھوں نے مولانا آزاد کی شخصیت کو "گنبدِ بے در" قرار دیا ہے۔

"مولانا کو دور سے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا انھوں نے ایک گنبد کے اندر جس کا کوئی دروازہ نہیں ہے (اور اگر ہے تو کوئی چور دروازہ ہے۔) اپنے وجودِ معنوی کو بند کر رکھا ہے۔" (آثارِ ابوالکلام آزاد ص ۱۸۰)

قاضی عبد الغفار نے ایک طرف مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کو ایک گنبدِ بے در کہا ہے اور ایسی شخصیت قرار دیا ہے، جو اپنی ذات کے صنم کدے میں خلوت نشیں ہے۔ اور دوسری طرف انھوں نے اربابِ فکر و دانش کی نارسائی اور عوام و خواص کی عدم دسترس کی طرف بھی ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

"عوام کی زندگی میں مولانا کی زندگی کا تصور کچھ ایسا ہے کہ گویا ان کے افکار کا ایک "اونچا مینار" ہے۔ اور مینار پہ ایک "بند حجرہ" ہے۔ اور اُس حجرے میں مولانا کی "معنوی شخصیت"، "خلوت نشیں" ہے۔ اور اُس خلوت کے پردوں کو ہاتھ لگانا ایک عامی تو کیا خواص کے لیے بھی مشکل ہے۔" (آثارِ ابوالسکلام آزاد ص ۱۷۷)

ان تحریروں سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ قاضی عبد الغفار نے ابوالسکلام آزاد کی شخصیت کا دیومالائی تصوّر پیش کیا ہے۔ اور اس دیومالائی تصوّر کو پیش کرنے میں یہ جذبہ زیریں لہر بن کر کام کر رہا ہے کہ صرف وہی مولانا کی "مشکل شخصیت" کو آسان بنا رہے ہیں۔ اور ان کے "گنبدِ بے در" میں جھانک کر کچھ خاص لمحے چرا رہے ہیں۔ اور انھیں لفظ و معنی کی شکل میں پیش

کر رہے ہیں۔ اور صرف وہی "اونچے مینار" کے بند حجرے کی "خلوت نشیں شخصیت" کے پردوں کو ہاتھ لگا کر ان کی پُر اسرار جنبشوں کو اپنے نفسیاتی مطالعے میں پیش کر رہے ہیں۔

قاضی عبدالغفار نے آثارِ ابوالکلام آزاد میں یہ تو لکھ دیا کہ یہ آزاد کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ ہے۔ مگر انھوں نے یہ واضح نہیں کیا کہ انھوں نے نفسیات کے کس نظریے سے آزاد کی شخصیت کا جائزہ لیا ہے۔ اِس کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی عبدالغفار نے ابوالکلام آزاد کی ذات وصفات، شخصیت اور فن کو نہ فرائڈ کے "نظریے تحلیلِ نفس" کی روشنی میں دیکھا ہے۔ اور نہ ہی ینگ کے "اجتماعی لاشعور" کے نظریے کی چاندنی میں دیکھا ہے۔ بلکہ مجھے کہنے دیجیے کہ انھوں نے ابوالکلام آزاد کے نفسیاتی مطالعہ میں کسی بھی نفسیاتی نظریے کو بنیاد نہیں بنایا ہے۔ قاضی عبدالغفار کا خیال ہے۔

"(۱) غبارِ خاطر اور مولانا کی بعض تحریروں کو اگر ایک پیمانہ بنائیں تو اس سے مولانا کی وارداتِ قلب کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے۔" (ص ۱۸۱)

"(۲) مولانا کی نفسیات کو ان کی تحریر کے پردوں میں تلاش کیا جائے۔ تاکہ اسی پس منظر میں مولانا کے فرمودات اور ادبی اسلوبِ بیان کا تجزیہ کیا جا سکے۔"

(ص ۱۸۱)

قاضی عبدالغفار نے تذکرہ، غبارِ خاطر، الہلال اور ابوالکلام آزاد کی دوسری تحریروں کا تجزیہ کرکے آزاد کی شخصیت کے نہاں خانے میں جھانکنے کی جو کوشش کی ہے، اُس کے پسِ پشت کوئی اصول کارفرما نہیں ہے۔ اصول سے میری مراد یہ ہے کہ انھوں نے ابوالکلام آزاد کی تحریروں کو نفسیات کے کسی مسلّمہ اصول اور قاعدے کے تحت نہیں پرکھا ہے۔ اس لیے اپنی تمام ترزیدہ ریزی اور نکتہ سنجی کے باوجود وہ کسی مخصوص نتیجہ پر نہیں پہنچے ہیں۔ بلکہ پریشاں نظری اور ریزہ خیالی کا شکار ہیں۔ قاضی عبدالغفار نے آزاد کی تحریروں سے ان کے اسلوب میں تکرار سے وارد ہونے والے بعض افکار کو بنیاد بنا کر یا آزاد کے طرزِ فکر کے غالب رجحان کو اساس قرار دے کر جو نتائج نکالے ہیں وہ عام مطالعہ کا نتیجہ تو قرار دیے جا سکتے ہیں۔ لیکن نفسیاتی مطالعہ کا حاصل تصور نہیں کیے جا سکتے۔

قاضی عبدالغفار نے مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کی خصوصیات کا تعین کرتے ہوئے کہا ہے کہ آزاد کی تحریروں میں انانیت، انفرادیت، خلوت پسندی اور کم آمیزی، خود پسندی اور خود اعتمادی، تنہا گزینی، مایوسی اور ضد، بُردباری اور تحمّل، عزم و استقلال، بے نیازی و قلندری، مذہبیت اور انسان دوستی وغیرہ کی خصوصیات ملتی ہیں۔ اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ یہ خصوصیات ان کی تحریروں کے ساتھ آزاد کے مزاج کا حصّہ بھی تھیں تو بھی نفسیاتی مطالعہ کا حق ادا نہیں ہوتا۔ نفسیاتی مطالعہ فن کار کی شخصیت کے نہاں خانوں میں جھانک کر ان اسباب و محرکات کی نشاندہی کرتا ہے، جنھوں نے اس کی تعمیر میں حصّہ لیا ہو۔ یہ محرکات سیاسی، سماجی اور تہذیبی نہیں ہوتے۔ بلکہ خالص نفسیاتی اور داخلی ہوتے ہیں۔ نفسیاتی مطالعہ فن پارے کے اسلوب اور اقدار پر محاکمہ بھی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی سطح میں چھپے ہوئے جگنوؤں کی تلاش کرتا ہے یعنی نفسیاتی اثرات کی چھان بین کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی فن کار کے تخلیقی عمل کا تجزیہ بھی کرتا ہے۔ قاضی عبدالغفار نے ابوالکلام آزاد کی شخصیت کی تشکیل کرنے والے نفسیاتی اسباب و محرکات پر روشنی نہیں ڈالی۔ آزاد کی تحریروں کے بطن کو تراش کر اس مشک نافے تک رسائی حاصل نہیں کی جس کو داخلیت یا نفسیات کا گہوارہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ قاضی عبدالغفار نے آزاد کے تخلیقی عمل یعنی ادب اور فن کے ادراکی، جذباتی اور تخیلی پہلو کا تجزیہ بھی نہیں کیا ہے۔ انھوں نے آزاد کی تحریروں کے کلیدی استعاروں، پیکروں اور علامتوں کو آزاد کے لاشعور اور اجتماعی لاشعور کا خارجی اظہار تصوّر کر کے ان کا نفسیاتی تجزیہ بھی نہیں کیا ہے۔ اور آزاد کے تخلیقی پیچ و خم کی نشاندہی بھی نہیں کی ہے۔ اس لیے یہ عمومی مطالعہ تو کہا جا سکتا ہے، نفسیاتی مطالعہ نہیں۔ قاضی عبدالغفار نے ابتدا میں صحیح لکھا تھا کہ آزاد کی شخصیت ایک متنوع اور پہلودار شخصیت ہے۔ مگر آزاد کی شخصیت کا تجزیہ کرنے میں انھوں نے عمومی نفسیاتی رویے سے کام لیا ہے۔ جس کی وجہ سے قاضی عبدالغفار کی بنائی ہوئی تصویر دلکش ہوتے ہوئے بھی ابوالکلام آزاد کی سچی تصویر نہیں ہے قاضی عبدالغفار کی قلمی تصویر کو میں نے دلکش محض اس خیال سے کہا ہے کہ قاضی صاحب نے ابوالکلام آزاد کی شخصیت کو دیومالائی بنا کر اور آزاد کی تحریروں سے سجا کر اپنے بے ساختہ، سلیس اور تازہ کار اسلوب میں پیش کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے پہلودار شخصیت کے

بارے میں خود ہی ایک جگہ تحریر کیا ہے۔

"انسان اپنی زندگی کے اندر کتنی مختلف زندگیاں بسر کرتا ہے۔ مجھے بھی اپنی زندگی کی دو قسمیں کر دینی پڑیں۔ ایک قید خانے کے باہر کی۔ ایک قید خانے کے اندر کی۔ قید کے باہر کی زندگی میں اپنی طبیعت کی افتاد بدل نہیں سکتا۔ خود رفتگی اور خود مشغولی مزاج پر چھائی رہتی ہے۔ دماغ اپنی فکروں سے باہر آنا نہیں چاہتا۔ اور دل اپنی نقش آرائیوں کا گوشہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بزم و انجمن کے لیے بارِ خاطر نہیں ہوتا لیکن یارِ شاطر بھی بہت کم بن سکتا ہوں۔" (غبارِ خاطر ص)

قاضی عبد الغفار نے آزاد کی قید کے اندر اور باہر کی زندگی کے گہرے نفسیاتی اثرات کی چھان بین بھی نہیں کی ہے۔ جہاں انھوں نے آزاد کے فکر و کار کی تہ میں غم زدگی اور بیچارگی کی لہر محسوس کی ہے وہاں بھی ان کا تجزیہ تشنۂ ثبوت اور کمزور ہے۔ ایک عام غلط فہمی ابو الکلام آزاد کے فن اور شخصیت پر کام کرنے والوں کو یہ ہے کہ آزاد نے اپنے خاندانی ماحول کے اثرات سے کلیتاً دامن چھڑا لیا تھا۔ قاضی عبد الغفار بھی اِس مُغالطے کا شکار ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض بنیاد پرست عالموں نے ابو الکلام آزاد کو تصوف دشمن قطار میں کھڑا کرنے کے لیے انھیں اپنی ہی طرح کا قدامت پسند اور بنیاد پرست عالم بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اِس رویے سے بھی بعض غلط فہمیوں کو راہ ملی ہے۔ ابو الکلام آزاد نے ایک صوفی گھرانے میں پرورش پائی تھی۔ اپنے گھر میں تصوف کی علمی اور عملی تصویر دیکھی تھی۔ مولانا آزاد نے بھی خود اتنا ہی لکھا ہے کہ وہ تصوف کے نام پر پیری مُریدی کی ظاہری رسوم و روایات کو پسند نہیں کرتے لیکن انھوں نے تصوف کی روح اور اس کے معنوی پہلو کی کہیں تردید نہیں کی۔ یعنی ابو الکلام آزاد نے تصوف کو کلیتاً مسترد نہیں کیا۔ اگر غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ آزاد کی تحریروں میں تصوف کے نظریوں اور اسرار و رموز کی جلوہ گری ہے۔ ان کی تحریروں میں صوفیانہ اندازِ فکر و نظر نیز متصوفانہ رویہ پوری طرح کار فرما ہے۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ جب آزاد درباری علماء یا علمائے سو کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کے قلم میں تردید، تکذیب اور حقارت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جب اللہ والوں اور صوفیوں کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا قلم رجز پڑھتا ہے،

رقص کرتا ہے اور انھیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔ اس معیار پر "تذکرے" اور "غبارِ خاطر" کو ہی پرکھ لیا جائے تو اس کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ ابوالکلام آزاد نے جہاں بھی اور رنگ زیب کا ذکر کیا ہے وہاں اُس کے نقطۂ نظر، مقصد اور طرزِ فکر و کار کی تردید اور تعلیط کی ہے۔ اور اُس کے مقابلہ میں دارا شکوہ اور سرمد شہیدؔ کے اندازِ فکر اور رویّے کی تائید کی ہے۔ اور ان دونوں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا سراسر غلط ہے کہ آزاد نے اپنے خاندان کے ماحول سے قطعاً بغاوت کی تھی۔ یا وہ تصوف کی محفل سے نکل کر مادہ پرستی کے آغوش میں جا بیٹھے تھے۔ انھوں نے موجودہ خانقاہی نظام کی بعض مروّجہ رسموں اور پیری مریدی کے بعض خارجی معاملوں کو ضرور مسترد کیا ہے۔ لیکن ان کی شخصیت اور تحریروں میں تصوف کی روح جلوہ گر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوف کی بنیادی فکر اور رویّہ ان کی شخصیت اور اسلوب کو دل نشیں اور معنی آفریں بناتا ہے۔

ابوالکلام آزاد کی شخصیت کو پوری طرح نہ سمجھنے کے اور بھی بہت سے اسباب ہیں۔ ایک تو ناقد مولانا آزاد کی شخصیت کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر، ذہنی وفاداری اور رویے کے تحت پیش کرنے کی سعیِ نامشکور کرتے ہیں جس سے ابوالکلام آزاد کی شخصیت سے پردے نہیں اٹھتے بلکہ اُس پر مزید پردے پڑ جاتے ہیں۔ جو پڑھنے والوں کے ذہن و فکر تک پہنچ جاتے ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ہر بڑی شخصیت کی طرح ابوالکلام آزاد کی ہمہ جہت اور رنگا رنگ شخصیت کے سارے گوشوں اور جلوؤں تک رسائی حاصل کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ بقول شخصے وہیں تک دیکھ سکتا ہے نظر جس کی جہاں تک ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ خود آزاد نے اپنے بارے میں شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے سحر انگیز اسلوب میں اتنے بیانات صادر کیے ہیں کہ عام پڑھنے والے کو اس سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ذہنی مرعوبیت، تضاد یا الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک عام قاری کبھی اپنی علمی کم مائیگی کے سبب کبھی آزاد کی بلند قامتی کی بدولت اور کبھی آزاد کے خطیبانہ جاہ و جلال کے سامنے احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ قاضی عبدالغفار اپنے دلکش اور جمال آفریں اُسلوب، تخلیقی جوہر اور تجزیاتی صلاحیت کے باوجود ابوالکلام آزاد سے بے حد مرعوب نظر آتے ہیں۔ اُن کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ انھوں نے کسی نفسیاتی نظریے کو بنیاد بنائے بغیر رولانسنگ کے انداز میں آزاد کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ

قاضی عبدالغفار اُردو تحریک کے علم بردار

قاضی عبدالغفار نہ صرف ایک ادیب، انشا پرداز، سوانح نگار، صحافی اور خطوط و ڈائری نویس تھے، بلکہ اردو تحریک کے ایک فعال قلم کار اور اس کے علم بردار بھی تھے۔ وہ تقسیم ملک کے بعد سے تادمِ آخر اردو تحریک کی باگ ڈور سنبھالے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولوی عبدالحق پاکستان جا چکے تھے، انجمن ترقی اردو (ہند) کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ اردو دنیا پر مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے اور اردو زبان کی راہ میں بے حد مشکلات تھیں۔ اردو کے مخالفین نے اس زبان کو مٹانے اور نیست و نابود کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اسے غیر ملکی اور پاکستانی کہنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا تھا۔ اربابِ حکومت کا بھی رویہ اردو کے ساتھ کچھ اچھا نہ تھا۔ بالخصوص اتر پردیش میں زبان کے مسئلے کو بے حد الجھا دیا گیا تھا اور اس کی ترقی کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کی جا رہی تھیں۔ یہاں کے سرکاری و غیر سرکاری حلقوں میں یہ کہا جانے لگا تھا کہ "اردو اس ریاست کی زبان نہ ہے اور نہ کبھی تھی"۔ ماتحت افسرانِ تعلیم کے متعصبانہ طرزِ عمل کی وجہ سے اردو زبان کے مسئلے نے اور بھی زیادہ پیچیدہ صورت اختیار کر لی تھی اور اس معاملے میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی مسلمہ پالیسیوں کی اعلانیہ خلاف ورزی کی جا رہی تھی۔ اسکولوں سے اردو کو یکسر کالعدم قرار دے دیا گیا تھا۔ عدالتوں، دفتروں اور کاروباری حلقوں سے بھی اردو کے اخراج کا سلسلہ جاری تھا۔

قاضی عبدالغفار تقسیم ملک کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) کے پہلے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے تھے۔ اس منصب کے تحت وہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے ترجمان پندرہ روزہ

"ہماری زبان" کے ایڈیٹر بھی مقرر ہوئے جس کی ادارت کے فرائض وہ تا دمِ آخر انجام دیتے رہے۔ بعد میں ہماری زبان ہفت روزہ ہو گیا۔ انجمن سے ان کی وابستگی کے پچھلے سات سال اردو کے تحفظ و بقا کے لیے جد و جہد میں گزرے۔ انھوں نے ہر محاذ پر اردو کی لڑائی لڑی۔ اور اس کے آئینی و جمہوری حقوق کی بحالی کے لیے ہر ممکن تدبیریں اور کوششیں کیں۔ انھوں نے فرقہ پرستوں سے لوہا بھی لیا اور متعصب سیاسی رہنماؤں اور ایوان حکومت کے تنگ نظر وزیروں سے اپنی جنگ بھی لڑی۔ ساتھ ہی انھوں نے اہل اردو کے دلوں کو بھی گرمایا اور ان میں حرکت و عمل پیدا کی۔

تقسیم ملک کے بعد بدلے ہوئے حالات میں قاضی صاحب کے نزدیک زبان کی خدمت اور ترقی سے زیادہ اس کے وجود کا تحفظ ضروری تھا۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو (ہند) کا رُخ بھی اسی سمت موڑ دیا۔ اور فرمایا کہ "اردو کی ترقی کے بجائے اب اس کی حفاظت کا سوال انجمن کے سامنے ہے۔" ایک اور موقع پر انھوں نے کہا کہ "مرکزی انجمن ترقی اردو کو اس طرح کے حالات نے مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے خاموش علمی مشاغل سے قطع نظر کر کے اردو زبان کی حفاظت کے میدان میں قدم بڑھائے۔" ۲۳ دسمبر ۱۹۵۱ء کو علاقائی زبان کے لکھنؤ کنونشن میں اسی بات کا اعادہ کرتے ہوئے اپنی تقریر میں انھوں نے کہا کہ "انجمن کو حکومت کے طرزِ عمل نے مجبور کر دیا ہے کہ وہ اب اردو زبان کو حکومت اور بعض نام نہاد کانگریسی لیڈروں کے پیدا کیے ہوئے خطروں سے بچانے کے لیے جد و جہد کرے۔" اس میں کوئی شک نہیں کہ انجمن کے پلیٹ فارم سے انھوں نے یہ جد و جہد اپنی زندگی کے آخری لمحات تک جاری رکھی۔

(۲)

قاضی عبد الغفار اردو کو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی میراث اور قومی اتحاد کی علامت سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک اردو کا مسئلہ صرف زبان کا ہی مسئلہ نہیں تھا بلکہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور قومی اتحاد کا مسئلہ تھا۔ وہ اس مسئلے کو خلوص کے ساتھ حل کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اردو کی حمایت میں نہ تو فرقہ پرستی کے جذبات سے کام لیا اور نہ ہندی کی مخالفت کی اور

نہ ہی انھوں نے اپنی پوری اردو تحریک کے دوران حکومت مخالف رویّہ اپنایا۔ وہ ہندی کی سرکاری و قومی حیثیت کو تسلیم کرتے تھے اور اس کا سیکھنا قوم کے نوجوانوں کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ "ہماری زبان" کے یکم فروری ۱۹۵۱ء کے اداریے میں وہ لکھتے ہیں:

"ہندی راج بھاشا ہے اور اس کا یہ مقام ہمیں تسلیم ہے، بلکہ ہم تمام ان لوگوں سے جن کی مادری زبان اردو یا ہندوستانی ہے بار بار کہتے رہے کہ راج بھاشا کا سیکھنا ان کا فرض ہے۔"

لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ:

"ملک کی تمام زبانوں کو جنھیں ہمارے دستور نے تسلیم کیا ہے آزادی کے ساتھ ترقی کرنے کا حق حاصل ہے اور ہونا چاہیے۔ کسی زبان کو خواہ وہ راج بھاشا ہی کیوں نہ ہو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی ترقی کے لیے دوسری زبانوں کی ترقی کا راستہ روکے ... ہر زبان کو ہمارے دستور نے اپنے طریقے پر ترقی کرنے اور پھلنے پھولنے کا حق دیا ہے۔"

قاضی صاحب گاندھی جی کی "مشترکہ زبان" کی پالیسی سے مکمل اتفاق کرتے تھے۔ وہ "ہندوستانی" کو اردو ہی کا ایک روپ سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں "اگر مہاتما جی کی تجویز کے مطابق دونوں رسم الخط جائز رکھے جاتے تو یہ فتنہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔"

قاضی صاحب ہندی کو ایک ایسی زبان سمجھتے تھے جو از سرِ نو بنائی جا رہی تھی اور جس کا نیا سانچا اور ڈھانچا تیار کیا جا رہا تھا، تاہم وہ اس کے سرکاری زبان بنائے جانے پر دل شکن نہیں۔ دل شکن تو وہ اس بات پر تھے کہ بعض نافہم اور تنگ نظر سیاسی رہنماؤں اور وزیروں نے سرکاری زبان کی ترقی کے لیے اردو کی بربادی کو ضروری سمجھ رکھا تھا۔ کبھی وہ اسے غیر ملکی زبان کہتے تھے تو کبھی اس کی حقیقت سے ہی انکار کرتے تھے اور کبھی یہ کہتے تھے کہ اردو اتر پردیش کی نہ علاقائی زبان ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ ان نامساعد حالات کے باوجود قاضی صاحب کو اردو کی بقا اور اس کی ترقی کا پورا یقین تھا۔ وہ دوسروں کو بھی اردو کے معاملے میں قنوطی ہونے سے روکتے تھے۔ "ہماری زبان" کے یکم جنوری ۱۹۵۱ء کے اداریے میں وہ لکھتے ہیں:

"پہلا سال گذرنے کے بعد اب گذشتہ تجربوں نے دوسرے سال کے لیے ہمارے ارادوں اور حوصلوں میں اضافہ کیا ہے، اور ہمارے اس گمان نے ایک عقیدے کی قوت حاصل کر لی ہے کہ اردو زبان یعنی ہندوستان کی مشترکہ زبان نہیں مٹ سکتی ہے بلکہ وہ ترقی کرے گی۔ اور اس کی راہیں بند نہیں کی جا سکتیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ جن لوگوں کی مادری زبان اردو ہے وہ شکست اور فرار کے غیر فطری اور نا معقول احساسات کو اپنے دلوں سے نکال دیں اور اس عقیدے کی پرورش کریں کہ ان کی زبان ملک کی مشترکہ زبان ہے، خالص ملکی زبان ہے، فرقوں اور مذہبوں کے اختلافات سے بالاتر ہے اور اس لیے زندہ رہے گی۔"

قاضی عبد الغفار اردو کے بارے میں اگرچہ رجائی انداز نظر رکھتے تھے، لیکن انھیں اس بات کا افسوس ضرور تھا کہ اردو اپنے ہی گھر میں بے گھر ہوتی جا رہی ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "دلی اور اتر پردیش کی ریاست اردو زبان کا وطن ہے لیکن اردو زبان اس وقت اپنے وطن ہی میں بہت زیادہ بے وطن ہو رہی ہے۔"

قاضی عبد الغفار پنجاب کے لسانی مسئلے سے بھی بخوبی واقف تھے وہ اردو کے مسئلے کو پنجابی کے مسئلے سے بالکل مختلف نوعیت کا مسئلہ تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک پنجابی کا مسئلہ ایک سیاسی مسئلہ تھا جس کی جڑیں ایک علاحدہ ریاست کے قیام تک پہنچتی تھیں۔ نیز پنجابی زبان کی تحریک میں ہندی کی مخالفت کا عنصر شامل تھا۔ جب کہ اردو تحریک ایک بالکل غیر سیاسی تحریک تھی اور ہندی سے اس کا کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ یکم اپریل ۱۹۵۱ء کے "ہماری زبان" کے اداریے میں وہ انھیں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"درحقیقت مشرقی پنجاب اور اتر پردیش کے معاملوں میں ایک بڑا فرق ہے جس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ مشرقی پنجاب کے اس قضیے کی بنیاد سیاسی ہے، اس لیے کہ سکھ اور پنجابی اپنی ایک ریاست علاحدہ چاہتے ہیں اور اسی لیے وہ زبان کے معاملے میں ہندی کے خلاف پنجابی زبان کو قائم رکھنا چاہتے ہیں لیکن اتر پردیش میں اردو کی حفاظت کا مسئلہ سیاسی نہیں ہے۔ یہاں تو صرف اتنا ہی معاملہ ہے کہ

اردو کو (جو اس صوبے کی عام زبان ہے اور تھی) اب اسے علاقے کی زبان تسلیم نہیں کیا جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ مشرقی پنجاب میں پنجابی زبان کے حامیوں نے ہندی والوں کے خلاف ایک زبردست محاذ بنا لیا ہے لیکن اترپردیش میں اردو اور ہندی کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہے ۔ اردو والے نہ تو کوئی لسانی ریاست بنانا چاہتے ہیں نہ وہ ہندی کو ملک کی سرکاری زبان تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اور نہ انھیں ہندی پڑھنا اور اپنے بچوں کو پڑھانا ناگوار ہے ۔ بلکہ وہ سرکاری زبان کی ترقی میں ہر طرح مدد کرنے پر آمادہ ہیں ۔ البتہ وہ اردو زبان کو جس میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا بہت بڑا سرمایہ محفوظ ہے ایک علاقہ داری زبان کی حیثیت سے محفوظ کرنا چاہتے ہیں اور اس کے جائز حقوق پر اصرار کرتے ہیں جو ملک کی باقی تیرہ۱۳ زبانوں کو حاصل ہیں ۔"

(۳)

تقسیم ملک کے بعد جب انجمن ترقی اردو (ہند) کی از سر نو شیرازہ بندی کی گئی اور قاضی عبدالغفار اس کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے تو انھوں نے لسانی حالات کا بغور جائزہ لیا اور اردو زبان کی تعلیم کے اعتبار سے سب سے خراب حالت یوپی کی دیکھی ۔ یہاں کے ۵۰ ہزار سے زیادہ اسکولوں میں سے بہت سے اسکولوں میں کسی نہ کسی بہانے اردو کی تعلیم کا انتظام ختم کر دیا گیا تھا جن بچوں کی مادری زبان اردو تھی وہ اور ان کے والدین اور سرپرست اس صورتِ حال سے سخت آزردہ اور پریشان تھے ۔ مرکزی انجمن اور اس کی شاخوں کو آئے دن اس قسم کی شکایتیں موصول ہوتی رہتی تھیں اور انھیں دور کرنے کی تدابیر بھی کی جاتی تھیں لیکن ان سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تھا ۔ پانی سر سے اونچا ہوتا ہوا اس وقت نظر آیا جب یوپی میں لکھنؤ میونسپل بورڈ کے سرل مصاحب گنج کے ڈیڑھ سو سے زیادہ طلبا جن کی مادری زبان اردو تھی اور جو اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے انھیں ہیڈ ماسٹر نے یہ کہہ کر داخل کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اردو کے ذریعے تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ۔ ان طلبا کے سرپرست میونسپل حکام سے ملے لیکن کوئی اطمینان بخش جواب نہ ملا ۔ اس

کے بعد وزیر تعلیم سے درخواست کی لیکن جواب دصول نہیں ہوا۔ اس لیے قاضی صاحب نے اس مسئلے کو "اجتماعی محاذ" پر حل کرنے کی جدوجہد کا اعلان کیا۔ یہ اردو کی حمایت میں شروع کی جانے والی پہلی عوامی تحریک کا اعلان تھا۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے ان کے لیے مادری زبان میں تعلیم کی آسانیاں فراہم کی جائیں۔

اس مقصد کے حصول کے لیے قاضی عبدالغفار نے انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخ لکھنؤ کی مدد سے ان والدین اور سرپرستوں کے جو اپنے بچوں کو اردو کے ذریعہ تعلیم دلانا چاہتے ہیں "دس ہزار دستخط ایک محضرنامے پر حاصل کرنے کی تحریک شروع کی۔ یہ دستخطی مہم اس لیے شروع کی گئی تھی کہ یو پی کے افسران تعلیم حکومت ہند کی اس لسانی پالیسی کی خلاف ورزی کر رہے تھے جس کی رو سے اردو بولنے والے طلبا کو مادری زبان ہی میں تعلیم حاصل کرنے کا حق دیا گیا تھا۔

حکومت ہند کی قرارداد شائع کردہ محکمۂ تعلیم نمبر ڈی $\frac{91}{48}$ ۳۷ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۴۸ء میں بنیادی اسکولوں میں تعلیم کے متعلق سرکاری پالیسی ان الفاظ میں واضح کی گئی تھی۔

"جونیر بنیادی مرحلے میں ذریعۂ تعلیم اور ذریعۂ امتحان مادری زبان ہوگا اور جہاں مادری زبان علاقائی یا سرکاری زبان سے مختلف ہو وہاں مادری زبان میں تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اور کم از کم ایک ٹیچر رکھا جائے۔ اس صورت میں کہ اس زبان کو بولنے والے طلبا کی تعداد اسکول میں ۴۰ سے کم نہ ہو۔ یا کلاس میں کم از کم دس طلبا ہوں۔ مادری زبان وہ ہوگی جس کا اعلان والدین یا سرپرست کی طرف سے کیا جائے۔"

اس قرارداد میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ حکومت ہند کی رائے یہی ہے کہ تمام صوبائی اور ریاستی حکومتیں مذکورہ بالا پالیسی پر کاربند ہوں۔

لیکن اس کے باوجود شری آر۔ ایس سنہا نے جو لازمی تعلیم کے اسپیشل آفیسر تھے میونسپل بورڈوں کے چیرمینوں کو حسب ذیل تحریر بھیجی تھی:

"مجھے یہ کہنے کی ہدایت ہوئی ہے کہ حکومت کا حکم یہ ہے کہ تمام ابتدائی مدرسوں میں ہندی کو لازمی مضمون ہونا چاہیے۔ اردو کی تعلیم پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اگر اردو کو پڑھانا چاہیں تو وہ ایک اختیاری مضمون ہو۔ لہٰذا تمام طلبا پر بلالحاظ

ذات اور قوم لازم ہوگا کہ وہ ہندی پڑھیں۔ وہی نصاب کے دوسرے مضمونوں
کو پڑھانے کا ذریعہ ہو۔"

یہ تحریر سراسر حکومتِ ہند کی ہدایات کی خلاف ورزی تھی۔ اس کے جاری ہوتے ہی اردو تمام میونسپل اسکولوں سے خارج ہوگئی۔ اسی زمانے میں ان اسکولوں میں بھی جو ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ماتحت تھے اردو کی تعلیم روک دی گئی اور باوجود بارہا معروضے اور یاد دہانیاں پیش کرنے کے ریاستی حکومت اس بے انصافی کو رفع نہ کر سکی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بچے جن کی مادری زبان اردو تھی، اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے محروم ہو گئے۔ صرف یہی نہیں ہوا بالکل حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بہت سے بچوں کی مادری زبان جو کل تک ان اسکولوں میں اردو لکھی ہوئی تھی بچوں کے سرپرستوں کے مشورے کے بغیر ہندی ہو گئی۔ مرکزی انجمن نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر کے اس کی چھان بین کرائی تو بات صحیح نکلی۔ اس لیے انجمن کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ دس ہزار دستخطوں سے وزیرِ تعلیم سے وفد کی شکل میں ملا جائے۔

دستخطی مہم کا کام بہت تیزی کے ساتھ شروع کیا گیا اور شہر لکھنؤ کے صرف ایک حصے سے دس ہزار دستخط حاصل کیے گئے۔ لیکن یہ طے کیا گیا کہ اگر ضروری ہوا تو صوبے سے لاکھوں والدین کے دستخط حاصل کیے جائیں گے جن کے بچے اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جب دستخطی مہم کا کام مکمل ہو گیا تو ۲۲ مئی ۱۹۵۱ء کو انجمن ترقی اردو (ہند) کے (رسالت) اراکین پر مشتمل ایک وفد نے ڈاکٹر ذاکر حسین صدر انجمن کی قیادت میں عزت مآب ڈاکٹر سمپورنانند، وزیرِ تعلیم، حکومتِ اترپردیش سے ملاقات کی اور انجمن کی طرف سے ایک ایک عرضداشت ان کی خدمت میں پیش کی جس کے الفاظ یہ تھے:

"اس وفد کے اراکین جو انجمن ترقی اردو (ہند) اور یوپی میں اس کی شاخوں کے نمائندے ہیں اس صوبے میں اردو بولنے والوں کی شکایات کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانا چاہتے ہیں ...... ہم حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ

(۱) مادری زبان کی حیثیت میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے متعلق سرکار کی پالیسی از سرِ نو واضح کی جائے۔

(۲) واضح الفاظ میں یہ اعلان کر دیا جائے کہ جہاں مطالبہ ہو وہاں اسکول اردو ذریعے تعلیم دینے کا انتظام کریں گے۔

(۳) متعلقہ اداروں اور شخصوں کے نام ہدایت جاری کر دی جائے کہ طالب علم کی مادری زبان کا تعین اس کے والدین یا سرپرست کریں گے۔ کوئی افسر یا ہیڈ ماسٹر مطلق العنان طور پر نہ کرے۔

(۴) طلبا کو اردو نصاب کی کتابیں بہم پہنچتی رہیں۔

وفد نے وزیر تعلیم کی خدمت میں دس ہزار والدین اور سرپرستوں کے دستخط بھی پیش کیے جن کے بچے اردو میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اگرچہ وزیر تعلیم نے وعدہ کیا کہ وہ وفد کی شکایات پر توجہ فرمائیں گے لیکن ان شکایات کو رفع کرنے کے لیے حکومت کی جانب سے کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا گیا۔ اور انجمن کی اس جدوجہد کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

اس کے بعد قاضی صاحب نے "ہماری زبان" کی یکم ستمبر ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں یہ اعلان کیا کہ "اتر پردیش میں جہاں اردو سب سے زیادہ خطرے میں ہے اس کی حفاظت کا یہ قدم، آخری قدم نہیں ہے۔ اس کے بعد ایک بنیادی مسئلے کے متعلق اہم تر اقدامات کا راستہ صاف کرنا ہے اور مرکزی انجمن چاہتی ہے کہ اس کی تمام شاخیں اس کام کے لیے میدان تیار کریں۔"

یہ دراصل اعلان تھا اس زبردست عوامی تحریک کا جس نے ایوانِ حکومت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

(۴)

۱۹۵۱ء میں یوپی کی صوبائی اسمبلی میں زبان کے قانون پر مباحثہ ہوا جس میں وزیر تعلیم ڈاکٹر سمپورنانند نے کھل کر اردو کی مخالفت کی۔ انھوں نے فرمایا:

"اب یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہندی اس ریاست کے باشندوں کی زبان ہے۔"

مباحثے کا جواب دیتے ہوئے اور اس مطالبے کو کہ اتر پردیش میں اردو کو علاقائی زبان تسلیم کیا جائے وزیر تعلیم نے فرمایا:

"یو پی کا کوئی علاقہ بھی ایسا نہیں جہاں اردو بولی جاتی ہو۔ اردو تو صرف ہندی کی ایک دوسری شکل ہے . . . . اردو تو ہندوستان کے کسی حصے کی بھی علاقائی زبان نہیں ہے . . . اردو کو علاقائی زبان تسلیم کرنے کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔"

وزیر تعلیم نے دستور کی فہرست VIII میں اردو کے نام کے اندراج کو بھی اپنے تعصب کا نشانہ بنایا اور فرمایا کہ انھیں نہیں معلوم کہ

"ایسا کیوں کیا گیا یہ تو صرف دستور بنانے والے ہی بتا سکتے ہیں۔"

وزیر تعلیم کے ان بیانات سے اردو والوں میں تشویش کی ایک لہر دوڑ گئی، چنانچہ انجمن ترقی اردو (ہند) نے ایک نئی نہج اور ایک نئی تنظیم کے ساتھ اردو تحریک کو چلانے کا عزم کیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے جو انجمن ترقی اردو (ہند) کے ایک رکن تھے بہار ریاستی اردو کانفرنس کے پٹنہ اجلاس میں ۱۲ مئی ۱۹۵۱ء کو اپنا صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پہلی بار محبانِ اردو کی توجہ ہند کے دستور کی دفعہ ۳۴۷ کی طرف مبذول کرائی کہ جن صوبوں میں اردو بولنے اور جاننے والوں کی تعداد کافی ہے وہاں اردو کو دفعہ ۳۴۷ کے ماتحت صدر جمہوریہ کی ہدایت پر علاقائی زبان قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس دفعہ کے الفاظ یہ ہیں :

"اس مطالبے کے پیش ہونے کے بعد اگر صدر کو اطمینان ہو جائے کہ کسی ریاست کی آبادی کا کوئی معقول حصہ کسی زبان کے متعلق جسے وہ بولتا ہے یہ چاہتا ہے کہ اس کو ریاست تسلیم کرے تو صدر کو اختیار ہوگا کہ وہ اس بات کی ہدایت کریں کہ تمام ریاست میں یا اس کے کسی حصے میں ایسی اغراض کے لیے جن کی وہ صراحت کریں، یہ زبان سرکاری طور پر تسلیم کی جائے۔"

یہیں سے آئین کی دفعہ ۳۴۷ کا سہارا لے کر جمہوری و دستوری طور پر اردو کے حق کو منوانے کی کوششوں کا آغاز ہوا جس نے ایک بہت بڑی عوامی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔

قاضی عبدالغفار نے اس مقصد کے لیے ۲۳ دسمبر ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ میں ایک علاقائی زبان کنونشن منعقد کیا جس کی صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین، صدر انجمن ترقی اردو (ہند) نے فرمائی۔ علاقائی زبان کی تحریک کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ قاضی صاحب نے اپنی تقریر میں یہ واضح کر دیا تھا کہ "ہماری

تحریک قطعاً غیر سیاسی اور محض دستوری اور آئینی ہے۔ یہ کوئی سیاسی شورش نہیں ہے بلکہ ایک اجتماعی دستوری مطالبہ ہے جو ایک محضر کی صورت میں پیش کیا جائے گا۔" محبانِ اردو یہ مان کر چلے تھے کہ اتر پردیش کی سرکاری زبان ہندی ہے لیکن اگر صدر جمہوریہ کو اس بات کا اطمینان دلا دیا جائے کہ یہاں کی آبادی کا کافی حصہ اردو بھی بولتا ہے اور اس کے موافق بھی ہے تو اردو بھی سرکاری طور پر یہاں کی زبان مان لی جائے گی۔ اردو والوں کے سامنے اب سوال صرف ثبوت بہم پہنچانے اور صدر جمہوریہ کو مطمئن کرنے کا تھا۔ چنانچہ قاضی صاحب نے کہا کہ "ہم نے بہت غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب ہم اردو کے حقوق کو محفوظ کرنے کے لیے ایک دستوری محاذ قائم کریں۔ اس مطالبے کو ایک محضر کے ذریعے جس پر بیس لاکھ دستخط ہوں پیش کیا جائے گا۔" ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا کہ "میں اس بات کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ اردو کا مسئلہ ہندی اردو رقابت کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہم سرکاری زبان کو دل سے قبول کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اردو بولنے والے بھی ہندی سے محبت کریں اور اس زبان میں قابلیت حاصل کرنا اپنے لیے قابلِ فخر سمجھیں۔ اسی طرح یہ مسئلہ نہ تو سیاسی ہے اور نہ فرقہ پرستی کے ادنیٰ جذبے پر مبنی ہے۔

اس کام کو کرنے کے لیے یعنی لاکھوں دستخط حاصل کرنے کے لیے تمام ضلعوں میں پھر ان ضلعوں کے قصبوں اور دیہاتوں میں سینکڑوں مراکز قائم کیے گئے۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے ہزار ہا کارکن رکھے گئے۔ نشر و اشاعت کا سلسلہ بھی تمام صوبے میں جاری رکھا گیا۔ لاکھوں کی تعداد میں فارم چھپوائے گئے۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے سرمایے کی فراہمی کا بھی ایک بڑا مسئلہ تھا چنانچہ مرکزی انجمن کے تحت ایک سنٹرل فنڈ قائم کیا گیا جس کے لیے صوبے کے اضلاع اور دوسرے صوبوں سے رقمیں حاصل کی گئیں۔ لکھنؤ کے ۲۳ دسمبر ۱۹۵۱ء کے علاقائی زبان کنونشن میں شامل پورے صوبے کے تمام نمائندوں سے قاضی صاحب نے اپیل کی کہ وہ تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے پوری کوشش کریں۔ اس تحریک کی چند حلقوں کی جانب سے مخالفت بھی ہوئی جس کا قاضی صاحب نے منہ توڑ جواب دیا۔

تقریباً ۱۷ مہینوں کی لگاتار محنت کے بعد ۲۰ لاکھ دستخط جمع ہو گئے۔ ۳۱ مئی ۱۹۵۳ء کو دستخطی مہم روک دی گئی اب ان کی جانچ اور ترتیب کا کام شروع ہوا۔ ۲۶ جولائی ۱۹۵۳ء

کو لکھنؤ میں ورکرس کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین صدر انجمن نے فرمائی۔ اس کانفرنس میں ذیل کی قرارداد منظور ہوئی۔

یہ جلسہ دسمبر ۱۹۵۱ء کے کنونشن کی قرارداد کے مطابق انجمن ترقی اردو (ہند) کو مجاز کرتا ہے کہ وہ صدر جمہوریۂ ہند کی خدمت میں ایک وفد لے کر جائے اور ایک عرضداشت کے ساتھ یہ دستخط پیش کرکے درخواست کرے کہ جمہوریۂ ہند کے دستورِ اساسی کی دفعہ ۳۴۷ کے مطابق اردو بولنے اور لکھنے والوں کی اتنی بڑی تعداد کے پیشِ نظر ہندی کے علاوہ اردو زبان اور رسم الخط کو بھی اس صوبے میں تمام عوامی ضروریات کے لیے سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے۔"

انجمن ترقی اردو (ہند) کے وفد نے جس میں قاضی عبدالغفار بھی شامل تھے، ڈاکٹر ذاکر حسین صدر انجمن ترقی اردو (ہند) کی قیادت میں یکم فروری ۱۹۵۴ء کو ۵ بجے شام صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد سے ملاقات کی اور بیس لاکھ دستخطوں کے ساتھ اپنی عرضداشت پیش کی لیکن جیسا کہ محبانِ اردو جانتے ہیں اس سے کچھ حاصل نہ ہوا اور قاضی صاحب صدرِ جمہوریہ کے فیصلے کا انتظار کرتے کرتے ۱۶ جنوری ۱۹۵۶ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

(۵)

قاضی عبدالغفار کی اردو تحریک کا ایک مثبت اور نمایاں پہلو یہ تھا کہ یہ ایک سیکولر تحریک تھی۔ اور فرقہ واریت سے اس کا دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ یہ کوئی سیاسی تحریک بھی نہیں تھی۔ یہ تحریک ہندی کے خلاف بھی نہ تھی۔ قاضی صاحب نے اپنی تقریروں میں جگہ جگہ یہ بات دہرائی ہے۔ انھوں نے اس تحریک کو فرقہ واریت اور سیاسی جھگڑوں سے پوری طرح محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ بعض فرقہ پرستوں نے جب اس تحریک کو اردو ہندی تنازعے کا رنگ دینے کی کوشش کی تو قاضی صاحب نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ انھیں ہندی کی سرکاری حیثیت تسلیم تھی اور اس کی ترقی کے وہ دل سے خواہاں تھے۔ ان کی اردو تحریک کا مقصد صرف اتنا تھا کہ اردو بولنے والوں کو ان کا جمہوری و دستوری حق مل جائے جس سے وہ محروم کر دیے گئے ہیں۔ اردو کے اس حق کو منوانے کے لیے انھوں نے وسیع پیمانے پر جو تحریک شروع کی تھی اور جس دستخطی مہم کا آغاز

کیا تھا اسے ہندوؤں کی بھی زبردست تائید حاصل تھی۔ اس کے باوجود اس تحریک کی مخالفت ہندو مہاسبھا کے نیتاؤں کی جانب سے بڑی شد و مد کے ساتھ ہوئی تھی اخبارات میں آئے دن ان کے بیانات شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان نیتاؤں نے اپنی تحریر و تقریر میں اس تحریک کے خلاف زہر افشانی اور جھوٹا پروپیگنڈا کرنا اپنا شعار بنا لیا تھا۔ وہ ہندوؤں کو تلقین کرتے تھے کہ وہ اردو کی حمایت میں دستخط نہ کریں" کیوں کہ یہ پاکستانی ذہنیت کے مسلمانوں کی ہندی کو ختم کرنے کی ایک گہری سازش ہے جس سے ہر ہندو کو ہوشیار رہنا چاہیے۔" ہندو مہا سبھائی نیتا یہ تک کہنے سے گریز نہیں کرتے کہ "اردو کی حمایت کرنا ہندو دھرم، ہندو راشٹر اور ہندی بھاشا کی مخالفت کرنا اور ان کی جڑوں پر کلہاڑا چلانا ہے جس سے ہر ہندو کو بچنا چاہیے۔" ہندو مہاسبھا کے نیتاؤں کے ان بیانات کا عام ہندوؤں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا کیوں کہ اردو تحریک اور دستخطی مہم کی تائید میں جو بیانات مختلف اضلاع سے قاضی صاحب کے پاس آئے تھے ان پر ۲۰ فی صد سے زیادہ ہندو بھائیوں کے دستخط ہوتے تھے۔ ہندو مہاسبھائی نیتاؤں کے علاوہ ہندی ساہتیہ سمیلن بھی اس تحریک کی مخالفت میں پیش پیش تھی۔ وہ اردو کی اس تحریک پر فرقہ پرستی کا لیبل لگا کر غیر مسلم اکثریت کو اس کے خلاف بھڑکانا چاہتی تھی۔

قاضی عبدالغفار نے جب انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کا عہدہ سنبھالا تو اس کے فوراً بعد ہی ہندوستان میں ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ قاضی صاحب کو یہ معلوم تھا کہ مردم شماری کا عملہ اردو کے اندراجات کے سلسلے میں کس طرح دھاندلی کرتا ہے۔ اور اس کی کرشمہ سازیوں سے مردم شماری کے اعداد و شمار کس طرح زیر و زبر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس اہم مسئلے کو بھی اپنی اردو تحریک کا جزو بنا لیا۔ جیسے ہی مردم شماری کا آغاز ہوا، اردو والوں کی جانب سے شکایتیں موصول ہونا شروع ہو گئیں کہ زبان کے غلط اندراجات ہو رہے ہیں۔ قاضی صاحب نے ایک تحریک کے طور پر اس بات کی کوشش کی کہ زبان کے اندراج میں بدعنوانی نہ ہو۔ اس سلسلے میں انھوں نے اردو بولنے والوں کو جرأت اور ہمت سے کام لینے اور دشواریوں پر قابو پانے کی ترغیب دی اور دوسری طرف متعلقہ حکام اور افسران سے بھی رابطہ پیدا کر کے ان شکایات کو دور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور مردم شماری

کا عمل زبان کے اندراجات کے سلسلے میں اسی طرح بدعنوانی کا مرتکب ہوتا رہا قاضی صاحب نے اس کے لیے ایک موثر تنظیم کی ضرورت پر زور دیا۔

قاضی صاحب کے خیال میں زبان کے خانے میں غلط اندراجات لسانی تعصب کی بنیاد پر کیے جا رہے تھے اور اردو بولنے والوں کی تعداد کو گھٹانے کی یہ ایک مُبیّنہ کوشش اور سازش تھی۔ تاکہ وہ اپنے دستوری و جمہوری حقوق کا مطالبہ نہ کر سکیں۔ اس میں فرقہ پرست ذہنیت رکھنے والے سیاسی لیڈروں کی بھی سازش شامل تھی۔ کیوں کہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ جب اردو کے اعداد و شمار کم ہوں گے تو وہ بآسانی یہ کہہ سکیں گے کہ یہاں کی عام زبان تو ہندی ہے اور اردو تو کوئی بھی نہیں بولتا۔ اور اس کی سند کے طور پر وہ مردم شماری کے اعداد و شمار پیش کر دیں گے۔ "ہماری زبان" کے ۱۰ مارچ ۱۹۵۱ء کے اداریے میں قاضی صاحب نے اس صورتِ حال کو یوں بیان کیا ہے:

> "مردم شماری میں زبان کے غلط اندراجات کی شکایت ہماری رائے میں ۹۰ فی صد صحیح ہیں اور ماتحت افسروں نے مردم شماری کو اردو زبان کی بیخ کنی کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان لوگوں کو جو یہ دعوے کرتے ہیں کہ اتر پردیش کی عام زبان ہندی ہے اردو نہیں ہے اپنے اس دعوے پر جس سند کی ضرورت تھی وہ ان کو مردم شماری کے کارپردازوں کی مہربانی سے حاصل ہو جائے گی اور جس وقت مردم شماری کے اعداد شائع ہوں گے تو یہ حضرات ہم سے فرمائیں گے کہ اب دیکھ لیجیے کہ اردو کی حیثیت کیا ہے۔ اردو کے خلاف مردم شماری کے ذریعے سے ان لوگوں نے بلاشبہ ایک داؤ جیتا ہے۔"

قاضی عبدالغفار کی اردو خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ جہاں انھوں نے اردو کی بہت سی خدمات انجام دیں۔ وہاں انھوں نے اردو تحریک کے کام کو بھی آگے بڑھایا اور اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اردو تحریک کے فعال قلم کار اور اس کے علم بردار کی حیثیت سے ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ڈاکٹر شیمہ رضوی

لیلیٰ کے خطوط ــــ ایک تجزیہ

عورت کے کئی روپ ہیں، جہاں وہ ایک شفیق ماں، ایک محبت کرنے والی جاں نثار بہن اور ایک شوہر پرست وفا شعار بیوی کی حیثیت سے پہچانی گئی ہے وہاں سماج کے کچھ سربرآوردہ مردوں کی غفلت شعاریوں کی بدولت اسے حسن فروشی کے بازار میں 'طوائف' کے خطاب سے بھی نوازا گیا ہے۔

ہندستان میں اٹھارویں صدی کے معاشرے میں اسے کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے۔ دلّی اور خاص کر اودھ میں اس کی جادو طرازیوں کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ اس دور کے ادب خصوصاً شاعری میں وہ اس قدر حاوی ہوئی کہ دبستان لکھنؤ میں تو ایک نئی صنف ریختی ہی وجود میں آگئی لیکن اس میں دو رائیں نہیں کہ طوائف کے عشرت کدے، اس معاشرے کی فراری ذہنیت کے لیے محض وقتی آسودگی اور سطحی دلبستگی کا سامان تھے جس کا احساس خود اسے بھی شدت سے تھا، وہ خوب سمجھتی تھی کہ اس کا جادو خواہ کتنا ہی سرچڑھ کر کیوں نہ بولے اس کی حیثیت ایک ذلیل ترین عورت سے بھی کمتر اور قابل نفرت ہے۔ چنانچہ کسی طوائف کی داستان سرائی بھی بظاہر ایسا موضوع نہیں سمجھا گیا جسے ادبی حیثیت دی جائے یا قابل قدر نگاہوں سے دیکھا جائے لیکن اس بازاری عورت کی ظاہری اور باطنی زندگی کے تضاد کا عکس جب اس کی خونچکاں فطرت کا مطالعہ بن جائے تو وہ انفرادی یا اجتماعی زندگی میں چشم عبرت کا محتاج بن جایا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جب اس موضوع کو ہمارے ادیبوں نے نفسیاتی طور پر جانچا اور پرکھا ہے تو ہم

نے اس کردار کو ''نفرت انگیز'' نہیں ''درد انگیز'' پایا ہے۔ قاضی عبدالغفار نے ''لیلیٰ کے خطوط'' میں اسی نسخہ پر عمل کیا ہے۔ انھوں نے خطوط کے پردے میں بازاری عورت کی تحلیل نفسی کی کامیاب کوشش کی ہے۔

لیلیٰ کے خطوط بقول مصنف ''نہ انشا پردازی کی مشق ہے نہ زورِ قلم کا مظاہرہ ـــ بلکہ ان خطوط میں جو دیکھ سکتے ہوں ان کے لیے لیلیٰ کا تبسم ایک فوارۂ خون، اس کی بذلہ سنجی ایک فریاد، اس کی ظرافت ایک دکھی کی پکار ہے۔ اس کی شوخیوں میں اس کی جراحتیں پوشیدہ ہیں ـــ وہ ہنس ہنس کر اپنے زخموں سے کھیلتی ہے جو اس کے وجودِ معنوی پر ناسور بن کر رہ گئے ہیں ـــ''[۱] یہی ''لیلیٰ کے خطوط'' کا لب لباب ہے۔ طوائف بھی ایک عورت ہے اسے سب کچھ سمجھنا اور عورت ہی نہ سمجھنا اس کی مظلومیت کا نقطۂ عروج ہے۔ اس بات کے اظہار کے لیے موزوں طرزِ بیان وہی ہے جو لیلیٰ نے اختیار کیا۔ بقول مصنف ''عورت کی مظلومیت کا افسانہ ہندوستان کے ماحول میں کسی شریف گھر کی بیٹی یا بہو کی زبان سے بیان ہونا ممکن نہ تھا، لامحالہ ایک بازاری عورت کے قلم سے وہ عبرت انگیز حقائق بیان کرانے پڑے جس کو زیادہ سنجیدہ طرزِ بیان بے اثر اور بے معنی کر دیتا۔''[۲]

''لیلیٰ کے خطوط'' کو کچھ ناقدین ناول کے زمرے میں شمار نہیں کرتے۔ حالانکہ وہ ہر لحاظ سے ناول ہے جو ایک طوائف کی پوری زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے اگرچہ اس کا کینوس بہت محدود ہے لیکن اس کے باوجود ایک خط کے بعد دوسرا خط اس کے جذبات کے آثار چڑھاؤ کی اس طرح ترجمانی کرتا ہے اور ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ سے اس طرح مربوط رکھتا ہے کہ پورے قصے میں 'وحدتِ تاثر' کہیں مجروح نہیں ہونے پائی۔ یہاں ایک مسلسل قصہ خطوط کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی 'واقعات کے تنوع' کے ساتھ ایسا ہم آہنگ ہے جیسے کسی ماہر صناع سار نے تراشے ہوئے مختلف نگوں کی جڑائی میں انتہائی تناسب سے کام لیا ہو۔ قصہ میں کہیں جھول

---

[۱] ''لیلیٰ کے خطوط''، مقدمہ۔ قاضی عبدالغفار۔ آزاد بک ڈپو۔ ہال بازار۔ امرتسر صفحہ ۶۔

[۲] ''مجنوں کی ڈائری'' شرح کلام۔ قاضی عبدالغفار ناشر آزاد بک ڈپو ہال بازار امرتسر۔ صفحہ ۵۔

سط نہیں آتا۔ اس کا تانا بانا اس کے توازن کو ہر جگہ برقرار رکھتا ہے۔ اس کی خود کلامی کے پس بندہ دا یلاگ کا حسن بھی برقرار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سید احتشام حسین جیسے اردو کے مایہ ناز نقاد نے ... ناول ہی کا نام دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "... قاضی عبدالغفار (وفات ۱۹۵۶ء) نے اپنے لاثانی ناول "لیلیٰ کے خطوط" میں ایک طوائف کی غم انگیز کہانی بڑے دلچسپ طریقہ سے بیان کی ہے۔" [۱]

البتہ اس کا فارم پکارسک (Picaresque) ہے۔ پکارسک ناول دراصل کسی آوارہ گرد کی ایسی سوانح ہوتی ہے جو عموماً واحد متکلم کے صیغہ میں بیان کی جاتی ہے۔ ... اس کی زندگی کے اہم واقعات ڈھیلے ڈھالے طور پر ... آپس میں مربوط ہوتے ہیں اور "لیلیٰ کے خطوط" میں لیلیٰ خود اپنی کہانی کی بیان کر رہی ہے۔

قاضی صاحب کی یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ جسے انھوں نے "پہلی کتاب" "دوسری کتاب" اور "تیسری کتاب" کا عنوان دیا ہے۔

پہلی کتاب ۱ حصہ ... خطوط پر مشتمل ہے۔ لیلیٰ کی کہانی کا تانا بانا اسی حصہ میں تیار ہوتا ہے۔ ... کون ہے اس کا خاندان کیا ہے، اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی ابتدائی زندگی کیسی تھی۔ ان سب کی معلومات ہمیں اسی حصے کے مختلف خطوط سے ہوتی ہے۔ جب وہ مکتوب الیہ کو خط لکھنے ... اپنی پچھلی زندگی میں لوٹ جاتی ہے: "... یہ میری استانی کا کمرہ ہے۔ اس کے ... میں اپنی گڑیا سنبھالے کھڑی ہوں۔ ایک حسین عورت مجھے بلا رہی ہے یہ میری ماں ... ایک متین دراز قد شخص ہماری طرف آرہا ہے وہ میرا باپ ہے۔ یہ خوبصورت عمارت ... اسکول ہے۔ ہم کہیں جارہے ہیں، ریل گاڑی کا اسٹیشن ہے۔ میرے والد کے ساتھ ایک شہ... جوان ہے مردانہ حسن کی ایک تصویر، جو ہنوز مکمل نہ ہوئی تھی۔ یہ میرا منگیتر ہے جس کے سایہ ... میری جوانی اور ... میرا بڑھاپا گذرنا چاہیے تھا۔" [۲]

۱۔ روداد ... کی تنقیدی تاریخ، از سید احتشام حسین۔ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی ۱۹۸۳ء صفحہ ۳۱۱ - ۳۱۰

۲۔ لیلیٰ کے خطوط ... خط صفحہ ۴۳

اور پھر انھیں خطوط کے سہارے ماضی کے جھروکوں سے اس کی شخصیت کی تصویر یوں ابھرتی ہے: "میں بھی غریب، کبھی ایک شریف خاندان کی لڑکی تھی، اتنا جانتی ہوں ——؟ خالق باری اور راہِ نجات پڑھی اور چند مذہبی کتابیں ختم کیں۔ اس کے بعد میرے ماں باپ نے بڑا حوصلہ کرکے مجھے عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم دی، درس کی ابتدائی کتابیں ختم کیں اور فارسی اردو کی سیکڑوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔" [۲۵]

"اس عشوہ فروشی کے بازار میں آنے سے پہلے مجھے علم و تہذیب و شرافت کی اتنی دولت حاصل ہوچکی تھی جتنی کہ عام طور پر شاید اچھے گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو بھی حاصل نہ ہوئی ہو۔" [۲۶]

جب اس کے بچپن نے جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھا تو وہ بھی ایک عام نوجوان لڑکی کی طرح عشق کے حسین خوابوں سے سرشار ہو اٹھی:

"کسی زمانے میں (اور حیف کہ وہ زمانہ اب نہ آئے گا) جب میں لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے قصے پڑھا کرتی تھی تو یہ ناکردہ گناہ قلب اس جہانِ بے اختیاری اور عالمِ بے خودی کی کیسی کیسی خوابیں دیکھا کرتا تھا۔" [۲۷]

لیکن اس کی مفلسی نے اسے بازارِ حسن کی زینت بنا دیا۔ اسے یاد آتا ہے: "... پھر ایک بائیس سالہ جوان رعنا اس دریچہ سے گزرا یہ میرا پہلا مرد ہے۔ جس نے مجھے عورت بنا دیا مگر بیوی نہ بنایا۔ جس نے مجھے میری شاخ سے پھول چن کر چند روز گلے کا ہار بنایا اور پھر مسل کر دور پھینک دیا، جس ظالم نے میری دوشیزگی کو وہاں تک پہونچا دیا جہاں اب تم دیکھ رہے ہو۔ جس نے مجھے وہ بنایا جو اب میں نظر آرہی ہوں۔

"... مگر تم کب جان سکتے ہو کہ مٹھی بھر آٹے کے لیے یہ جوہرِ زندگی کس طرح ارزاں ہے

---

[۲۵] سترھواں خط صفحہ ۶۴

[۲۶] چوتھا خط صفحہ ۱۴

[۲۷] بارہواں خط صفحہ ۱۸

ہو رہا ہے ۔"

اور پھر بازارِ حسن کے چکر لگانے والوں میں مسجد کے ملّاسے لے کر خان صاحب، شیخ جی، سائوکار، ایڈیٹر صاحب اور وکیل صاحبان سبھی شامل ہوتے گئے ۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی اس فہرست میں اس کا بھی نام لکھ لیا جو ان خطوط کا مکتوب الیہ ثابت ہوا ۔ قاضی عبد الغفار کی گرفت قصّہ پر اس قدر زبردست ہے کہ اس میں مکتوب الیہ یا ہیرو کا نام کہیں پر بھی نہیں آتا پھر بھی اس کی تصویر قاری کے ذہن میں ابھرتی جاتی ہے کہ وہ لیلیٰ سے عمر میں چھوٹا یا بیس سال کا ایک پڑھا لکھا نوجوان ہے جس نے بی ۔ اے ایل ۔ ایل بی تک تعلیم حاصل کی ہے۔ لیلیٰ اپنے ایک خط میں اس طرف ایک موہوم سا اشارہ کرتی ہے : "... نام کے بجائے نمبر لکھی ہوں، ان ہی نمبروں میں کہیں تمہارا نام بھی ہوگا ۔" پھر وہ عاشقوں کی فہرست پیش کرتے ہوئے انیس [19] قسم کے عاشقوں کا ذکر کرتی ہے مثلاً ڈیڑھ سو گھوڑوں والا عاشق، سور کی طرح سر جھکا کر سیدھا حملہ کرنے والا، دیوانہ بیل سر جھکائے دم اٹھائے منہ سے جھاگ گراتا ہوا، چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا، رات بھر تاش کھیلنے والا صبح کو اخبار کا لیڈنگ آرٹیکل لکھنے والا ۔ ۔ ۔ بوڑھا، نمبر دس سے زیادہ مالدار ایک زوجہ محترمہ کافی، لحاظ بلا شرکت غیرے ۔ ۔ ۔ بالونی، بہت مہذب، معقول سنجیدہ، قوم کا لیڈر، سرخ کبھی سفید کبھی بھورا الو ۔ ۔ ۔ بدلنے والا، حضرت مولانا جو کوٹھے پر نہیں آتے پیغام بھیجا کرتے ہیں ۔" [1]

اور پھر اس گڈمڈسی فہرست میں مکتوب الیہ خود بخود اپنی شناخت کروا بیٹھتا ہے ۔"...
...اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی خوش رو، خوش پوشاک، شرمیلا، جوشِ عشق کا اظہار زبان سے ... بہت زیادہ کرتا ہے ۔ آدمی برا نہیں ۔ ذرا بیوقوف ہے ۔ عاشق بنتے بنتے اب ... بنا چاہتا ہے ۔ بڑھتا آتا ہے! میں ہٹتی جاتی ہوں، وہ بڑھتا آتا ہے، ڈرتی ہوں کہیں ... نہ جاؤں! پیچھے دیوار ہے، سامنے وہ ہے ۔ وہ بڑھتا ہی رہے گا تو میں کہاں تک ہٹ ... گی ۔ بھاگ جانا چاہیے !" [2]

---

[1] انیسواں خط صفحہ ۹۱ ۔ ۹۲ ۔ ۹۳   [2] تیسواں خط صفحہ ۹۳ ۔ ۹۴

یہ الفاظ خود شاہد ہیں کہ یہی اس کا ہیرو ہے۔ یہاں بھی ہمیں قاضی عبدالغفار کی چابکدستی کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ یہ اس حصہ کا تیئسواں ۲۳ خط ہے اور اسی پر اس حصہ کا اختتام ہوتا ہے یہ حصہ اس کتاب کا سب سے جاندار حصہ ہے۔ جہاں قاضی عبدالغفار نے لیلیٰ کو ایک فلسفی کا ذہن اور ایک نقاد کی زبان عطا کی ہے۔ لیلیٰ کے استہزائیہ جملوں میں انھوں نے مولوی اور ملاؤں کی خوب قلعی کھولی ہے اور خود ساختہ مذہب کا دل کھول کر مذاق اڑایا ہے لیلیٰ کی زبانی ملا کے عشق کی اصلیت ملاحظہ ہو: " . . . . ان مولاناؤں کا عشق اکثر بھدے قسم کا ہوتا ہے آتا ہے تو اکثر نکاح کا پیغام لے کر آتا ہے۔ یہ بیچارے صرف ایک ہی قسم کی عیاشی جانتے ہیں۔ وہ جو کسی نہ کسی مذہبی اصطلاح کے تحت آسکے۔" [1]

" . . . اگر میں عورت نہ پیدا ہوئی ہوتی اور عصمت فروشی کے بازار میں نہ آئی ہوتی تو جہاں تک مکروفریب اور دھوکے دہی کا تعلق ہے میں بھی کوئی مولانا، حضرت اقدس یا جناب محترم ہوتی۔ کہیں مصلے پر کسی حجرے میں بیٹھی ہوتی کسی مسجد کے ممبر پر کھڑی ہوتی۔ فقرے لکھتی، اعلانات شائع کرتی، تقریریں کرتی اور میرا تعلق بھی براہِ راست عرش اعظم سے ہوتا۔"

اور اب ذرا ان لوگوں کی اصلیت ملاحظہ ہو جنھیں ہم اور آپ مذہبی کہتے ہیں: " . . . . یہ سب لوگ جو مذہب مذہب پکارتے ہیں درحقیقت ایک قسم کے بت پرست ہیں ان کا خدا پتھر یا سونے چاندی کا نہیں "تخیل اور توہم" ان کا دیوتا ہے۔ "ذاتی خواہش" ان کا خدا ہے۔ مندر اور شوالے کے بجائے ان کا دیوتا ان کے دماغ کے سومنات میں رہتا ہے خدا سے زیادہ یہ سب اس دیوتا کے غلام ہیں۔"

'دوسری کتاب' کا حصہ چوبیس ۲۴ سے انتیسویں ۲۹ خط تک مشتمل ہے۔ یہ خط اگرچہ بہت مختصر ہیں اور یہ حصہ بھی بہ نسبت دوسرے حصوں کے سب سے مختصر ہے تاہم یہی حصہ لیلیٰ کی کشمکش جذبات کا نچوڑ ہے۔ جہاں اس کے جذبات متزلزل ہیں۔ وہ محبت کا جواب محبت سے نہیں دینا چاہتی۔ اس لیے کہ اب وہ مکمل فاحشہ کا روپ اختیار کر چکی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ کوئی اس کے اندر کی سوئی ہوئی شریف عورت کو پھر سے زندہ کردے اس لیے کہ اسے

---

[1] تیسواں خط صفحہ ۹۳-۹۴

وب معلوم ہے کہ شریف زندگی قبول کرنے کے بعد بھی وہ اپنی زندگی کے اس داغ کو نہیں دھو سکے گی جسے دنیا والوں نے اسے بنا دیا ہے۔ اسی لیے وہ مکتوب الیہ سے عاجزانہ التجا کرتی ہے کہ وہ اس بجھی ہوئی راکھ سے چنگاری تلاش نہ کرے مبادا وہ پھر بھڑک اٹھے۔

"میرے دل کا عجیب حال ہے تم نے میرے قلعہ کی دیواروں میں رخنے پیدا کرنے کی کوشش کی، میں مقابلہ پر آمادہ ہوئی — مدافعت کرتی رہی۔ گر گر کر سنبھلتی رہی ہمت رہی جس گھر کے دروازے میں ہمیشہ کے لیے بند کر چکی تم اس میں داخل ہونے کی کیوں جرأت کرتے ہو"[۱] یہی آخری جملہ اس کشمکش کا لب لباب ہے۔ "خدا کے لیے مجھے جگاؤ نہیں، سونے دو — میری خواب گاہ میں آہستہ قدم اٹھاؤ میں جاگ اٹھی تو مر جاؤں گی"۔[۲] آخر جذبات مغلوب ہونے ہیں اور قوت ارادی کی فتح ہوتی ہے اور وہ یہ جگہ چھوڑ کر خاموشی سے چلی جاتی ہے:- "جب کل تم یہ سطریں پڑھ رہے ہوگے تو میں تمھارے عشق کی دنیا سے گذر کر کہیں دور لاپتہ ہو چکی ہوں گی۔ میری تمھاری عشق و عاشقی ہو چکی — میرے تمھارے آنسوؤں کا ہر قطرہ آئندہ آنے والوں کے لیے زندگی کی ایک ضمانت ہے — یہی یاد رکھو — باقی سب بھول جاؤ — بھول جاؤ — خدا حافظ۔"[۳]

قاعدے سے کہانی کو یہیں ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن کہانی کار نے اسے آگے بڑھایا ہے اور اسے 'تیسری کتاب' کا عنوان دیا ہے۔ اس حصہ میں اس نے لیلیٰ کی زندگی کے آخری حصے کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ سچی محبت کے نام سے بھاگی تو ہے لیکن اپنی زندگی سے تائب ہو کر نہیں۔ وہ پھر اسی تعفن میں گھر جاتی ہے اور اس وقت وہ کتنا پچھتاتی ہے جملوں کے اشارے اور ان کی معنی خیزی یہاں قاضی صاحب کی پختہ انشاء پردازی کا پتہ دیتے ہیں "میں تم سے اپنا دامن چھڑا کر بھاگی اور پہاڑ پر چڑھتی چلی گئی تا آنکہ اس کی چوٹی پر پہونچکر

---

[۱] اٹھائیسواں خط صفحہ ۱۰۲

[۲] " " " "

[۳] انتیسواں خط صفحہ ۱۰۲ ۔ ۱۰۳

دم لیا ـــ اس وقت ایک گونہ اطمینان ہوا کہ تم دور رہ گئے ہیں ہاتھ نہ آؤں گی ۔ مگر پہاڑ کی چوٹی پر پہونچنے سے پہلے یہ معلوم نہ تھا کہ دوسری طرف کا اتار اس چڑھائی سے بھی کچھ زیادہ مشکل ہے ۔ چڑھائی میں تمام قوت صرف کر دینے کے بعد اتار کے وقت ہاتھ پاؤں قابو میں نہیں رہتے اور چڑھنے والا چوٹی پہ پہونچ کر جو بے اختیار پھسلتا ہے تو پھسلتا ہی چلا جاتا ہے ۔"

یہاں پہونچ کر قاضی عبدالغفار یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اگرچہ اپنے پیشہ پر اپنی نسوانیت قربان کر چکی ہے تاہم ان متلاطم لہروں کی سطح کے نیچے ہنوز ایک "عورت زندہ" ہے ۔ کہانی پھر آگے بڑھتی ہے ہیرو کو اس کا پتہ معلوم ہو جاتا ہے وہ اس جگہ پہونچ جاتا ہے جہاں وہ ہے، وہاں پہونچ کر اتفاقاً وہ بیمار ہو جاتا ہے ۔ چار ہفتے وہ، اس کی تیمار داری کرتی ہے اور اسی تیمار داری کے دوران وہ اپنے اندر ایک عجیب تغیر محسوس کرتی ہے ۔ ایسا تغیر جیسے اچانک اس نے اپنے اندر کی کھوئی ہوئی "عورت" کو ڈھونڈ نکالا ہو اس عورت کو جس کو وہ اب تک قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی ـــ" . . . اپنی عمر میں آج تک کسی بیمار کی تیمار داری نہیں کی میرے لیے یہ ایک بالکل نیا کام تھا ۔ بہن، بیٹی اور بیوی بن کر عورت کو اپنی فطرت کے مظاہروں کے لیے عمل کا ایک نیا میدان ملتا ہے! میں نہ آج تک کسی کی بہن بنی، نہ بیٹی، نہ بیوی، مجھے کیا خبر تھی کہ خدمت میں عورت کیا مزہ پاتی ہے! نا ہی جانتی تھی لیکن گذشتہ چار ہفتوں میں میں نے ایک نئے مکتب میں کچھ نئے سبق پڑھے ۔ اپنی بھولی ہوئی نسائیت یاد آگئی یاد آ گیا کہ میں عصمت فروش ہوں مگر "عورت" بھی ہوں ۔ میری روح نے ایک نئی گھنٹی بجائی جس کی آواز میں نے پہلے کبھی نہ سنی تھی ۔" [1]

دراصل یہی اس حصّہ کا نقطۂ عروج ہے جسے قاضی صاحب باور کرنا چاہتے تھے کہ کچھ بھی ہو "عورت پن" ہی دراصل عورت کی معراج ہے، عورت کی عورت پر فتح ہے ۔

لیکن جب وہ اس تیمار دار کے پاس سے اس کے صحت یاب ہو جانے کے بعد اپنے کمرے پر واپس آتی ہے اور اس کے عشاق کا پھر وہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو اسے اپنی

---

[1] سینتیسواں خط صفحہ ۱۲۸

کم مائیگی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ وہ آخری زینہ پر پہونچنے سے پہلے ہی دھڑام سے آگرتی ہے۔ "جب کوئی محلوں کے خواب دیکھ رہا ہو اور یکایک اس کے جھونپڑے میں آگ لگ جائے اس وقت اس شخص کی کیا حالت ہوگی"

لیلیٰ ایسی ہی حالت سے دوچار ہے اس وقت اس کے اندر کے دبے جذبات سر اٹھاتے ہیں تو اب ان کی شکل ہی بدل چکی ہوتی ہے۔ اس کا جذبہ انتقام میں بدل جاتا ہے۔ انسان جب بے بس ہوجاتا ہے تو اس کے اندر انتقام کا جذبہ پیدا ہونا فطری امر ہے:

"جس دن بازار حسن میں میرا کاروبار بند ہوگا۔ اس دن میں ماحول کی آزاد بیٹی بن کر اپنی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد قرار دوں گی۔ مرد کے تفوق کی بیخ کنی! خدا جانتا ہے کہ اس انتقام کی لذت جملہ مردمی سے میرے لیے یقیناً زیادہ ہے[۱] کچلے دبے ہوئے احساسات کی علیل کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہوسکتی ہے اور پھر آخری خط میں مرد سے نفرت کا یہ لاوا پھوٹ ہی پڑتا ہے: "وہ عورت جو پچیس برس تک میرے اندر سوتی رہی اب آنکھیں مل کر پہلی انگڑائی لے رہی ہے۔۔۔ مجرموں سے میرے انتقام کا وہ وقت اس وقت آئے گا جب میں بیوی اور ماں بن کر بغاوت کا علم بلند کروں گی! ابھی تو میں ایک بازاری عورت ہوں! ۔ ذلیل حقیر گردن زدنی جس شریعت کے پردے میں مرد، عورت پر جابرانہ حکومت کرتا ہے، اسی شریعت کا نام لے میں اس کے سارے پردے فاش کروں گی۔ ۔ ہاں ایک دوسرے جنم میں میرا انتظار کرو! لیلیٰ"

لیلیٰ کے خطوط کی اگر کوئی خامی ہے تو وہ ہے قاضی عبدالغفار کا ناصحانہ انداز، وہ جس وقت خطوط کے انداز میں لیلیٰ کے قلم سے زندگی کا فلسفہ بیان کرتے ہیں، مذہب کی گتھی سلجھاتے ہیں گناہ کی تعریف کرتے ہیں، مظلوم اور ظالم کا کردار پیش کرتے ہیں، قوی اور ضعیف کا فرق بتاتے ہیں، مولوی ملا کی قلعی کھولنا چاہتے ہیں اس وقت وہ بھول جاتے ہیں کہ وہ محض واعظ نہیں، ایک قصہ گو بھی ہیں۔ تیسری کتاب کے آخری خطوط خصوصاً اکتالیسواں، چھیالیسواں، سینتالیسواں

---

[۱] سینتالیسواں خط صفحہ ۱۶۹

خط ایسی ہی مثالیں ہیں۔

قاضی عبدالغفار نے "لیلیٰ کے خطوط" ۱۹۳۱ء میں لکھے جیسا کہ وہ اس کے تینتیسویں خط میں اس کا اظہار کرتے ہیں "آج بتاریخ ۱۹۳۱ء بمقام۔ قلم بند کی گئی تاکہ بعد وفات راقمہ تحریر ان نکاح کی خواہش کرنے والے عاشقوں کے لیے سند ہو۔!" [۱]

اس سے پہلے مرزا محمد ہادی رسوا اپنی مشہور زمانہ ناول 'امراؤ جان ادا' لکھ چکے تھے جس کا سال تصنیف ۱۸۹۹ء ہے۔ ظاہر ہے لیلیٰ کے خطوط اس کے تقریباً تیس سال بعد وجود میں آئی۔ [۲]

جس طرح امراؤ جان ادا کے بارے میں مشہور ناقدین مثلاً ابواللیث صدیقی، شاہد احمد دہلوی اور ڈاکٹر یوسف سرمست کا خیال ہے کہ یہ ناول نگاری سرفراز حسین عزمی کے ناول 'شاہد رعنا' سے ماخوذ ہے یا اس کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اسی طرح ہم "امراؤ جان ادا" سے 'لیلیٰ کے خطوط' کی مماثلت دیکھ کر یہ کہنے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں کہ یہ ناول امراؤ جان ادا کا چربہ ہے ہم نے جن بنیادوں پر ایسا کہنے کی جرأت کی ہے اسے ذیل میں مختصراً پیش کیا جاتا ہے۔

۱) دونوں کی کہانی ایک طوائف کے گرد گھومتی ہے۔

۲) دونوں کا فارم پکارسک ہے یعنی دونوں کسی آوارہ گرد کی ایسی سوانح ہے جو واحد متکلم میں بیان ہو رہی ہو۔

۳) امراؤ جان کی امیرن اور لیلیٰ کے خطوط کی لیلیٰ دونوں پیدائشی طوائف نہیں ہیں۔ دونوں ہی شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ دونوں ہی نے آوارگی میں زمانے کی سیر کی ہے۔

۴) دونوں قسمت کے ہاتھوں بازار حسن میں لاکھڑی کی گئیں۔

۵) دونوں ہی ادبی ذوق کی مالک ہیں۔

۶) امراؤ جان ادا میں قصہ سننے والے مرزا رسوا ہیں، لیلیٰ کے خطوط میں مکتوب الیہ

---

[۱] تیسواں خط صفحہ ۹

[۲] بحوالہ ڈاکٹر میمونہ خاتون

سے یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے۔

۷) دونوں اپنا قصہ اس وقت بیان کرتی ہیں جب زندگی کو ایک پختہ کار اور تجربہ کار ذہن سے مطالعہ کر چکی ہوئی ہیں۔

۸) دونوں اپنے پیشہ کو حقیر ترین پیشہ خیال کرتی ہیں

۹) دونوں میں بدنصیبی کا احساس انتہائی گہرا ہے۔

۱۰) دونوں کو احساس ہے کہ ان سے نہ کوئی حقیقی محبت کرنے والا ہے نہ وہ کسی سے سچی محبت کر سکتی ہیں۔

۱۱) دونوں کا ہی کردار انتہائی پیچیدہ اور مرکب ہے۔

۱۲) دونوں کے لاشعور میں گھریلو زندگی کا رجحان کارفرما ہے اور دونوں ہی گھر کی عورت کو طوائف سے بہتر سمجھتی ہیں یعنی بیوی، بن کر ایک باعزت زندگی گذارنے کا احساس دونوں ہی میں شدت سے پایا جاتا ہے۔

۱۳) دونوں ناولوں میں قصہ کی تمام تر دلچسپی انتہائی نفسیاتی ہے۔

۱۴) رسوا نے عورتوں کی مردوں کے تعلق کے لحاظ سے تین قسمیں کی ہیں۔ اول نیک بختیں دوسری حرافیں تیسری بازاریاں قاضی عبد الغفار نے بھی عورتوں کی تین ہی قسمیں بتائیں ہیں۔ اول جو اپنے آپ کو بلاشرط ہبہ کر دیتی ہیں۔ (مرد ایسی عورتوں کی طرف بہت کم توجہ دیتا ہے) دوسری وہ جو سادتاً اپنا جسم مرد کو دیتی ہیں۔ (مرد ان سے سرراہ تھوڑی سی دلچسپی لیتا ہے) تیسرے وہ جو مرد کے دماغ کا گودا نکال کر پھینک دیتی ہیں (ان عورتوں پر مرد مرتا ہے)"

۱۵) امراؤ جان قصہ سنانے سے پہلے کہتی ہے:

"مجھ کم نصیب کی سرگذشت میں ایسا کیا مزہ ہے جس کے آپ مشتاق ہیں۔ ایک ناشاد و نامراد آوارہ، خانماں برباد، ننگ خاندان عار دوجہاں کے حالات سن کر مجھے ہرگز امید نہیں کہ آپ خوش ہوں" [1]

---

[1] امراؤ جان ادا صفحہ ۷۹

لیلیٰ بھی اسی قسم کا اظہار کرتی ہے :

"ساز کے اس تار کو نہ چھیڑیئے جو ٹوٹا ہوا ہے۔ اس میں آپ نغمہ نہ پائیں گے۔" [1]

(۱۶) دونوں ہی ناولوں کو پڑھ کر ایک ایسے درد بھرے راگ کا احساس ہوتا ہے۔ جس نے طویل گیت کا روپ دھارن کر لیا ہو۔

ہاں البتہ تحلیل نفسی کے اعتبار سے مرزا رسوا اتنے چابکدست نظر نہیں آئے جس قدر قاضی عبدالغفار۔ مسجد کے مولوی صاحب کے کردار پر امراؤ جان کا ہنسنا مولوی صاحب کو درخت پر چڑھا کر دلچسپی لینا سطحی مزاح پیش کرتے ہیں اس کے برخلاف لیلیٰ کی زندگی کے مسائل کا جس قدر نفسیاتی تجزیہ قاضی عبدالغفار نے "لیلیٰ کے خطوط" میں کیا ہے، مرزا رسوا کو انھوں نے اس میدان میں کہیں پیچھے چھوڑ دیا ہے چنانچہ "لیلیٰ کے خطوط" کی صرف یہی ایک خوبی امراؤ جان ادا سے مماثلت کے باوجود اپنی امتیازی شان رکھتی ہے۔

---

[1] دوسرا خط 'لیلیٰ کے خطوط' سے صفحہ ۱۳

ڈاکٹر ہارون ایوب

اردو ناول نگاری اور لیلیٰ کے خطوط

قاضی عبدالغفار صاحب کا ناول "لیلیٰ کے خطوط" ۱۹۳۲ء میں منظر عام پر آیا۔ اس سے پہلے یہ ناول "نیرنگِ خیال" میں قسط وار شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا تھا یہ وہ زمانہ تھا جب نئی اور پرانی اقدار میں تصادم بڑھ رہا تھا اور ہندوستان کے سمجھدار لوگوں نے ماضی سے نظر ہٹا کر مستقبل کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا، کیونکہ سیاسی حالات کے اتھل پتھل کی وجہ سے حال غیر یقینی تھا اور کوئی بھی شخص اپنی جگہ مطمئن نہیں تھا، خواہ وہ انگریزوں کے وفادار رہوں یا تحریکِ آزادی کے دلدادہ ——
پریم چند اس دور کے بہترین نماز کی صورت میں ابھر کر سامنے آ چکے تھے۔ انھوں نے حقیقت سے کام لے کر اپنے ناولوں میں اس دور کی نشاندہی کی، مگر وہ ابھی اپنا شاہکار ناول "گئودان" نہیں لکھ پائے تھے کہ قاضی صاحب نے "لیلیٰ کے خطوط" پیش کر دیا، جس نے اردو ناول نگاری میں ایک نیا باب کھول دیا۔

قاضی صاحب انگریزی ادب سے متاثر تھے انھوں نے خطوط کی جو تکنیک اختیار کی، وہ انگریزی ادب کی دین ہے اور یہ شاید اردو کا پہلا ناول ہے، جس میں خطوط کی تکنیک کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس ناول کی تکنیک بھی اس کی مقبولیت کا سبب بنی، حالانکہ موضوع نیا نہیں ہے پھر بھی جو انداز قاضی صاحب نے اختیار کیا ہے وہ دوسرے تمام ناول نگاروں سے مختلف ہے۔ آپ نے ایک ایسی طوائف کی زندگی کو پیش کیا ہے، جو مردوں کے بنائے ہوئے سماج سے بیزار ہے۔ اپنے خطوط میں وہ اس سماج پر گہرے طنز کرتی ہے۔ اس طرح ناول کا موضوع ضرور محدود ہو کر رہ

جاتا ہے لیکن ایک طوائف کا ذہنی ارتعاش پوری طرح کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

"جس عورت کو مرد نے شب بھر کے لیے خریدا، اُس کے قویٰ دماغی اور جسمانی، گویا مرد کی جائیداد ہو گئے۔ ہنسے تو وہ ہنسنا اُس کا نہیں۔ روئے تو رونا اُس کا نہیں۔ خواب گاہ اُس کی نہیں، بستر اُس کا نہیں جو کچھ ہے سب مرد دیوتا کا ہے۔"

(صفحہ ۳۶)

لیلیٰ کا محبوب جب شادی کی درخواست کرتا ہے تو وہ اپنے ایک اور خط میں لکھتی ہے۔

"دنیا کسی کو کب چھوڑتی ہے۔ اگر میں بیوی بن کر تمھارے گھر میں آؤں گی تو بجائے اس کے کہ تم مجھے گندگی سے نکال کر پاک اور ستھرا کر دو۔ میری گندگی تم کو لپٹ جائے گی اور سڑک پر چلنے والے تمھاری دیواروں کے سایہ سے بچ کر گزرا کریں گے۔ وہ کہیں گے اِس مکان میں ایک نجس عورت رہتی ہے، ایسا نہ ہو کہ اس کا سایہ ہم کو نجس کر دے ۔۔۔ بڑے بڑے غیرت مند اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کہیں گے، اس گھر کی عورت ملنے کے قابل نہیں ہے۔ (صفحہ ۶۹)

قاضی صاحب کے اس حقیقی انداز نے اردو ناول نگاری کو ایک نیا رُخ عطا کیا، جس کے بعد پریم چند اپنا شاہکار ناول "گئودان" لکھنے میں کامیاب ہوئے۔

قاضی صاحب کے اِس ناول میں حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ "ادبِ لطیف" کی بہترین مثالیں جگہ جگہ ملتی ہیں۔

"آپ آئیں میرے سر آنکھوں پر ——— میرے بوسے آپ کے سفر کی تھکان کو دور کر دیں گے۔" (صفحہ ۱۰۱)

قاضی صاحب کا یہ رومانی اور تیکھا انداز کچھ لوگوں کو بہت ناگوار گزرا اور اُن قدامت پسندوں نے الزام لگایا کہ "لیلیٰ کے خطوط" کا طرزِ بیان بے حجاب ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ یہ بے حجابی ناول کی خامی نہیں خوبی بن کر سامنے آئی اور ہمیں ایک طوائف کی زندگی کو حقیقت کے آئینہ میں دیکھنے کا موقع ملا۔ کیونکہ اکثر ہمارے ناول نگاروں نے طوائف کو اپنی ناولوں کا موضوع تو ضرور بنایا ہے لیکن حقیقت سے گریز کر کے انھیں پارسا اور نیک بنانے کی کوشش کی ہے، اُن کی عصمت کا اتنا

خیال رکھا ہے کہ انھیں "ان چھوئی" تک ثابت کر دیا ہے۔ اس کے برخلاف قاضی صاحب نے حقیقت سے کام لیتے ہوئے لیلیٰ کی زبانی خود کہلوایا ہے کہ وہ ایک طوائف کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ حالانکہ اُس کا محبوب بھی اُس کی زندگی سے خوب واقف ہے۔ تب بھی وہ اقرار کرتی ہے۔

"میری زندگی کی ہزاروں راتوں کی طرح گذشتہ شب بھی ایک رات تھی جب میں اپنے جسم کو ایک اجنبی کے آغوش میں پاتی تھی۔ صرف اس لیے کہ اس نے میرے حسین جسم کی معقول قیمت ادا کی تھی" (صفحہ ۲۳)

قاضی صاحب کا یہ برجستہ اسلوب اردو ناول کو نئی زندگی عطا کرتا ہے اور ناول نگاری کی روایت میں امٹ نقوش چھوڑ جاتا ہے ——— اسی بنا پر عزیز احمد نے "لیلیٰ کے خطوط" کو پہلا ترقی پسند ناول قرار دیا ہے۔ حالانکہ ترقی پسند تحریک اس ناول کی اشاعت کے تقریباً ۴ سال بعد وجود میں آئی تھی

"مرد جب اپنے بستر کے لیے عورتیں تلاش کرتا ہے تو اس کو سب سے زیادہ فکر ہوتی ہے کہ عورت حسین ہو ——— چاہے وہ خود کتنا ہی مکروہ صورت ہو ——— مگر عورت حسین ہونا چاہیے۔ (صفحہ ۷۲)

پورا ناول خطوط پر مبنی ہے، جس میں ایک طوائف کے خارجی حالات کے ساتھ اس کے دلی جذبات کی عکاسی بہت ہی نفیس انداز میں کی گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ لیلیٰ کے یہ خطوط اس کی زندگی کا آئینہ ہیں اور قاضی صاحب کا مقصد بھی جیسا کہ انھوں نے ناول کے دیباچہ میں فرمایا ہے کہ اس ناول میں "ہندوستان کی نسوانی زندگی کے چند نقوش پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"ہم جیسے بدنصیبوں کے لیے تم لوگوں کی سوسائٹی میں نجات کے تمام دروازے بند ہیں۔ اگر تم مجھ جیسی عورت کو بیوی بنا بھی لو، تب بھی لوگ تمہارے نکاح کو عیاشی سے کم نہ سمجھیں گے اور اگر اُس کے بعد اولاد ہوئی تو اس کا کیا حشر ہوگا" (صفحہ ۷۵)

"لیلیٰ کے خطوط" میں فن کی وہ پختگی تو نہیں ہے، جو بعد کے اردو ناولوں میں ملتی ہے اجزائے ترکیبی کمزور ضرور ہیں مگر فقدان نہیں ہے۔ پلاٹ ہے لیکن اُس وقت اس میں جھول محسوس ہوتا ہے،

جب لیلیٰ اپنی ابتدائی زندگی کے واقعات کو قارئین سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ یعنی وہ تفصیل سے یہ نہیں بتاتی کہ وہ اسٹیشن سے کس طرح اٹھائی گئی تھی اور پھر اس پر کیا بیتی ---؟ لیکن دوسری طرف قاضی صاحب کا طنزیہ اسلوب قاری کی دلچسپی میں اضافہ بھی کرتا ہے۔

"تم کیوں اس بحث میں مذہب کو لے دوڑے، مسلمانوں کا مذہب ہزار پانچ سو برس پہلے کچھ ہو تو ہو، اب تو ایک چھتری ہے جس کو مذہب کا نام لینے والے اپنی ضرورتوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ دھوپ میں یہ چھتری عمامہ و قبا کو خراب ہونے سے بچاتی ہے۔ بازار کے کتوں کو ڈرانے کے لیے اس سے عصا کا کام لیا جاتا ہے۔ موسم اچھا ہو اور اس کی ضرورت نہ ہو تو وہ گھر کے کسی کونے میں پڑی رہتی ہے، ہر شخص کو حق نہیں کہ وہ اس کا استعمال کرے۔ مذہب کے ٹھیکیدار ہی صرف اس کا استعمال کر سکتے ہیں۔" (صفحہ ۱۰۶)

یہ بے ساختگی دراصل اُس تکنیک کی دین ہے، جو قاضی صاحب نے اس ناول میں استعمال کی ہے۔ کیونکہ اس میں دوسرے کو دخل دینے کی گنجائش نہیں ہوتی ہے اور مصنف مکمل طور پر اپنی بات کہنے کے لیے آزاد ہوتا ہے۔ اس کا بھرپور فائدہ قاضی صاحب نے اُٹھایا ہے کیونکہ خط یک طرفہ جذبات کی نمائندگی کا مظہر ہے۔

خطوط کی تکنیک اختیار کرنے کے باوجود، جاگیردارانہ نظام کی خصوصیات کو ناول میں بڑی خوبصورتی سے سمویا گیا ہے اور اُن قدروں اور روایات کا احترام کیا ہے جو اُس دور کی خصوصیت تھی ---- البتہ خطوط کی تکنیک کی وجہ سے ناول میں کرداروں کی زیادہ گنجائش نہیں نکل سکی ہے۔ بس صرف لیلیٰ کا ہی کردار نمایاں ہے۔ جس کو ابھارنے اور پیش کرنے میں قاضی صاحب نے بہت جاں فشانی سے کام لیا ہے اور اس انداز سے پیش کیا ہے کہ بازاری حسن کا جیتا جاگتا اور زندہ جاوید کردار بن گیا ہے۔ اور ایک بہت بڑے طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے۔

لیلیٰ چھوٹی عمر میں زمانے کی ٹھوکریں کھانے کی وجہ سے بہت جلد ایک پختہ اور تجربہ کار عورت بن جاتی ہے۔ مرد کے ظالمانہ رویہ کی وجہ سے مردوں سے نفرت کرنے لگتی ہے حالانکہ اس کا کاروبار مرد کے بغیر سونا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مجنوں کے عشق کو سمجھ نہیں پاتی ہے ---- ابتداء میں اُس

نے اپنے دل کی آواز کو نہیں پہچانا اور سکون کی خاطر جسم کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی لیکن بعد میں احساس ہوا کہ یہ عارضی سکون ہے، اس لیے اپنی شکست کا اعتراف کر لیتی ہے۔

البتہ ایک کمی کا احساس شدت سے ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے خط کے صحیح فارمیٹ کا خیال نہیں رکھا، جس کی وجہ سے یہ خطوط ناول کے ابواب بن گئے ہیں خط میں جو روانی شگفتگی اور بے ساختگی ہوتی ہے، وہ ختم ہو گئی اور اس کا کہیں پتہ نہیں ہے، اس کی جگہ پر داعظانہ رنگ اور طنز کا پہلو ضرورت سے زیادہ نمایاں ہو گیا ہے۔

"تمھاری دولت مجھ پر برستے برستے تھک گئی۔ مگر تم کو مجھ پر وہ قبضہ مالکانہ حاصل نہ ہو سکا، جو تم سمجھتے تھے کہ دولت کے زور پر حاصل ہو سکے گا۔ اس لیے اب اللہ اور رسول کا نام درمیان میں لا کر تم مجھ سے خط غلامی لکھوانا چاہتے ہو۔"

(صفحہ ۸۵)

الغرض قاضی عبدالغفار صاحب "لیلیٰ کے خطوط" کے ذریعہ ایک منفرد ناول نگار کی حیثیت سے ابھرے اور اُس کارواں کے ایک اہم ممبر بن گئے جو اردو ناول نگاری کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوا ____ "لیلیٰ کے خطوط" کو اُس وقت کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ ناول آزادیٔ نسواں کے سلسلے کی ایک اہم اور دلچسپ کوشش ہے، جب ناول نگاری اپنے ابتدائی دور سے گذر رہی تھی، اور ناول نگاری کے فنی حدود کا تعین صحیح معنوں میں نہیں ہوا تھا ___ ایسی صورت میں "لیلیٰ کے خطوط" سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے، جس سے اردو ناول نگاری کے ارتقائی مدارج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اسی وجہ سے اس ناول کا شمار اردو ادب کے چند اہم اور تاریخ ساز ناولوں میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد ایوب تاباںؔ

قاضی عبدالغفّار اور "لیلیٰ کے خطوط"

قاضی عبدالغفّار اردو ادب میں اپنا مخصوص امتیازی اور انفرادی مقام رکھتے ہیں کیونکہ ان کی تصانیف، تالیفات، اداریے اور انشائیوں نے اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے بالخصوص "لیلیٰ کے خطوط"، اور "روزنامچہ یا مجنوں کی ڈائری" اردو زبان و ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو ناول اور انشائیوں میں ایسی تیکھی، بیباک، بے ساختہ تحریریں عنقا تھیں۔ حالانکہ بے ساختگی بے باکی اور لب و لہجہ کی عریانیت کی مثال ادب لطیف کے انشائیوں "طلسم ہوش ربا" اور دیگر داستانوی ادب کی تحریروں سے دی جا سکتی ہے لیکن ان تحریروں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ داستانوی ادب میں حقیقت بیانی، فلسفہ، معنویت اور مقصدیت یکسر مفقود ہیں اور یہی وہ واضح فرق ہے جو "لیلیٰ کے خطوط" کو اردو کے بیشتر انشائیوں سے منفرد کرتا ہے ان خطوط کو ابواب تسلیم کر لیا جائے تو بلاشبہ یہ خطوط کا مجموعہ اردو کا ترقی پسند ناول کہلانے کا مستحق ہوگا۔ اردو دنیا نے اس کو ناول ہی قرار دیا ہے لیکن خود مصنّف کا شدید اصرار ہے کہ حقیقت نگاری کے اس آئینہ کو افسانہ یا ناول سمجھ کر ہرگز نہ پڑھا جائے۔ مصنّف نے شعوری طور پر کوشش کی ہے کہ سماج میں صنف نازک کو اس کا جائز مقام بہر صورت حاصل ہونا چاہیے اور اس کمزور طبقے مراد عورتوں کی زبوں حالی کو دور کرنے کے لیے محض غور و خوض ہی کافی نہیں ہے بلکہ فلاح و بہبود کے لیے عملی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے قاضی عبدالغفار "لیلیٰ کے خطوط" کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں۔

"مجھ پر ظلم ہوگا اگر ان صفحات کو ناول یا افسانہ سمجھ کر پڑھا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کاغذی
پیرہن میں خراب آباد ہندوستان کی نسوانی زندگی کے چند نقوش پیش کرنے کی کوشش کی
گئی ہے کہ اگر اس بد نصیب ملک میں کچھ لوگ ان نقوش کے معنی سمجھ سکیں تو سمجھ لیں اور
یہ بھی سمجھ لیں کہ جس وقت تک ہندوستان کی عورت کے ساتھ پورا انصاف نہ کیا جائے
گا سیاسی آزادی اور قومی ترقی کا ادعا محض حرف غلط رہے گا"

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات بحسن و خوبی واضح ہو جاتی ہے کہ قاضی عبدالغفار ایک مصلح قوم کی طرح صنف نازک کے استحصال کے بے حد خلاف ہیں وہ ان خطوط میں صنف نازک کی بے بسی اور بدحالی کی تصویر کشی کے ذریعے رہبران قوم اور سماج کے ٹھیکیداروں پر یہ بات واضح کر دیتے ہیں کہ جب تک صنف نازک کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا اس وقت تک ملک میں سیاسی آزادی اور قومی ترقی کا خیال خام رہے گا، وہ سیاسی آزادی اور قومی ترقی و خوش حالی کے لیے صنف نازک کے ساتھ ہونے والے ظلم اور بے انصافی کو یکسر ختم کیے جانے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ اس لیے وہ آگاہ کر دینا چاہتے ہیں کہ آزادی اور ترقی کے حصول کے لیے ملک میں صنف نازک کے ساتھ انصاف اور اس کی حالت کو بہتر بنانا ہر دو چیز لازم و ملزوم ہیں یعنی ملک و قوم کی آزادی کا انحصار صنف نازک کی تعلیم و ترقی پر منحصر ہے۔ یہ وہ دور رہے کہ جب صنف نازک کا استحصال ایک معمولی اور عام بات تھی۔ عورت کی ترقی اور ہمسری کی بات سماج اور مذہب کے دعویدار لوگوں کو ناپسند تھی۔ صنف نازک کے ساتھ انصاف کرنا تو دور کی بات تھی وہ سننے کے بھی روادار نہیں تھے۔ خاص طور سے بازار حسن میں جادو جگانے والی عورتوں کی تعلیم و ترقی اور ان کو انصاف دلائے جانے کو شجر ممنوعہ سمجھتے تھے بے جا احساس کی اس شدت کو کم کرنے کے لیے مصنف اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایک بازاری عورت کی ظاہری اور باطنی زندگی کا یہ عکس مبالغہ سے
یکسر پاک ہے مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ حسن فروشی کے بازار میں ہندوستانی عورت
کی یہ خونچکاں فطرت کا ایک "مطالعہ" ہے جو زبان اردو کی علمی دنیا اور ہندوستانیوں
کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں چشم عبرت کا محتاج ہے اس دردناک تصویر کی
رنگ آمیزی اس کو جاذب نظر بنانے کے لیے ضروری تھی۔ ع

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مصنف کی دیگر تصانیف کے علاوہ "لیلیٰ کے خطوط" کی اشاعت نے جہاں اس کو قاضی عبدالغفار کو شہرت دوام بخشی تو اس کے ساتھ ہی انھیں سخت تنقید کا نشانہ بھی بن جانا پڑا کیونکہ اس دور کا سیاسی، سماجی اور معاشرتی پس منظر اس کا متحمل نہیں ہو سکا کہ بازار حسن میں بیٹھنے والی ایک معمولی طوائف علمائے دین اور سماج کے دیگر ٹھیکیداروں پر بے لاگ تبصرہ کرے اور ان کے پوشیدہ راز اپنے خطوط کے ذریعے افشا کرے۔ اپنی اس جگ ہنسائی کے لیے انھوں نے قاضی عبدالغفار کو مورد الزام قرار دیا اور نت نئے زاویوں سے اپنی خفگی اور غصے کا اظہار کیا۔ دراصل "لیلیٰ کے خطوط" کے ذریعے مصنف نے معاشرے کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا، ایک ایسا معاشرہ جو رو بہ زوال ہو چکا تھا پھر بھی اپنے ماضی کی روایات کو فراموش نہیں کر سکا تھا اور انھیں یادوں کو اپنے سینے سے لگائے بیٹھا تھا اس لیے معاشرے میں تخریب کاریاں اور اسی قسم کی دوسری خرابیاں اپنے عروج پر تھیں۔ ایک طرف جہاں جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہو رہا تھا تو بھی جاگیردارانہ ذہنیت ہنوز باقی تھی اور دوسری طرف بیرونی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کی خواہش بھی شدت اختیار کرنے لگی تھی یہ ہندوستانی تاریخ کا وہ دور تھا جب ملک میں سیاسی و سماجی انتشار پیدا ہو گیا تھا عام ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادی کے حصول کا جذبہ موجزن تھا لیکن ایک بڑی تعداد ایسے ضمیر فروشوں کی بھی تھی جو انگریزوں کے ہر طرح وفادار تھے اور چاہتے تھے کہ غیر ملکی ہندوستان چھوڑ کر کہیں نہ جائیں۔ غرض ایک افراتفری کا عالم تھا، ہندوستانی ہی ہندوستانی کا جانی دشمن ہو رہا تھا اور ایک بڑا گروہ یا طبقہ غیر ملکیوں کو اپنا آقا اور بہی خواہ سمجھ رہا تھا۔

اس افراتفری کے دور میں ہندوستانی سماج میں بہت سی برائیاں بھی پیدا ہو گئی تھیں کیونکہ سماج کے ایک بڑے طبقے نے اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کی تلخی کو فراموش کر دینے کے خیال سے خود کو عیش پرستی اور حسن پرستی کی پناہ گاہوں میں گم کر لیا تھا اس لیے بازار حسن کی رونق اپنے عروج پر تھی۔ نتیجتاً صنف نازک کا استحصال بھی اپنی انتہا کو پہونچ چکا تھا۔

سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو قاضی عبدالغفار کی حساس طبیعت نے شدت سے محسوس

کیا اور اسی حساس طبیعت اور انصاف پسندی کے جذبے نے انہیں "لیلیٰ کے خطوط" تصنیف کرنے پر مائل کیا ہوگا۔ صنف نازک کے استحصال کو ختم کرنے یا کم کرنے کے خیال سے لکھتے ہیں:

"لیلیٰ کے قلم سے جو خطوط لکھوائے گئے ہیں ان کا یہ مجموعہ نہ انشاء پردازی کی مشق ہے نہ زورِ قلم کا مظاہرہ ہے بلکہ ان خطوط میں جو وہ دیکھ سکتے ہوں لیلیٰ کا تبسم ایک فوارۂ خون، اس کی بذلہ سنجی ایک فریاد، اس کی ظرافت ایک دکھی پکار ہے اس کی شوخیوں میں اس کے دل کا درد مستور ہے اس کی شرارتوں میں اس کی جراحتیں پوشیدہ ہیں۔ لیلیٰ کی زندگی کا فلسفہ اس قدر نفرت انگیز نہیں جس قدر درد انگیز ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ہنس ہنس کر اپنے ان زخموں سے کھیلتی ہے جو اس کے وجود معنی پر ناسور بن کر رہ گئے ہیں۔ اپنی مختصر داستان میں وہ اپنی ان لاکھوں بدنصیب بہنوں کی روئداد زندگی بیان کرتی ہے جو اس ملک میں مردوں کی نفس پرستی پر قربان کی جاتی ہیں۔ لیلیٰ کی زندگی کا ہر نقش فریادی ہے"

"لیلیٰ کے خطوط" کے وسیلے سے قاضی عبدالغفار نے ایک نئے اور بالکل اچھوتے انداز سے صنف نازک کی محرومیوں اور دشواریوں کا نہایت دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ اظہار کیا ہے جو قاری کے ذہن پر خاطر خواہ تاثر مرتب کرتا ہے۔ دراصل مصنف کا مقصد ہی یہ تھا کہ مردان خطوط کی روشنی میں اپنا تزکیہ نفس کرنے پر مجبور ہو جائیں اور ان کی سوچ کے لیے نت نئی راہیں کھل سکیں تاکہ بے بس و بےکس مخلوق صنف نازک کا مزید استحصال نہ ہو اور انھیں بھی تعلیم و ترقی کے یکساں مواقع مہیا ہو سکیں جو اس زمانے میں ہندوستانی مردوں کو حاصل تھے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے مصنف نے اس دور کے علمائے دین اور رہبران قوم کے ضمیر کو جھنجوڑنے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی ہے۔ قاضی عبدالغفار کی یہ کوشش کہ وہ ایک گری پڑی مخلوق جس کی نمائندہ "لیلیٰ" اور اس جیسی لاکھوں عورتیں ہیں ان کی وکالت کرنا یا ان سے ہمدردی جتانا، یقیناً جرأت مندانہ اقدام ہیں کیونکہ یہ کوشش اس دور کے مزاج اور معاشرہ کے برعکس تھی۔ مصنف کی یہ جسارت لائق صد تحسین ہے۔

قاضی عبدالغفار نے "لیلیٰ" کے عشاق اور اس کے چاہنے والوں کی ایک بہت طویل فہرست

مرتب کی ہے جس میں اس دور کے عاشق مزاج روساء کے ساتھ ہی لیڈران قوم اور حتیٰ کہ مولوی صاحب اور پنڈت جی کو لیلیٰ کے حسن بے مثال کا گرویدہ دکھایا گیا ہے ان تمام عشاق کی اپنی اپنی ایک سماجی حیثیت ہے اس لیے یہ لوگ دن کے اجالے میں "لیلیٰ" کے سایے سے بھی گریز کرتے ہیں، دربازاری حسن کا ذکر بھی اپنی زبان پر نہیں لاتے لیکن یہی اشخاص رات کے اندھیرے میں "لیلیٰ" کو جشن منانے کے لیے اپنے خلوت خانوں میں مدعو کرنے سے نہیں چوکتے اور نامہ و پیام کا یہ سلسلہ نہایت رازداری کے ساتھ عمل میں آتا ہے۔ ان میں بعض حسن پرست ایسے بھی ہیں جو چوری چھپے رات کی سیاہی سے فائدہ اٹھا کر خود ہی "لیلیٰ" کے یہاں پہونچنے کی جسارت کر بیٹھتے ہیں اور طرح طرح کی حماقتوں کے ذریعے "لیلیٰ" کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ وہ لیلیٰ کے حسن جہاں سوز کے عاشق و گرویدہ ہیں اور ان سے زیادہ کوئی دوسرا شخص لیلیٰ کے حسن کا قدردان نہیں ہے۔ غرض یہ سب حسن پرست ایسے ہیں جو نت نئے طریقوں اور بے معنی حرکتوں سے "لیلیٰ" کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ ان سب یا بیشتر عشاق میں ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ وہ "لیلیٰ" کے زلف گرہ گیر کے مستقل طور پر اسیر رہنا چاہتے ہیں یعنی اس جنس بازاری کے ساتھ شادی کرنے کے خواہش مند نظر آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ "لیلیٰ" بلا شرکت غیرے صرف یک کی ملکیت بن جائے جہاں غیر کا گذر نہ ہو۔

ان تمام باتوں کے برعکس "لیلیٰ" اپنے عشاق کی نکاح کرنے کی خواہش سے بے حد عاجز نظر آتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک تعلیم یافتہ، سمجھ دار تجربے کار اور جہاندیدہ عورت ہے اور وہ ان تمام لوگوں کے ڈھکوسلوں اور ظاہرداریوں کو بخوبی سمجھتی ہے اور جانتی ہے کہ ان عشاق میں سے کوئی بھی اس کا عاشق صادق نہیں ہے۔ یہ ایک نفسیاتی گتھی بھی ہو سکتی ہے کیونکہ ماضی کے تلخ تجربے نے "لیلیٰ" کو عشق و عاشقی کے جذبات سے بڑی حد تک عاری کر دیا ہے اور وہ اپنے عشاق کو محض جسمانی راحت دے سکتی ہے لیکن روح کو بالیدگی عطا کرنے سے قاصر ہے۔

"لیلیٰ" اپنے پہلے خط میں ہی اپنے ایک پرستار سے اس طرح مخاطب ہے:

"آپ کی چند سطریں مختصر ہیں مگر ناقابل فہم نہیں، میری زندگی میں آپ کا یہ عنایت نامہ اپنی قسم کا پہلا مکتوب نہیں ہے برسوں گذر گئے کہ میرے دن اور میری رات کا

زیادہ حصہ اسی قسم کی خط و کتابت میں گذرتا ہے۔ یہ زندگی جو میں بسر کر رہی ہوں میرے لیے اب نئی نہیں۔ آپ نے کیوں اپنے مافی الضمیر کو الفاظ کے پردہ میں چھپایا شرمانے کا کوئی محل نہیں یہی تو کہ آپ "راہ و رسم" پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے صاف یوں کیوں نہ کہا کہ آپ بھی میرے حسن کے خریدار ہیں۔ آپ نے شب کے دستر خوان پر نیز کی شرکت اپنے لیے باعث مسرت بتائی ہے آپ نے کیوں نہ فرمایا آپ کی منزل دستر خوان کی حدود سے آگے ہے یا کہا نہیں ہے؟

بندہ نواز کسی دوکان پر جایئے تو استعارہ، اشارہ سے قطع نظر کر کے گاہک کی طرح کھل کر سودا کیجیے۔ آپ کہیں گے آپ نے اپنے خط میں آداب حجاب اور حیا کو ملحوظ رکھا، مگر میرے لیے اس پردہ کی کیا ضرورت ہے اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں بقول آپ کے آج شب کو آپ کی مہمان بنوں تو مجھے عذر ہی کیا ہو سکتا ہے؟ میں تو اسی لیے سر بازار اپنا اشتہار دیتی ہوں۔"

"لیلیٰ" کی اس طرز تحریر سے جہاں اس کے بے باک اور جہاندیدہ ہونے کا احساس ہوتا ہے اسی کے ساتھ قاری کو ڈھکے چھپے انداز میں ایک گہرے طنز کی خلش بھی محسوس ہوتی ہے اور وہ خود کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ ان خطوط میں صاف گوئی، فلسفیانہ استدلال، معروضی کیفیت اور عامیانہ انداز فکر جیسی خوبیاں اور خامیاں موجود ہیں۔

"لیلیٰ کے خطوط" کی اہم صفت یہ بھی ہے کہ وہ روش عام سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں یعنی ایک ایسے معاشرے میں جہاں صرف مرد کی حکمراں حیثیت تسلیم کی گئی ہو اور عورت مجبور محض ہو اس کی حالت غلاموں سے کچھ زیادہ بہتر نہ ہو اور بیوی تک نہایت خادمہ کا درجہ رکھتی ہو، ایسے معاشرے میں ایک جنس بازاری نہایت حقارت سے اتنی بے باک اور آزاد روی کے ساتھ تمام مردوں پر تنقید کرے جہاں جنس مخالف یعنی مرد چاپلوسی، خوشامد اور کثیر زر خرچ کرنے کے باوصف محض عارضی مسرت کا حق رکھتا ہو۔ لیلیٰ اپنے عشاق کی طویل فہرست میں کسی ایک کو بھی اس کا اہل نہیں سمجھتی کہ وہ صحیح معنوں میں ازدواجی زندگی کی خوشیاں اس کے دامن میں مہیا کرنے کا متحمل ہو سکے گا۔ یہ سب کچھ اسے زندگی کے تلخ تجربوں نے سکھا دیا ہے۔

قاضی عبدالغفار کا یہ دلچسپ ناول باؤن خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ سارے خطوط لیلیٰ کے قلم سے لکھوائے گئے ہیں۔ اس ناول کا ہر چھوٹا بڑا خط اپنے اندر ایک جہان معنی سموئے ہوئے ہے اور کیونکہ یہ خطوط ایک طوائف نے تحریر کئے ہیں اس لیے بازار حسن، وہاں کے القاب و آداب، وہاں کا ماحول، وہاں کے مکین، تماشبین اور بھانت بھانت کے عشاق اور ان کا حلیہ اور چلن، ان سب کی ہو بہو تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور قاری عارضی طور پر خود کو ایسے ہی ماحول میں گھرا پاتا ہے۔

لیلیٰ چونکہ ایک تعلیم یافتہ عورت ہے اس لیے وہ شادی کے خراب نتائج پر بھی نظر رکھتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ سماج اسے بیوی، بیٹی بہن اور ماں کے روپ میں گوارہ نہیں کرے گا۔ اس لیے وہ اپنی عافیت اسی میں سمجھتی ہے کہ وہ کسی سے بھی شادی نہ کرے لیکن اس کے باوصف وہ ناول کے ہیرو سے کسی نہ کسی طرح متاثر ہے اور شادی سے انکار کرنے کے باوجود مجنوں سے ہمدردی رکھتی ہے اور اس کی بیماری کی وجہ سے پریشان ہو جاتی ہے اپنا "کاروبار" بند کر کے مہینوں مجنوں کی تیمار داری کرتی ہے اور سدھ بدھ بھول کر ایک خدمت گذار شریک حیات کی طرح مجنوں کی دن رات خدمت کرتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجنوں اس کا شوہر نہیں ہے حالانکہ اسے مردوں سے بھی نفرت ہے کیونکہ ایک مرد ہی لیلیٰ کی تباہی کا باعث بنا تھا۔ مصنف اپنا یہ نظریہ منوانا چاہتا ہے کہ بازاری عورت بھی، اپنے شعور و لاشعور میں بیوی بننے کی تمنا رکھتی ہے۔

"لیلیٰ کے خطوط" کی اشاعت نے قاضی عبدالغفار کو شہرت دوام بخشی ہے کیونکہ یہ ناول نوجوان طبقے میں بے حد پسند کیا گیا تھا اس چند بزرگوں کے اعتراضات صدا بصحرا ثابت ہوئے اور اس کی مقبولیت پر کوئی اثر نہیں پڑا اس کا ایک مختصر خط بھی ایک بڑے باب پر بھاری معلوم ہوتا ہے۔ بلاشبہ "لیلیٰ کے خطوط" ایک صدا بہار اور عہد ساز ناول ثابت ہوا ہے اس کی افادیت سے آج بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر فوق کریمی

قاضی عبدالغفار کی آخری خواہش

مرزا غالب نے اپنی غزل کے ایک مطلع میں انسانی خواہشات کا ذکر اس طرح کیا ہے سہ

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اس مطلع کو سامنے رکھکر اگر ہم قاضی صاحب کی خواہشات کا جائزہ لیں تو یقین سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ کتنی خواہشیں اُن کی پوری ہوئیں اور کتنی باقی رہیں لیکن مجھ سے مرحوم نے بستر مرگ پر اپنی ایک خواہش کا اظہار کیا تھا وہ کیا خواہش تھی اُس کے متعلق میں اپنے اس مقالہ میں بتانا چاہتا ہوں۔

قاضی صاحب اردو کے ایک بلند پایہ ادیب ۔ سوانح نگار ۔ انشا پرداز اور ممتاز صحافی تھے ۔ میں نے ان کو ۱۹۳۶ء میں پہلی بار اُن کی دو شہرۂ آفاق کتابیں لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری کے ذریعہ جانا اور میں نے ان کتابوں کو بار بار پڑھا لیلیٰ کے خطوط کے جملے اور بعض پیراگراف مجھے زبانی یاد تھے ۔ لیلیٰ جب اپنے عاشق کو مخاطب کرتی ہے تو دیکھئے یہ جملے کون بھلا دے گا کہتی ہے ۔

”برسات کے زمانہ میں جو عقل مند ہوتے ہیں وہ دو چھتریاں رکھتے ہیں ضرورت کے وقت ایک گم ہو جائے تو دوسری کام میں آئے ۔ حقیقت آشنا تمھارے آغوش میں مجھ جیسی عورت اپنی عشوہ طرازی کے لاکھوں تماشے دکھا سکتی لیکن تم جو چاہو کہ پانی کی مچھلی خشکی پر دوڑا کرے یا جنگل کا ہرن پانی کے اندر اپنا مسکن بنائے با

شیر اپنا گھونسلہ درخت کی شاخوں میں بنائے یہ غلطی مینا زمیں جاکر وضو کے لیے
پانی مانگو یا مسجد میں بیٹھ کر مئے گلفام کی صراحی جیب سے نکالو تو دنیا کیا کہے گی۔

مجنوں کی ڈائری کی یہ عبارت دیکھیے آج کے سیاسی ماحول میں ایک پیغام درس ہے۔
"ہرن کو پکڑ کر لائے تھے اصطبل میں باندھنے کے لیے وہ نہ بندھا، ایک ہی جست
میں رسّیاں تڑا کر کہاں سے کہاں پہونچا۔ تیتری کو لائے تھے قفس میں بند کریں،
وہ اپنے رنگین پر پھیلا کر صاف نکل گئی۔ بچہ ہٹ کر رہا تھا کہ وہ آسمان کے ماہتاب
کو پکڑ کر اپنی گود میں رکھ لے اُس کے ہاتھ پھیل کر رہ گئے وہاں تک نہ پہونچ سکے۔
زندگی کے نظم نہ توڑو، ہرن کو جنگل میں رہنے دو وہی اس کا وطن ہے، تیتری کو
شاخ گل پر جھولنے دو وہی اس کا مسکن ہے چاند وہیں رہے گا جہاں ہے۔
بچے سے کہو کہ اُس کو دیکھ کر تالیاں بجائے اور ناچے مگر اُس کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے"
مجنوں کی ڈائری کا ایک اور پیرا ملاحظہ فرمائے۔
"زندگی سے موت کا خطرہ نکال دیجیے یہ تو اپنے اختیار میں نہیں کہ فنا کی شرط کو اپنی زندگی
سے خارج کر دیں، ہوتا تو یہی کرتے لیکن موت کے خطرہ کی تلخی کو زندگی کی حلاوت سے
جدا کرنے کی یہ ترکیب تو کچھ مشکل نہیں کہ موت کے تمھارے قریب پہونچنے سے پہلے
تم خود اس کے قریب پہونچ جاؤ بجائے اِس کے کہ وہ آئے اور اس کے آنے کے
خطرے کے خیال میں تم اپنی جان گھلاؤ تم ہی اُس کے پاس چلے جاؤ۔"

قاضی صاحب کو لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری کے اوراق میں پڑھنے کے بعد انھیں قریب اور بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقع مجھے اُس وقت ملا جب میں نے علی گڑھ سے ۱۹۵۲ء میں 'عالمی اُردو کانفرنس کی تحریک شروع کی تھی، اس تحریک کی آواز ملک میں بہی خواہانِ اُردو نے بڑی توجہ سے سُنی۔ ایک دو نہیں لاکھوں اردو کے چاہنے والوں نے اس تحریک کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا یہ وہ زمانہ تھا کہ آزاد ہندوستان میں اردو کی حمایت اور اس کے تحفظ و فروغ کے لیے کوئی آزادانہ کانفرنس نہیں بلا سکتے تھے۔ ہاں البتہ کچھ خوش پوش عوامی زندگی سے دور رہ کر اردو کے نام پر اپنے تحفظ کے لیے ضرور قانونی چارہ جوئی کرنا چاہتے تھے۔

عالمی اُردو کانفرنس کی تائید و حمایت میں اُردو کے مختلف مکاتبِ فکر کی جانب سے اخبارات میں بیانات و مضامین شائع ہونے لگے اردو دوستوں کے دلوں میں آزادی کے بعد حکومت کی طرف سے جو نا انصافی کا اردو کے ساتھ سلوک کیا گیا اُس کی وجہ سے پژمردگی پیدا ہوگئی تھی عالمی کانفرنس کی وجہ سے وہ پژمُردگی ختم ہوگئی اس کی جگہ ایک نیا جوش پیدا ہوگیا۔ راقم السطور نے کانفرنس کی آواز کو ملک کے مختلف مقامات تک پہونچانے کے لیے دورے شروع کئے۔ سفراء روانہ کئے گئے جگہ جگہ قصبوں اور شہروں میں عالمی اردو کانفرنس کی شاخیں قائم ہونا شروع ہوگئی تھیں۔

ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس کانفرنس میں اردو کی نمائندگی بلا تفریق نظریات و مسلک ہو اور خاص طور پر ہمارے ساتھ انجمن ترقی اردو ہند کے اراکین شریک ہوں۔ اُن کے تعاون کے لیے میں نے انجمن کے جنرل سکریٹری جناب قاضی عبدالغفار مرحوم اور صدر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مرحوم جو اُس وقت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر بھی تھے کانفرنس کی مجلس منتظمہ کے فیصلہ کے مطابق ایک درخواست ۲۳ دسمبر ۱۹۵۲ء کو قاضی عبدالغفار صاحب (مرحوم) کی خدمت میں بھیجی تھی جس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ انجمن کے تمام حضرات یکم فروری ۱۹۵۳ء کے کل ہند کانفرنس کے مشاورتی اجلاس میں شرکت فرمائیں۔ کافی ردّ و کد و غور و فکر کے بعد قاضی صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر عبدالعلیم صاحبان نے انجمن کی طرف سے مشاورتی جلسہ میں شرکت فرمائی۔

جلسہ کی صدارت جناب گوپی ناتھ امن نے کی۔ خطبۂ استقبالیہ اردو کے مخلص و مخیّر جناب نواب محمد رحمت اللہ خاں شروانی نے پڑھا۔ راقم نے بحیثیت محرّک و کنوینر اپنی رپورٹ میں کانفرنس کی غرض و غایت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ قاضی صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا "فوق کریمی صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ہمارے ساتھ ہر طرح کا تعاون کیا اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم سب مل کر اس کام کو آگے بڑھائیں اور میں اس تحریک کی اس لیے تائید کرتا ہوں کہ یہ آواز اردو کے لیے بروقت اٹھائی گئی ہے۔" ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے کانفرنس کی افادیت کا ذکر کرتے ہوئے قاضی صاحب کی تقریر کی تائید کی لیکن لفظِ عالمی پر شدید اختلاف کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو کے لیے عالمی کی ضرورت نہیں ہے اگر عالمی کا لفظ شامل کیا گیا تو حکومت کو اس

تحریک پر شک ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کے اس خیال کی تائید ڈاکٹر علیم نے بھی فرمائی۔ لیکن میں لفظ عالمی ہٹانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے عالمی کے دلائل اس طرح دیئے کہ اردو کو میں نہ صرف عالمی زبان سمجھتا ہوں۔ دوسرے اُردو کو عالمی درجہ دینے سے دنیا کے مختلف ملکوں اور خاص طور پر اپنے پڑوسی ممالک سے ہمارے تعلقات لسانی طور پر خوشگوار ہوں گے اگر آج حکومت ہماری اس تحریک کو مشتبہ سمجھتی ہے تو کل اس کو سراہے گی۔ کافی بحث و مباحثہ کے بعد صرف اردو کانفرنس نام تجویز کیا گیا۔ میں اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ لیکن ساتھ ہی حالات کی نزاکت کا بھی مجھے احساس تھا اس لیے یہ تلخ گھونٹ پینا ہی پڑا۔

قاضی صاحب کی تجویز پر مجلسِ عاملہ تشکیل پائی۔ صدر نواب رحمت اللہ خاں شروانی سکریٹری کے لیے راقم اور پروفیسر چودھری محمد سلطان کے نام تجویز کیے گئے۔ اور خازن کے لیے پروفیسر ضیاء احمد صدیقی کو منتخب کیا گیا۔ ممبران میں قاضی صاحب، ڈاکٹر عبدالعلیم، حکیم آنند سروپ بسمل، مولانا خیر بھوروی، آپا ممتاز حیدر، سید ظہیر الدین علوی، حاجی محمد زبیر کے علاوہ چار اراکینِ مجلس اور بھی تھے۔

انجمن کے سرکردہ حضرات کی شرکت کے بعد یہ امید ہوگئی تھی کہ اب کانفرنس کا کام تیزی سے آگے بڑھے گا۔ اس خیال کو ذہن میں لے کر میں نے مختلف شہروں کے دورے شروع کیے اور جہاں جہاں گیا وہاں کانفرنس کی شاخیں قائم کیں۔ جب میں بمبئی پہونچا تو میرے ساتھ قاضی صاحب نے پروفیسر واقف مرادآبادی کو بھی کر دیا تھا۔ بمبئی میں میرا قیام دس بارہ دن رہا لیکن اس مختصر وقت میں کانفرنس کے مقاصد اور انعقاد کے بروقت پروگرام اور متعدد مقامات پر پریس کانفرنسوں کی وجہ سے بمبئی کے اُردو دوستوں کی محفلوں میں عالمی اُردو کانفرنس موضوعِ گفتگو بن گئی تھی۔ اخبارات میں جب میری تقریروں کے حوالے شائع ہوئے تو لکھنؤ کے ایک اردو روزنامہ کے مُدیر محترم نے کانفرنس کے خلاف اپنے اداریوں میں سخت مخالفت شروع کردی۔ ان کی مخالفت حُبِّ علی میں نہیں بلکہ بغضِ مُعاویہ میں تھی۔ انھوں نے اپنے قلم کی پوری قوت اس پر صرف کی کہ عالمی اردو کانفرنس کے بانی اور کنوینر نہایت مستعد اور ہوشیار ہے اس نے بڑی ہشیاری سے قاضی عبدالغفار ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر عبدالعلیم کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے ساتھ مِلا لیا ہے اور یہ لوگ کیوں اس تحریک سے وابستہ ہوئے۔ اگر یہ کانفرنس ہوگئی تو انجمن ترقی اردو ہند کا

وجود خطرہ میں پڑ جائے گا اور اردو کے کاز کو سخت نقصان پہونچے گا۔ میں اس اخبار کے اداریے پڑھتا تھا اور سوچتا تھا کہ مجھے مدیر موصوف نے مجھ کو قبل از وقت بزرگ کا درجہ عطا فرما دیا۔ یہ مدیر موصوف کون تھے اور یہ اردو کے کس درجہ دوست ہیں ان کا نام، ان کا کردار آپ میری کتاب گفتار و کردار میں ملاحظہ فرمائیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں تو ابتداء سے ہی میرے ہم خیال نہ تھے۔ اُن کے خیال میں میری تحریک حکومت کے خلاف تھی۔ دوسرے اُن کے خیال میں یہ بات تھی کہ انجمن کو حکومت مالی امداد دے رہی ہے ایسی حالت میں اُردو کے لیے عوامی تحریک کا چلانا حکومت کے لیے ناپسندیدہ ہوگا۔ مجھے ان کے ان خدشات اور خیال کا علم اس وقت ہوا جب ایک دن موصوف سے دوران گفتگو میں نے کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اردو کا مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک اردو والے عوام سے رابطہ قائم نہیں کریں گے۔ میری اس بات پر ذاکر صاحب خفا ہو گئے اور فرمانے لگے کہ عوام کے رابطہ سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ میں خاموش ہو گیا۔

کانفرنس کی مخالفت میں جو آواز لکھنؤ کے اس روزنامہ نے چلا چلا کر بلند کی تھی اس سے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پروفیسر رشید احمد صدیقی، قاضی صاحب کے مقابلہ میں زیادہ متاثر ہوئے۔ رشید صاحب نے استعفیٰ دے دیا اور ذاکر صاحب نے دامن بچا لیا۔ البتہ قاضی صاحب اور ڈاکٹر عبدالعلیم ہمارے ساتھ رہے۔ ذاکر صاحب نے قاضی صاحب کو مجبور کیا کہ وہ مجھ سے تعلقات منقطع کر لیں۔ لیکن قاضی صاحب نے ان کا مشورہ قبول نہیں کیا تو ذاکر صاحب نے انجمن کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور اس وقت قاضی صاحب کو کئی ماہ تک مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جو تنخواہ یا الاؤنس انھیں انجمن سے ملتا تھا وہ ذاکر صاحب کے مستعفی ہو جانے کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ قاضی صاحب کے پتے میں پتھری (Stone) تھی جس کا آپریشن دہلی میں دریا گنج کے ایک پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں ہوا۔ اس کے اخراجات کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد نے پانچ سو روپیہ بھیج دئے تھے۔ آپریشن کامیاب ہو گیا۔ دو تین دن کے بعد ان کی چھوٹی بیٹی عزیزہ فاطمہ نے مجھے ٹیلی گرام کے ذریعہ دہلی بلایا۔ میں جب نرسنگ ہوم پہنچا تو اس وقت قاضی صاحب سو رہے تھے۔ فاطمہ نے کہا کہ اچھا ہوا آپ آگئے کئی بار آپ کو

یاد کر چکے تھے۔ ابھی اٹھاتی ہوں میں نے کہا نہیں، سونے دیجئے۔ لیکن کچھ دیر کے بعد وہ از خود بیدار ہو گئے۔ میں نے سلام کیا۔ اور بے مجھے اپنے قریب بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ رسمی گفتگو کے بعد میں نے بڑے ادب سے قاضی صاحب سے پوچھا۔ آپ کی کوئی خواہش ایسی بھی ہے جو دنیا میں پوری نہیں ہوئی تو کچھ سوچ کر کہنے لگے کہ ہاں ایک خواہش اب ایسی ہے کہ اگر خدا نے مجھے صحت دے دی تو میں تمھیں اپنے ساتھ لے کر اردو کے تحفظ کے لیے عوام سے رابطہ قائم کروں گا۔ میری زبان سے نکلا آمین۔ خدا آپ کو جلد صحت دے۔ قاضی صاحب دہلی سے علی گڑھ آگئے لیکن اُن کی صحت برابر گرتی رہی اور انھیں موت نے اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ اپنی اس آخری خواہش کو میرے ساتھ رہ کر پوری کرتے۔

انجمن ترقی اردو ہند اردو کا ایک نمائندہ باوقار اور قدیم ادارہ ہے۔ قاضی صاحب کے بعد اس ادارے کے صدر اور سکریٹری ایک سے ایک علم دوست آئے لیکن اردو کے لیے کسی نے نہ تو کوئی انقلابی قدم اٹھایا اور نہ عوام سے رشتہ جوڑا۔ شکر ہے کہ انجمن کی موجودہ قیادت خاص طور پر جناب سید حامد (صدر) اور جناب ڈاکٹر خلیق انجم اس راز کو سمجھتے ہیں جس کا اظہار قاضی عبدالغفار مرحوم نے بستر مرگ پر مجھ سے آخری خواہش کے نام سے کیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ انجمن ترقی اردو ہند مصلحت اور شخصیت سے صرف نظر کرتے ہوئے اردو کے تحفظ کے لیے قاضی عبدالغفار مرحوم کی آخری خواہش کا احترام کرے گی۔ آخر میں میں اپنے اس مقالہ کو قاضی صاحب کے لیلیٰ کے خطوط کے اہم ویں خط پر ختم کرتا ہوں۔

"لیلیٰ کہتی ہے، دُنیا میں نہ گناہ کوئی چیز ہے اور نہ ثواب ساری زندگی کی بنیاد صرف دو عناصر پر ہے قوی اور ضعیف۔ قوی سراپا ثواب ہے اور ضعیف سراپا گناہ۔ یہی صرف دو قانون ہیں، دو مذہب ہیں، دو مسلک ہیں، دو قومیں ہیں۔ انسانیت کے دو اصول ہیں۔ ترازو کے دو پلّے ہیں۔ بس قوی اور ضعیف ان دو لفظوں میں دنیا کی تمام زندگی کی تفصیل مرکوز ہے۔ قوی قانون بناتا ہے۔ ضعیف اپنی قبر یں کھودتا ہے جو شراب قوی پئے وہ بالکل جائز اور حلال جو ضعیف پئے وہ مطلق حرام اور ناجائز۔ جو قتل قوی کرے وہ انصاف اور جائز انتقام اور جو ضعیف

کرے اس کی سزا موت۔ اور جو خلاف ورزی فطرت قوی کرے وہ عین فطرت
اور جو ضعیف کرے وہ مستوجب سزا۔ عدالت سے دن رات سزائیں دی جاتی
ہیں۔ سزا اور جزا کا انحصار ذرا بھی نیک و بد اعمال پر نہیں ہے۔ دراصل انحصار
فریقین کی قوت ضعف پر ہے۔ پھر کیوں ناحق اخلاق اور اعمال کے معیار کو
آسمانی اور ربانی کہتے ہو۔"

اردو ایک قومی زبان ہے لیکن آزادی کے بعد اردو کو اُس کے دشمنوں نے نہیں بلکہ اس کے چاہنے والوں نے ضعیف بنا دیا۔ گزشتہ ۴۲ سال کے درمیان اردو بولنے والی ماؤں اور باپوں کی آغوش میں جو نسل پروان چڑھی ہے اُن کے لیے اُردو ضعیف اور بے سہارا اور بے فیض ہے۔ اسی لیے ہمارے نوجوان اردو سے قطعی بے بہرہ ہیں۔ یہ قصور ان کا نہیں بلکہ ان کے والدین کا ہے اور سب سے بڑا نقصان اردو کو اُن لوگوں سے پہونچا ہے جو اردو کا نام اور اردو کے تحفظ کا نعرہ اپنی منفعت اور اپنے وقار کے لیے بلند کر رہے ہیں۔ تاریخ ایسے لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرے گی ابھی وقت ہے اور در توبہ کھُلا ہوا ہے۔ اردو کے نام نہاد نام لیوا اپنا اپنا احتساب کریں۔ اور دنیاوی خواہشات کو قاضی عبدالغفار کی آخری خواہش میں بدل دیں تو اردو کا مستقبل یقیناً تابناک بن سکتا ہے۔

ایم. حبیب خاں

قاضی عبدالغفار اور انجمن ترقی اردو (ہند)

قاضی عبدالغفار اردو کی بڑی رنگا رنگ اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اور ہماری علمی اور تہذیبی زندگی کا دلکش نمونہ تھے۔ انھوں نے ادب اور صحافت دونوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں اور دونوں میں امتیاز حاصل کیا۔

ان کی پیدائش مراد آباد کے زمیندار گھرانے میں ہوئی تھی لیکن پیدائش کے متعلق قاضی صاحب کی عمر کے بارے میں خاصا اختلاف نظر آتا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ وہ ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے اور بعض ۱۸۸۹ء بتاتے ہیں لیکن قاضی صاحب نے اپنی ایک گفتگو میں جو انجمن کے دفتر میں ہوئی تھی جس میں احمق پھپھوندوی (محمد مصطفٰی خاں مداح) علامہ خبیر بہوروی اور راقم بھی موجود تھا، احمق صاحب نے قاضی صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کی سنہ پیدائش کیا ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ مجھے اپنی عمر کے بارے میں کبھی یاد نہیں رہتا، ہاں میری ایک کتاب "عجیب" ہے اس میں میں نے اپنی عمر کے بارے میں درست لکھا ہے۔ چنانچہ اپنی عمر کے متعلق "عجیب" میں لکھا ہے کہ ۱۹۰۸ء میں ان کی عمر ۲۳ سال تھی۔ اس حساب سے ان کا سنہ ولادت ۱۸۸۵ء قرار پاتا ہے۔ قاضی صاحب کی چھوٹی صاحبزادی فاطمہ عالم علی کا بیان ہے کہ قاضی صاحب دسمبر ۱۸۸۹ء[۱] میں پیدا ہوئے لیکن میرے نزدیک قاضی صاحب کا بیان اور "عجیب" میں عمر کے تذکرے کی تصدیق بناتی ہے۔

---

[۱] یادش بخیر۔ فاطمہ عالم علی

۱۸۸۵ء زیادہ قرین قیاس ہے البتہ دسمبر کے مہینے کو صحیح مان لیں تو ان کے انتقال کے وقت (۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء) قاضی صاحب کی عمر ۷۰ سال سے کم نہیں ہوسکتی۔ میں نے ۶ سال تک انجمن میں ان کے ساتھ کام کیا ہے اور ان کے انتقال کے وقت میں موجود تھا۔ اس لیے دسمبر ۱۸۸۵ء درست تسلیم کی جاسکتی ہے۔

قاضی عبدالغفار کے والد کا نام خان بہادر قاضی ابرار احمد تھا۔ وہ زمیندار ہونے کے علاوہ مراد آباد میں درجہ اوّل کے آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ قاضی صاحب کے دادا قاضی حامد علی نے ۱۸۵۷ء کے غدر میں ایک مغل شہزادے کو پناہ دی تھی جس کے جرم میں انھیں پھانسی دی گئی اور ان کی تمام جائداد کو انگریزی حکومت نے ضبط کرلیا۔ ان کے حق ہونے کے بعد عدالت نے ان کو جب بے قصور ثابت کردیا تو ان کی جائداد اور تمام مکانات واپس مل گئے۔ قاضی صاحب کے والد نے پانچ شادیاں کیں۔ یہ قاضی صاحب کی دوسری بیوی ہدایت النسا بیگم سے تھے۔ ان سے تین لڑکے اور چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ بڑے لڑکے قاضی عبدالغفار تھے۔ ابتدائی تعلیم مراد آباد میں حاصل کی اور یہیں سے ۱۹۰۵ء میں دسویں جماعت کا امتحان پاس کرکے والد نے اعلا تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیا۔ اس وقت ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے پرنسپل سر تھیوڈور مارلیسن تھے۔ یہاں وہ انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کرسکے۔ قاضی صاحب کے والد کا عمل دخل انگریزی سرکار میں خاصا تھا اور انگریزوں میں بھی مقبول تھے۔ اس لیے انھوں نے قاضی عبدالغفار کو انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد کوشش کرکے ان کو نائب تحصیلدار مقرر کرادیا۔ اس کے بعد ترقی کرکے تحصیلدار ہوگئے اور اس عہدے پر دو سال تک کام کیا۔ قاضی صاحب کو صحافت سے شروع سے دلچسپی تھی۔ اس لیے ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہوکر مولانا محمد علی نے ان کو اپنے اخبار "ہمدرد" میں بحیثیت نائب مدیر مقرر کردیا۔

قاضی ابرار صاحب کی چوتھی بیوی سے دو لڑکے پیدا ہوئے قاضی مشتاق احمد اور قاضی نثار احمد۔ قاضی مشتاق احمد آجکل دلّی میں رہتے ہیں۔ ان کے تین لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ تینوں اولادیں زندہ ہیں لڑکی کا نام قمر جہاں ہے۔ مشتاق صاحب نے لڑکی کی شادی مراد آباد میں ضامن علی خاں صاحب سے کردی۔ ضامن صاحب اے۔ جی۔ سی۔ او کے دفتر میں ملازم تھے اور

غالب ہاؤسنگ سوسائٹی کے سکریٹری تھے پانچ سال ہوئے ان کا اچانک انتقال ہوگیا اور قمرجہاں نوجوانی میں بیوہ ہوگئیں۔ ان کے والد قاضی مشتاق احمد ذاکر نگر میں ان کے پاس رہتے ہیں۔ ضامن صاحب بڑے ہر دلعزیز اور رحمدل انسان تھے۔ اچھائی اور برائی کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ اچھے اور برے ہر جگہ ہوتے ہیں۔ ضامن صاحب میں اچھائیاں بہت تھیں اسی لیے ان کے دوست بھی بہت تھے۔

قاضی صاحب طالب علمی کے زمانے میں کوٹ پتلون بہت شوق سے پہنتے تھے اور علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی میں شروانی اور ترکی ٹوپی پہننے لگے تھے سفر یورپ کے بعد کوٹ پتلون بالکل ترک کر دیا اور شروانی اور چوڑی دار پائجامہ پہننے لگے اور زندگی بھر یہی لباس پہنا۔ طبیعت میں نفاست بہت تھی اس لیے لباس عام طور پر صبح و شام تبدیل کرتے تھے طبعاً خاموش پسند اور خود دار تھے۔ گندمی رنگ، اونچا قد، چوڑی پیشانی، چہرے پر متانت اور خود اعتمادی ظاہر ہوتی تھی۔ بڑے وجیہہ انسان تھے خشخشی داڑھی سے ان کی شخصیت بڑی پروقار لگتی تھی جس محفل میں جاتے لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھ جاتیں۔ اچھے کھانے ان کو بہت پسند تھے۔

قاضی صاحب نے دو شادیاں کیں پہلی شادی افضال بیگم سے کی جن سے چار لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ چاروں لڑکے معذور پیدا ہوئے۔ جن میں تین ایک ایک کرکے فوت ہو گئے البتہ منجھلے لڑکے ارشاد علی ۲۲ سال زندہ رہے ان میں سب سے بڑی لڑکی کا نام زہرہ بیگم تھا جن کی شادی سندیلے کے چودھری محمد سلطان صاحب سے ہوئی تھی زہرہ بیگم کا ۱۹۷۰ء میں انتقال ہوگیا۔ افضال بیگم کے انتقال کے وقت دوسری لڑکی فاطمہ بیگم کی عمر دس دن کی تھی ان کی شادی قاضی صاحب نے ہاشم علی خاں جج ریاست حیدرآباد کے فرزند عالم علی خاں صاحب سے کر دی۔ ہاشم علی صاحب اس وقت نظام شوگر فیکٹری میں منیجر تھے۔ قاضی صاحب کی یہ صاحبزادی حیات ہیں اور حیدرآباد میں رہتی ہیں۔ قاضی صاحب نے دوسری شادی سکینہ بیگم عرف منی بیگم سے کی جن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ قاضی صاحب نے زہرہ بیگم کے چھوٹے صاحبزادے طارق سلطان کو گود لے لیا تھا جن کی تعلیم و تربیت خود قاضی صاحب نے کی۔

قاضی صاحب بے مثل صحافی اور انشاپرداز تھے۔ وہ اپنے اسلوب نگارش کے بارے میں

ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

"میری لکھائی کا ڈھنگ ایسا ہے جیسے کسی مرض کا دورہ پڑے۔ جب لکھنے کا دورہ پڑتا ہے تو لکھے چلا جاتا ہوں، صبح شام دوپہر۔ اور نہیں لکھتا تو مہینوں ایسے گزرتے ہیں کہ قلم کو کاغذ سے دشمنی ہو جاتی ہے۔ اس دورہ کی کیفیت تو ایسی ہوتی ہے جیسے شرابی کا نشہ لیکن جب وہ وقت گزر جاتا ہے تو جیسے بادل برس کر کھل جائے۔"

قاضی صاحب کی لکھائی کا ڈھنگ ان کی بیشتر تحریروں میں اسی طرح کا ثبوت فراہم کرتا ہے جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں مولانا محمد علی کے اخبار "ہمدرد" سے ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا اور مولانا محمد علی سے انھوں نے صحافت کے وہ تمام گر سیکھے جو اس فن کے معیار کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ مولانا محمد علی نے قاضی صاحب سے "ہمدرد" کے لیے سب سے پہلا مضمون "مصر" پر لکھوایا تھا جو بالاقساط "ہمدرد" میں شائع ہوا تھا۔ مولانا کی نظر بندی کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا۔ قاضی صاحب نے کلکتے سے "جمہور"، اور دلی سے "صباح" نکالا۔ آخر میں حیدرآباد سے "پیام" ۱۹۳۵ء میں جاری کیا۔ یہ اخبار اعلا صحافتی معیار کی وجہ سے پورے ہندوستان میں مشہور ہو گیا تھا اور اس اخبار نے رائے عامہ کو ایسا متاثر کیا تھا کہ بہت سے اہل قلم اور نوجوان طبقہ ان کے ادبی شہ پاروں پر سر دھنتے اور ان کے مضامین سے فیض اٹھاتے اور اس کے پڑھنے کے لیے لوگ پہلے سے منتظر رہتے تھے۔ قاضی صاحب پکے محب وطن تھے ساری عمر تنگ نظری اور تعصب کے خلاف جنگ کرتے رہے۔ حیدرآباد میں نواب سر مرزا اسماعیل کے عہد میں نجف علی خاں کی جگہ پر نظام سرکار میں محکمہ اطلاعات کے ناظم مقرر ہوئے جہاں تین سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔

"نقش فرنگ" اور "لیلیٰ کے خطوط"، قاضی صاحب کی انشا پردازی کے دو اعلا نمونے ہیں "نقش فرنگ" سفر نامہ ہے اس میں یورپ کی دلکش تصویریں پیش کی ہیں۔ "لیلیٰ کے خطوط" سب سے پہلے نیرنگ خیال لاہور میں بالاقساط شائع ہوئے جس نے یہ خطوط پڑھے وہ قاضی صاحب کی انشا پردازی کا قائل ہو گیا۔ لیلیٰ کے خطوط میں ایک عورت کی مظلومیت کی داستان ہے جس میں سماج کی بے انصافیوں پر طنز ہے۔ یہ انشائے لطیف کا بہترین شاہکار ہے۔ مجنوں کی ڈائری لیلیٰ کے خطوط کا ضمیمہ ہے۔ یہ شاہکار نہ سہی مگر قاضی صاحب کے نگارخانے کی

دلکش تصویر ہے۔ اس میں مجنوں کی کیفیات کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ "عجیب" "اس نے کہا" اور "زین پیسے کی چھوکری" اور "سیب کا درخت" بھی اسی دور کی یادگار تصانیف او ترجمہ ہیں۔ حیدرآباد کے قیام کے زمانے میں انھوں نے "آثار جمال الدین افغانی" لکھی۔ یہ انیسویں صدی کے مشہور رہنما کی سوانح عمری ہے۔ اور اس کا شمار اس عہد کی بہترین سوانح عمریوں میں ہوتا ہے۔

اگست ۱۹۴۷ء کے آخر میں دلی میں ایک قیامت برپا تھی ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا۔ قاضی صاحب ان دنوں حیدرآباد کی سکونت ترک کر کے مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں مقیم تھے مولانا اس وقت ۱۹۔ اکبر روڈ پر رہتے تھے۔ مولانا سے دوستانہ تعلقات تو بہت پرانے تھے لیکن یہاں مولانا کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہاں مولانا کی خاموش خلوت اور سنجیدہ جلوت ان کی نظر کے سامنے رہنے لگی۔ لیلیٰ کے خطوط اور آثار جمال الدین افغانی کے بعد قاضی صاحب کے ذہنی شعور اور ادبی کاوشوں میں کافی تبدیلی آچکی تھی ان کا مولانا کے یہاں ڈیڑھ سال قیام رہا۔ اس عرصے میں لکھنے کے بہت مواقع ملے چنانچہ قاضی صاحب نے مولانا پر ایک مبسوط کتاب آثار ابوالکلام آزاد کے نام سے لکھی جسے آزاد کتاب گھر نے شائع کیا۔ آثار ابوالکلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کے انداز بیان کا اثر قاضی صاحب کے اسلوب نگارش پر بھی پڑا۔

انجمن ترقی اردو ہند سے وابستگی۔ انجمن ترقی اردو ہند کا صدر دفتر دریا گنج میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں تھا، ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں بلوائیوں نے اس پر حملہ کر کے اس کے دفتر کو تہس نہس کر دیا تھا اور اس کے قیمتی کتب خانے کو آگ لگا دی تھی۔ مولانا آزاد کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو انھوں نے اس کے تحفظ کے اقدامات سرکاری سطح پر کر لئے اور جو کچھ بچا تھا اس پر سرکاری پہرہ لگوا دیا۔ مولوی عبدالحق صاحب اور مولانا آزاد میں اس سلسلے میں خط و کتابت جاری تھی مولوی عبدالحق چاہتے تھے کہ وہ اردو کی خدمت دونوں ملکوں میں رہ کر کریں۔ مولانا آزاد اس بات پر تیار نہ تھے، وہ چاہتے تھے کہ مولوی عبدالحق یا تو ہندوستان میں رہ کر اردو کی خدمت کریں یا پاکستان میں۔ بالآخر مولوی عبدالحق نے پنڈت کیفی سے مشورہ کر کے پاکستان کو ترجیح دی اور وہ مستقل طور پر پاکستان چلے گئے اور کراچی میں انجمن ترقی اردو کی داغ بیل ڈالی، جاتے وقت اپنے ذاتی

کتب خانے کے علاوہ انجمن کے کتب خانے کے کچھ اہم نوادرات بھی نے گئے۔ اب مولانا ابو الکلام آزاد نے فیصلہ کیا کہ انجمن ہندوستان میں رہ کر اردو کے فروغ کے لیے کام کرے چنانچہ انھوں نے انجمن کا صدر دفتر علی گڑھ منتقل کرا دیا اور قاضی محمد عبدالغفار کو اس کا جنرل سکریٹری منتخب کیا اور ڈاکٹر ذاکر حسین جو اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہو چکے تھے انجمن کے صدر بنائے گئے۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۴۹ء میں قاضی عبدالغفار نے علی گڑھ میں سلطان جہاں منزل کے ایک گوشے میں انجمن کا دفتر قائم کیا۔ مولانا آزاد کا یہ زبردست کارنامہ ہے کہ انھوں نے اردو کے اس ادارے کو ضائع ہونے سے بچا لیا۔ اور قاضی صاحب نے اس کی از سر نو شیرازہ بندی کی۔

جنوری ۱۹۵۰ء سے باقاعدہ انجمن کے کام کا آغاز ہوا "ہماری زبان" اور "اردو ادب" (اس سہ ماہی رسالے کا تقسیم سے پہلے "اردو" نام تھا) ۱۹۵۰ء سے جاری ہوئے۔ ہماری زبان کے اڈیٹر قاضی عبدالغفار مقرر ہوئے اور سہ ماہی "اردو ادب" کے اڈیٹر پروفیسر آل احمد سرور بنائے گئے۔ ہماری زبان اردو تحریک کا واحد ترجمان تھا جس نے اردو کاز کے سلسلے میں اہم رول ادا کیا۔ یہ ترجمان قاضی صاحب کے زمانے تک پندرہ روزہ رہا بعد میں قاضی صاحب کے جانشین پروفیسر آل احمد سرور نے شروع میں اس کو پندرہ روزہ رکھا اس کے بعد ہفت روزہ کر دیا۔ درمیان میں چند سال تک پندرہ روزہ مالی وسایل کی کمی کی وجہ سے رہا اس کے بعد ہفت روزہ ہو گیا اور تب سے ہفت روزہ شائع ہو رہا ہے۔ اب قاضی صاحب کے سامنے انجمن کے لیے دو مقاصد تھے ایک تو علم و ادب کی خدمت اور دوسرے اردو زبان کا تحفظ۔ وہ مرتے دم تک ان دونوں محاذوں پر بڑی کامیابی اور مستعدی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔

تقسیم ہند کے بعد اردو کی حالت ہر روز گرتی جا رہی تھی اور اردو کے لیے پیچیدگیاں پیدا کی جا رہی تھیں۔ ادھر قاضی صاحب کی مسلسل بیماری کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن وہ اسی حالت میں اردو تحریک کے سلسلے میں جدوجہد کرتے رہے اور اپنی آواز اردو کے حق میں گھر گھر پہنچاتے رہے۔ علامہ نیر بہوروی مرحوم (نمائندہ خصوصی) مولوی عبدالحق کے زمانے میں ان کے ساتھ کام کر چکے تھے اور با اثر لوگوں میں تھے۔ قاضی صاحب اردو کی حالت کا جائزہ لینے علی گڑھ سے باہر ان کو بھیجتے اور ان سے اردو کے حق میں بیان دلواتے اور تقریریں کراتے اور انجمن کی شاخوں کی تنظیم اور

شاخوں کے قیام کی سبیل پیدا کرتے ۔ ان کے زمانے میں انجمن کی بہت سی نئی شاخیں ہندوستان میں قائم ہوئیں۔

قاضی صاحب نے اردو کے حق میں وزیر دل گورنروں اور اردو مخالف حضرات سے بھی لڑائیاں لڑیں، اردو کے حق میں اردو کانفرنسیں، شاخوں کی از سرِ نو تنظیم کی، ہندوستان کے دوسرے کیے دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت ۲۲ لاکھ دستخطوں کا ایک میمورنڈم ڈاکٹر ذاکر حسین کی قیادت میں صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ میمورنڈم دستورِ ہند کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت سرکاری طور پر اردو کو اتر پردیش کی علاقائی زبان تسلیم کرانا تھا۔ ان کی اس جدوجہد سے اردو کے حق میں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ کچھ آسانیاں ہو گئیں مگر اتر پردیش کی علاقائی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس کے لیے مرتے دم تک جدوجہد کرتے رہے۔

قاضی صاحب نے ۲۲ لاکھ دستخطوں کی مہم مرکزی دفتر سے شروع کی تھی جس کے ثبوت ہماری زبان کے فائلوں میں موجود ہیں یہاں صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں جس میں قاضی صاحب نے یکم دسمبر ۱۹۵۱ء اور یکم جنوری ۱۹۵۲ء کے ہماری زبان میں دستخطی مہم کے فارم کا نمونہ اور اس کا اعلان ان الفاظ میں کیا تھا (اعلان اگلے صفحہ پر دیکھیے)، چوں کہ معاملہ اتر پردیش میں اردو کو علاقائی زبان تسلیم کرانے کا تھا اس لیے مرکزی انجمن کی صوبائی شاخ اتر پردیش نے دستخط حاصل کرنے کے لیے قاضی صاحب کو پورا تعاون دیا۔ اس وقت حیات اللہ انصاری صاحب قومی آواز کے اڈیٹر اور انجمن کی طرف سے اردو علاقائی مہم کے سکریٹری مقرر کیے گئے تھے۔ یو۔ پی کے مختلف مقامات پر قائم مراکز کو منظم کرنے میں مرکزی دفتر ہمیشہ پیش پیش رہا۔ قاضی صاحب نے اُس وقت اپنے اداریے میں لکھا تھا۔

> اتر پردیش میں دستخطوں کی تحریک کے سات سو مراکز قائم ہیں اور یہ مرکزی انجمن کی شاخوں کے علاوہ ہیں۔ اب ان میں سے ہر مرکز ڈیڑھ سو روپے جمع کر کے بھیج دے تو دس ہزار سے زیادہ کی رقم جمع ہو جاتی ہے جو کام تو مشکل معلوم ہوتا ہے درحقیقت کتنا آسان ہے۔ اس وقت اردو تحریک کے چار پانچ ہزار ورکر تمام صوبے میں کام کر رہے ہیں۔ اگر ان میں سے چار ہزار اشخاص تین تین سو روپے فی کس بھی ادا کریں تو بارہ ہزار روپے ہم کو مل جاتے ہیں۔"

دستخط کیجئے!!

اردو زبان کی حفاظت
کا

اب ایک ھی ذریعہ ھے

وہ ھمارے ملک کے دستور کي دفعہ ۳۴۷ ھے

مرکزی انجمن

اردو کے تمام حامیوں کو اواز دیتي ھے کہ وہ اس

محضر پر لاکھوں دستخط

حاصل کریں جو صدر جمہوریہ کی خدمت میں
پیش کیا جائیگا

اردو کے حامیوں کی مرکزی جماعت

یعنی
انجمن ترقی اردو (ھند) علیگڈھ
سے

فارم کے نمونے فوراً طلب کیجئے

اور جتنے فارموں کي تکمیل ھوتي جائے

انھیں صدر دفتر (علیگڈھ) کے پتہ پر بھیجئے

یاد رکھئے

اردو زبان کي جڑیں بہت مضبوط ھیں

اس کو کسي مخالف کي مخالفت سے نقصان نہیں پہنچ سکتا

الّا یہہ کہ خود اردو کے حامیوں کي غفلت اسے مجروح کردے!!

حیات اللہ انصاری صاحب کے ساتھ ان کی اہلیہ بیگم سلطانہ حیات صاحبہ نے بھی اس سلسلے میں ان کے ساتھ مرکز کو پورا تعاون دیا۔ غرض قاضی عبد الغفار نے چندے کی فراہمی کے سلسلے میں ہماری زبان کے ذریعہ اور خود دورے کر کے اس مہم کے لیے چندہ اکٹھا کیا۔ اگست تک جب اس مہم میں کامیابی کی شکل نظر آئی تو صدر انجمن ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے اگست کے خطبے میں دستخطی مہم کی کامیابی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ:

"اس وقت ۲۱ لاکھ دستخط ہمارے پاس موجود ہیں۔ اتر پردیش کے شہر شہر، قصبہ قصبہ تحصیل تحصیل کوئی ۵ مرکزوں میں چار ہزار پانچ سو سے اوپر رضا کاروں نے ہر مذہب و ملت کے اردو بولنے والوں سے اس محضر پر ۲۱ لاکھ دستخط حاصل کیے ہیں جلسوں، جلوسوں کے بغیر، بے شور و شغب، سیاسی شورش کے رائج الوقت اسلوب سے اپنی بات منوانے کے چالو ڈھنگ سے بہت الگ انداز میں خاموشی اور متانت سے پھیلا ہوا کام انجام کو پہنچایا گیا ہے۔ میں کام کرنے والوں کو اس پر مخلصانہ مبارک باد دیتا ہوں اور مجھے سچی خوشی ہے کہ یہ کام اس طرح ہوا کہ کام کے انداز میں مجھے کام کی اصلی روح کی جھلک دکھائی دیتی ہے اس میں اپنے مطالبہ کی سچائی پر بھروسہ دکھائی دیتا ہے باوجود ظاہری اسباب مایوسی کے اعتماد" (داگست ۵۳ء ص ۶)

اسی خطبے میں ذاکر صاحب آگے لکھتے ہیں۔

"غضب ہے دوستو! کہ کوئی تر بھون ناتھ ہجر، رتن ناتھ سرشار، پروفیسر رام چندر، سدرشن، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، برج موہن دتاتریہ کیفی اور کرشن پرشاد کول کی زبان پر مذہبی فرقہ واریت کا بہتان باندھے۔ دیا شنکر نسیم، جوالا پرشاد برق، برج نرائن چکبست درگا سہائے سرور، رگھوپتی سہائے فراق، منشی نول کشور، لالہ سری رام، پنڈت منوہر لال زتشی، سر تیج بہادر سپرو، منشی دیا نرائن نگم اور مہاراج کشن پرشاد کی زبان پر مذہبی تنگ دلی کی تہمت لگائی جائے جس میں آریہ سماج تحریک کا تمام تر مواد موجود ہو، جس سے عیسائی مشنریوں نے پورا کام لیا ہو، اسے مسلمانوں کی زبان چلا چلا کر بتانا اور تعصبات مذہبی کی ہوا دے کر نفرت کی آگ بھڑکانا کیسی ناروا بات ہے؟ بڑا ستم ہے دوستو!"

اس خطبے کے آخر میں ذاکر صاحب۔ ان تمام مخلص کارکنوں کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے مرکزی انجمن کے ساتھ تعاون کیا' لکھتے ہیں۔

"آخر میں ایک بار پھر ان مخلص کارکنوں کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے دستخط حاصل کرنے کی اس مہم میں مرکزی انجمن کا ہاتھ بٹایا۔ خصوصیت کے ساتھ پنڈت کشن پرشاد کول، جناب حیات اللہ انصاری اور بیگم حیات اللہ کا جن کی پرخلوص محنت اور جن کی تدبیر سے یہ کام انجام کو پہنچا۔"

اس کام میں جب ۲۲ لاکھ دستخط حاصل ہوگئے تو اتر پردیش میں اردو کو علاقائی زبان تسلیم کرانے کے لیے دفعہ ۳۴۷ کے تحت ۱۵ فروری ۱۹۵۴ء کو شام ۴ بجے ایک وفد ڈاکٹر ذاکر حسین صدر انجمن ترقی اردو ہند کی قیادت میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد سے دلّی میں ملا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے تمام اراکین وفد کا صدر جمہوریہ ہند سے تعارف کرایا۔ وفد کے اراکین حسب ذیل تھے:

(۱)	ڈاکٹر ذاکر حسین	(قائد) صدر انجمن ترقی اردو ہند
(۲)	پنڈت کشن پرشاد کول	رکن
(۳)	پنڈت ہردے ناتھ — کنزرو	ممبر پارلیمنٹ
(۴)	مولانا حفظ الرحمٰن	ممبر پارلیمنٹ و رکن انجمن ترقی اردو ہند
(۵)	پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی	نائب صدر انجمن
(۶)	جناب حیات اللہ انصاری	رکن انجمن ترقی اردو ہند
(۷)	بیگم سلطانہ حیات صاحبہ	
(۸)	پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب	
(۹)	قاضی محمد عدیل عباسی	ایم۔ ایل۔ اے
(۱۰)	محترمہ اوما نہرو	ممبر پارلیمنٹ
(۱۱)	پنڈت سندر لال	رکن انجمن ترقی اردو
(۱۲)	جناب کرشن چندر	رکن انجمن ترقی اردو
(۱۳)	قاضی عبدالغفار	(جنرل سکریٹری)

۲۲ لاکھ دستخطوں کے ساتھ میمورنڈم صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں ۱۵ فروری ۱۹۵۴ء کو شام ۴ بجے مندرجہ بالا اراکین وفد کے سامنے ڈاکٹر ذاکر حسین صدر انجمن ترقی اردو ہند نے پیش کیا۔

(معروضہ اراکین وفد انجمن ترقی اردو (ہند))

عالی جناب صدر جمہوریہ۔ ہندوستان نئی دہلی

جناب والا۔

"آل انڈیا انجمن ترقی اردو اور اتر پردیش کی اردو بولنے والی آبادی کی جانب سے ہم ممبران وفد نہایت ادب سے جناب والا کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔

سب سے پہلے ہم جناب والا سے التجا کرتے ہیں کہ ہمیں بعض امور کی تصریح کرنے کی اجازت عطا فرمائیں جو حال ہی میں ہمارے وفد کے مقصد کے متعلق زیر بحث آئے ہیں اور جن سے بعض حلقوں میں کسی قدر غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ ہمارے ملک کے دستور کے فقرہ ۳۴۳ کی رو سے قرار پایا ہے کہ "یونین کی سرکاری زبان دیوناگری رسم الخط میں ہندی ہوگی"۔

آل انڈیا انجمن ترقی اردو اور وہ سب لوگ جن کی ہم نمائندگی کرتے ہیں اپنی دستور ساز اسمبلی کے اس فیصلہ پر سر تسلیم خم کرتے ہیں اور دیوناگری رسم الخط میں ہندی پڑھنا اور فقرہ ۳۵۱ میں جو طریقہ بتایا گیا ہے اس طرح ہندی زبان کی ترقی اور ترویج میں مدد کرنا اپنا اور ہندوستان کے ہر شہری کا فرض سمجھتے ہیں۔

۱۹۵۱ء میں اتر پردیش کی قانون ساز جماعتوں نے دستور کے فقرہ ۳۴۵ کے تحت قانون بنا کر دیوناگری رسم الخط میں ہندی زبان کو ریاست کی تمام سرکاری اغراض میں استعمال کرنے کے لیے اختیار کر لیا لیکن اس فیصلہ میں جو فی نفسہ بے ضرر تھا اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا کہ اسی علاقہ میں اردو زبان اور اس کا رسم الخط بھی رائج ہے۔ ہم قانون ساز جماعتوں کے فیصلہ کو فرض شناسی کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ہم محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ حالات میں اردو کے متعلق اس فیصلہ میں فقرہ ۳۴۷ کے تحت صدر کے ہدایات نامہ کے ذریعہ سے اضافہ کرنے کی ضرورت ہے اسی غرض سے ہم نے جناب والا سے رجوع کرنے کی جرأت کی ہے۔

ایک ایسے بلند مقام صاحب علم و فضل کے روبرو جیسے کہ جناب ہیں، ہم اس بحث کو نہیں چھیڑنا چاہتے کہ آیا ہندی اور اردو دو مختلف زبانیں ہیں یا ایک ہی بنیادی زبان کے دو ادبی اسلوب ہیں۔ ہمارے مقصد کے لیے یہی کافی ہے کہ موجودہ حالات کے متعلق واقعیت پسند اور

حقیقی نقطۂ نظر اختیار کر کے دستور کی آٹھویں فہرست میں ہندی اور اردو دونوں کو ہندوستان کی زبانوں میں شمار کیا گیا ہے۔ ہماری گذارش یہ ہے کہ اردو زبان جس نے صدیوں کے دوران میں ایک ایسا اسلوب اور ادب پیدا کر لیا ہے جس پر کوئی قوم بھی فخر کر سکتی ہے آج اتر پردیش میں تمام مذہبوں اور فرقوں کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کی بولی ہے جو دعوے کرتے ہیں کہ وہ ان کی مادری اور ادبی زبان ہے۔ یہ سب لوگ باوجود دیکہ دیوناگری رسم الخط میں ہندی زبان کو سیکھنا، پڑھنا اور لکھنا ضروری سمجھتے ہیں پھر بھی اردو کو اسی کے رسم الخط میں لکھتے پڑھتے ہیں اور نہایت معقول وجوہ کی بنا پر چاہتے ہیں کہ یہ قومی وراثت محفوظ رہے۔ اس سلسلہ میں ہم حکومت ہند کے رزولیوشن مورخہ ۱۔ اگست ۱۹۴۹ء کی طرف جناب والا کی توجہ مبذول کرانے کی اجازت چاہتے ہیں جس میں بنیادی مدارس میں تعلیم کے متعلق حکومت کی پالیسی کا تعین کیا گیا ہے۔ اُس رزولیوشن کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

> "جونیر بنیادی منزل پر تعلیم اور امتحان کا ذریعہ بچے کی مادری زبان ہونا چاہئے جہاں علاقائی اور سرکاری زبان سے مادری زبان مختلف ہو وہاں مادری زبان میں تعلیم دینے کا یہ انتظام کرنا چاہئے کہ جب تمام مدرسہ میں اس زبان کے بولنے والے ۴۰ طلبہ سے کم یا ایک درجہ میں ۱۰ سے کم نہ ہوں تو ایک استاد ان کی تعلیم کے لیے مقرر کیا جائے۔ مادری زبان وہی مانی جائے گی جس کو طالب علم کے والدین یا سرپرست کہیں یہ اس کی مادری زبان ہے۔"

اس پالیسی کی اتر پردیش کے چیف منسٹر نے بھی ایک مراسلہ میں جو انھوں نے مسٹر زیڈ۔ ایم لاری کو جو اُس وقت لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن تھے بھیجا تھا تصدیق کی اور پھر اتر پردیش کے سکریٹری تعلیمات شری اے۔ این سپرو نے بھی اس پالیسی پر اپنے مراسلہ موسومہ میں ڈائرکٹر تعلیمات میں زور دیا تھا لیکن باوجود اس کے شری آر۔ ایس سنہا نے جو جبری تعلیم کے خاص آفیسر تھے میونسپل بورڈوں کے چیرمینوں کو حسب ذیل تحریر بھیجی:

> "مجھے یہ کہنے کی ہدایت ہوئی ہے کہ حکومت کا حکم یہ ہے کہ تمام ابتدائی مدرسوں میں ہندی کو لازمی مضمون ہونا چاہئے۔ اردو کی تعلیم پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اگر اردو کو پڑھانا چاہیں تو وہ ایک اختیاری مضمون ہو۔ لہٰذا تمام طلبہ پر بلا لحاظ ذات

اور قوم لازم ہوگا کہ وہ ہندی پڑھیں اور وہی نصاب کے دوسرے مضمونوں کے پڑھانے کا ذریعہ ہو۔"

حکومت ہند کی ہدایت اور ریاستی حکومت کے مقصد کی یہ ایک خلاف ورزی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو تمام میونسپل اسکولوں سے خارج ہوگئی۔ اسی زمانہ میں اُن اسکولوں میں بھی جو ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ماتحت تھے اردو کی تعلیم روک دی گئی۔ اور باوجود بار بار معروضے اور یادداشتیں پیش کرنے کے ریاستی حکومت اس بے انصافی کو رفع نہ کرسکی اس سب کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اُن بچوں کو جن کی مادری زبان اردو ہے بنیادی تعلیم بھی مادری زبان میں حاصل کرنے کی اجازت نہ رہی اور اس طرح اردو ریاست کے تمام بنیادی مدرسوں کے ابتدائی درجوں سے بھی خارج ہوگئی۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز یہ واقعہ ہے کہ بہت سے بچوں کی مادری زبان جو کل تک اُن بنیادی اسکولوں میں اردو لکھی ہوئی تھی بچوں کے سرپرستوں سے مشورہ کیے بغیر یکایک ہندی ہوگئی۔ جب یہ صورت حال انجمن ترقی اردو کے علم میں آئی تو اُس نے ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کی وہ اس معاملہ کی تحقیقات کرے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ جب انجمن کو وصول ہوگئی اور اسے اس بات کا یقین ہوگیا کہ لوگوں کی شکائتیں جائز ہیں۔ تب انجمن نے فیصلہ کیا کہ اُس کے اراکین کا ایک وفد ریاستی وزیر تعلیمات کی خدمت میں بھیجا جائے تاکہ وہ ان شکایات کو موصوف کے سامنے رکھے۔ چنانچہ اراکین کا ایک وفد بہ سرکردگی ڈاکٹر ذاکر حسین صدر انجمن ۲۲ مئی ۱۹۵۰ء کو ڈاکٹر سمپورنانند کی خدمت میں حاضر ہوا جو اس وقت اتر پردیش کے وزیر تعلیم تھے یہ وفد اپنے ساتھ صرف شہر لکھنؤ کے ۱ ہزار سے زیادہ سرپرستوں کی درخواستیں لے گیا جو چاہتے تھے کہ اردو زبان کے ذریعہ سے ان کے بچوں کی تعلیم ہو۔ اس وفد سے وزیر صاحب نے ہمدردانہ طریقہ پر ملاقات کی۔ اس کی شکایات کے جواز کو تسلیم کیا اور از راہِ مہربانی تسلیم کیا کہ محکمہ تعلیم کے خاص افسر شری سنہا نے جو گشتی جاری کی تھی وہ حکومت کی پالیسی کے مطابق نہ تھی۔ وفد کو اس کا یقین دلایا گیا کہ آئندہ سیشن کے آغاز کے ساتھ ہی یعنی جولائی ۱۹۵۱ء سے یہ خرابیاں رفع کردی جائیں گی لیکن یہ وعدہ کبھی وفا نہ ہوا۔ موجودہ وزیر تعلیم نے بھی ۱۴ جولائی ۱۹۵۲ء کو لیجسلیٹو کونسل میں اس وعدے کو دہرایا اور صاف فرمایا کہ ڈائرکٹر تعلیمات کو یہ ہدایات دیدی گئی ہیں کہ اگر کسی مدرسہ میں ۱۰ بچے ایسے ہیں جو اردو میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو وہاں اس کا انتظام کیا جائے۔ لیکن ان ہدایات پر بھی عمل

نہیں ہوا اور حالات اب بھی وہی ہیں جو پہلے تھے۔ ۷ اگست ۱۹۵۲ء کو امتحاناً ایک درخواست جس پر صاحب گنج اسکول کے جو لکھنؤ کے حلقہ دولت گنج میں ہے، طلبہ کے ۹۰ سرپرستوں کے دستخط تھے وزیر تعلیمات اور میونسپل بورڈ لکھنؤ کے سپرنٹنڈنٹ تعلیم کی خدمت میں پیش کی گئی۔ اس درخواست میں استدعا کی گئی کہ چونکہ اُن کے بچوں کی مادری زبان اُردو ہے اس لیے ان کو اسی زبان میں تعلیم دی جائے۔ اس درخواست کا کوئی جواب نہیں ملا اور نہ مطلوبہ انتظام کیا گیا۔

اس سلسلہ میں یہ بھی بتا دینا ہے کہ نارمل اسکولوں میں بھی طریقۂ تعلیم اس طرح بدل دیا گیا ہے کہ وہاں بھی اردو کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ پہلے تو ابتدائی مدارس کے استادوں کے لیے لازمی تھا کہ ہندی اور اُردو دونوں زبانیں جانتے ہوں مگر اب اردو کے استادوں کی تربیت ہی بند کر دی گئی۔ علاوہ بریں ہندی اور اردو کی نصابی کتابوں کی اشاعت میں ایک غیر منصفانہ امتیاز قائم کر دیا گیا ہے۔ محکمۂ تعلیم نے ہندی کی نصابی کتابوں کے لیے ٹنڈر طلب کیے اور ناشروں کو ہر کتاب کی ایک معینہ تعداد کے چھاپنے کی ہدایت کر دی۔ اس طرح ان کتابوں کی فروخت کا بھی گویا ذمہ لے لیا۔ برخلاف اس کے اتر پردیش کے ڈائرکٹر تعلیم نے ایک گشتی اس مضمون کی نکال دی ہے کہ ناشر اگر اردو کی نصابی کتابیں چھاپیں تو وہ نقصان اور فائدہ کے خود ذمہ دار ہوں گے اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب اردو کی نصابی کتابیں شاید ہی بازار میں مل سکیں۔

ان حالات میں ہمارے لیے کوئی دوسرا دستوری راستہ کھلا ہوا نہ تھا سوائے اس کے کہ ہم دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت جناب والا کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اس دفعہ کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

> "اگر ایسا مطالبہ کیا جائے اور پریسیڈنٹ کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ کسی ریاست کی آبادی کا ایک معقول حصہ چاہتا ہے کہ اس زبان کو استعمال کرے جو وہ بولتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ ریاست بھی اس کو تسلیم کرے تو انھیں یہ اختیار ہے کہ وہ یہ ہدایت کریں کہ ایسی زبان تمام ریاست میں اس کے کسی حصہ میں ایسے کاموں کے لیے جن کی وہ تصریح کر دیں سرکاری طور پر تسلیم کی جائے۔"

مندرجہ بالا دفعہ کی شرائط کو پورا کرنے کے لیے انجمن نے فیصلہ کیا کہ ایسے بالغوں کے دستخط جمع کرے جو یہ چاہتے ہیں کہ اردو زبان اتر پردیش میں تسلیم کی جائے۔ ۲۰ لاکھ پچاس ہزار سے زیادہ دستخط [illegible] کے خاندانوں میں نابالغوں کی تعداد کیا

ہے۔ ایسے نابالغوں کی تعداد بھی ۲ لاکھ سے زیادہ ہے۔

عام جلسوں، مظاہروں اور نعروں سے بہت احتیاط کے ساتھ پرہیز کیا گیا۔ اس طرح جو دستخط حاصل ہوئے ہیں ان کو ضلع وار اور قوم وار چھانٹ لیا گیا ہے اور جو دستخط مشتبہ سمجھے گئے ان کو بہت محتاط جانچ کے بعد خارج کر دیا گیا ہے۔ یہ کام ایک منظم طریقہ سے کم و بیش مردم شماری کی طرح کیا گیا ہے۔

ہمیں یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ اردو زبان اور اس کے ادب نے "ہندوستان کے مشترک کلچر" کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے اور وہ اب بھی اس کلچر کا ایک اہم عنصر ہے۔ اس نے اتر پردیش کی مشترکہ تہذیب، مشترکہ زندگی، اور مشترکہ سماجی روایات کی ترقی میں بھی خاص طور پر بہت قابل قدر حصہ لیا ہے۔

ہم یقین کرتے ہیں اور نہایت خلوص کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ اردو زبان اپنے سیر حاصل ذخیرہ الفاظ، اپنی حسین روزمرہ اور شاندار طرز بیان اور ہمہ گیر اور ترقی پسند ادب کے ذریعہ سے اب بھی دستور کی دفعہ ۳۵۱ کے مطابق یونین کی سرکاری زبان ہندی کے حسن میں اضافہ کرنے اور اُسے مالا مال کرنے اور اُس کی ترقی کی تکمیل میں جس کے متعلق دفعہ مذکور میں لکھا ہے کہ وہ اس طرح ترقی کرے کہ "ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے تمام عناصر کے لیے اظہارِ خیال کے ذریعہ کا کام دے" بہت اہم حصہ لے سکتی ہے۔

لہٰذا ہم اتر پردیش کے اردو بولنے والوں کی طرف سے، جو ریاست کی آبادی کا ایک قابلِ لحاظ حصہ ہے" جیسا کہ اس یادداشت کی تائید میں ۲۰ لاکھ سے زیادہ دستخطوں سے ظاہر ہوتا ہے، استدعا کرتے ہیں کہ جناب عالا مہربانی فرما کر دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت ہدایت جاری فرمائیں کہ اردو زبان بھی اتر پردیش میں ایک علاقائی زبان تسلیم کی جائے اور اس طریقہ سے سرکاری کاموں میں استعمال کی جائے کہ وہ حسب ذیل مقاصد کو پورا کر سکے:

(۱) ایسے بچوں کے لیے جن کی مادری زبان اردو ہے ابتدائی درجہ میں وہ ذریعہ تعلیم ہو اور جہاں کہیں اردو بولنے والے بچوں کی تعداد کافی ہو یعنی ۴۰ کسی مدرسہ میں ہوں یا ۱۰ کسی کلاس میں وہاں اردو کے ذریعہ سے تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے۔ ایسے مقامات پر جہاں اردو بولنے والی آبادی

زیادہ ہو ایسے اسکول قائم کیے جائیں جن میں ذریعہ تعلیم اردو ہو۔ اس کا فیصلہ بچہ کی مادری زبان کیا ہے اُس کے والدین یا سرپرستوں کے کہنے کے مطابق ہونا چاہیئے۔

(۲) ابتدائی درجوں میں اردو کے ذریعہ تعلیم دینے کی قابلیت رکھنے والے استادوں کو کافی تعداد میں تربیت دینے کے انتظامات کیے جائیں۔

(۳) ایسا انتظام کیا جائے کہ اردو زبان میں کافی نصابی کتابیں مہیا ہو سکیں۔

(۴) ایسے ثانوی مدارس کو جو اردو کے ذریعہ تعلیم دیتے ہوں ریاست تسلیم کرے اور دوسرے ثانوی مدارس کو امداد دینے کے جو قواعد ہوں اُن ہی کے مطابق ان مدارس کو بھی سرکاری امداد دی جائے۔

(۵) اتر پردیش میں کم ازکم ایک یونیورسٹی ایسی ہو جہاں اردو زبان کو بتدریج ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔

(۶) اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرنے والے اور اردو کے ذریعہ سے ادب اور سائنس کی اشاعت کرنے والے مشہور اداروں کو کافی مالی امداد ملنی چاہیئے۔

(۷) اردو کے ایسے اہل قلم اور اہل علم کی جو اپنی قابلیت کی وجہ سے ممتاز ہوں ریاستی حکومت کی طرف سے انعامات اور عطایا کے ذریعہ سے ہمت افزائی کی جائے۔

(۸) ہندوستانی اکیڈمی میں اردو کے اہلِ قلم کو کافی نمایندگی دی جائے۔

(۹) سرکاری اور سرکاری امداد پانے والے کتب خانوں کے لیے اردو کی کتابیں بھی مہیا کی جائیں۔

(۱۰) اردو میں لکھی ہوئی عرضیاں ریاست کی عدالتوں اور دفتروں میں قبول کی جائیں اور اُن پر توجہ کرنے اور اُن کا فیصلہ کرانے کی آسانیاں مہیا کی جائیں۔

(۱۱) گورنمنٹ کی شائع کردہ ضروری اطلاعات، قوانین اور مطبوعات اردو میں بھی شائع کی جائیں۔

آخر میں ہم جناب والا کی خدمت میں اس امر پر گہرے تشکر کے اظہار کی اجازت چاہتے ہیں کہ جناب نے ہم کو اپنے حضور میں ایک ایسے مسئلہ کو پیش کرنے کا موقع دیا جو ہندوستانی آبادی کے ایک بڑے حصہ کے دلوں کو بہت عزیز ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ جناب والا ان احساسات اور حقائق پر از راہ کرم توجہ فرمائیں گے جو اس یادداشت میں پیش کیے گئے ہیں۔ جناب والا کی طرف سے ایک لطف آمیز اشارہ بھی اس عظیم الشان سرزمین کے مختلف فرقوں کے درمیان اتحاد کو مضبوط کرنے میں بڑا کام کرے گا اور ایک دلشاد اور متحد ملک کے نصب العین کے حصول میں معاون ہوگا۔

صدر جمہوریہ ہند سے وفد کی ملاقات اور گفتگو ۵ منٹ تک جاری رہی۔ انھوں نے گفتگو سن کر فرمایا کہ

"میں یادداشت پڑھ چکا ہوں۔ یہ مطالبات ایسے ہیں، جن کا اصول گورنمنٹ پہلے ہی تسلیم کر چکی ہے لیکن اس پر عمل کرنے کا سوال قابل توجہ ہے اور میں مرکزی حکومت اور نیز ریاستی حکومت سے مشورہ کرنے کے بعد طے کروں گا کہ جن اصول کا نفاذ نہیں ہو سکا ان کا نفاذ کس طرح کیا جائے۔"

(ہماری زبان ۱۵ فروری ۱۹۵۴ء)

صدر جمہوریہ ہند کو یادداشت پیش کرنے اور ان کے اس بیان سے ہندی مخالف گھبرا گئے انھیں ڈر تھا کہ کہیں دستور ہند کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت اردو زبان کو اتر پردیش کی علاقائی زبان نہ بنا دیا جائے۔ اس لیے اردو مخالف تحریک تیز ہوگئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد جو آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے انھوں نے ... اردو کی مخالفت کا پارلیمنٹ میں جواب دیا۔ - - - - - - - - - اس زمانے کے اردو مخالف ٹنڈن جی اور سیٹھ گووند داس کو اس کا بڑا صدمہ ہوا کہ وزارت تعلیم نے شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کو گرانٹیں کیوں دی ہیں۔ مولانا آزاد کی یہ زبردست اور تاریخی تقریر قاضی عبدالغفار مرحوم نے نیم اپریل ۱۹۵۴ء کے شمارے میں شائع کی۔ یہ تقریر میمورنڈم پیش کرنے کے بعد اور اردو کے تینوں اداروں کو سرکاری گرانٹ دینے کے بعد پارلیمنٹ میں کی تھی۔ اگلے صفحہ پر مولانا آزاد کی پوری تقریر پیش کی جاتی ہے۔

مولانا آزاد کی پارلیمنٹ میں زبردست تقریر

دوشنبہ کو پارلیمنٹ میں معترضین اور نکتہ چینوں کو جواب دیتے ہوئے وزیر تعلیم مولانا آزاد نے بہت زبردست اور موثر الفاظ میں اردو زبان کے مخالفوں کی نقاب کشائی کی۔ تقریر کے دوران میں ایوان کی اکثریت نے بار بار مولانا کی ایک گھنٹہ کی تقریر پر تائیدی تالیاں بجائیں۔ مخالف جماعت کے لوگوں نے تقریر میں مداخلت کرنے کی بار بار کوشش کی۔ مگر ایوان نے اور صدر نے سختی کے ساتھ ان کو روکا۔

مولانا نے اپنی تقریر کے شروع ہی میں اس امر کو پوری طرح واضح کر دیا کہ "وزارت تعلیمات اپنا فرض سمجھتی ہے کہ وہ ہندی زبان کی پوری ترقی کی تدابیر اختیار کرے تاکہ یہ زبان اپنی جائز جگہ حاصل کرے۔ اور اس کام میں وزارت کسی تاخیر کو گوارا نہ کرے گی"۔

ایوان نے مولانا کے ان الفاظ کا پورے جوش کے ساتھ خیر مقدم کیا لیکن مسٹر ٹنڈن اور سیٹھ گووند داس نے بار بار مداخلت کرنے کی کوشش کی۔ ہر دفعہ جب وہ ایسا کرتے تھے تو ایوان سے "بیٹھ جاؤ" "بیٹھ جاؤ" کی آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ بہار کے ایک کانگریسی رکن نے کہا کہ جب ٹنڈن جی اور سیٹھ گووند داس تقریر کر رہے تھے تو ہم نے نہایت سکون سے ان کی تقریروں کو سنا تھا۔ اب یہ ممبران کیوں اتنا شور مچار ہے ہیں۔

ڈپٹی اسپیکر نے تنبیہ کی کہ مولانا کی تقریر میں رکاوٹ پیدا نہ کی جائے۔ اس کے بعد مولانا ایک گھنٹہ تک تقریر کرتے رہے۔

مولانا نے فرمایا کہ ۱۵ سال کی میعاد ختم ہوتے ہی ہندی انگریزی کی جگہ لے لے گی۔ اس دوران میں برابر یہ کوشش کی جائے گی کہ ہندی انگریزی کی جگہ لینے کے قابل ہو جائے۔

انھوں نے فرمایا کہ وزارت تعلیمات نے اس کام کے لیے ایک مکمل پروگرام بنالیا

ہے۔ معترضین کے اعتراضوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ

ٹنڈن جی کا مقصد صرف حملہ کرنا

"مجھے بہت خوشی ہوتی اگر مسٹر ٹنڈن نے وزارت کے پروگرام کو پیش نظر رکھ کر اس کے متعلق اپنی تجویزیں پیش کی ہوتیں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ جس طرح سے انھوں نے تقریر کی اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مقصد کوئی تعمیری تجویز پیش کرنا نہ تھا بلکہ اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ وزارت تعلیم پر حملے کریں۔ انھوں نے پہلے سے اپنے دل میں حملہ کرنے کا ایک نقشہ بنا لیا تھا اور اسی نقطہ نظر سے وہ صحیح یا غلط مواد جمع کر کے لائے تھے۔ مسٹر ٹنڈن نے اس طرح اپنے بیان کی ایک دلیل پیش کی ہے کہ چونکہ دستور ساز اسمبلی میں وزیر تعلیم نے ہندی کے بجائے "ہندوستانی" کے سرکاری زبان بنانے کو ترجیح دی تھی۔ اس لیے وہ اب بھی جو کچھ کرتے ہیں اس طرح کرتے ہیں کہ "ہندوستانی" کا پرچار ہو نہ کہ ہندی کا۔"

اس موقعہ پر ٹنڈن جی بہت بگڑ کر اٹھے اور انھوں نے کہا کہ میں نے تو جو کچھ کہا اس میں توازن قائم رکھا۔ مولانا بھی ایسا ہی کریں اور غصہ میں تقریر نہ کریں۔ وزیر تعلیم نے جواب دیا کہ "آپ میرے غصہ کی ذرا پروا نہ کیجیے۔"

بالکل غلط

مولانا نے فرمایا کہ ٹنڈن جی کا یہ بیان کہ وزارت "ہندوستانی" کا پرچار کر رہی ہے نہ کہ ہندی کا بالکل غلط ہے۔ آخر ٹنڈن جی کی پوری تقریر کا حاصل کیا تھا۔ کہاں تک ان کا نقطہ نظر ہندی اور ہندوستانی کے مسئلہ پر دیانتدارانہ تھا؟ ورردھا کی ہندوستانی پرچارنی سبھا کا نام آگے لایا گیا ہے اور یہ الزام لگایا گیا ہے کہ حکومت عطیات دے کر اس کی مدد کر رہی ہے۔ سبھا کے نام میں چونکہ لفظ "ہندوستانی" شامل ہے اس لیے صاف ظاہر ہے کہ ٹنڈن جی نے اس کا ذکر یہ دکھانے کے لیے کیا ہے کہ "ہندوستانی" کے مدد کرنے کے لیے اس سبھا کو گرانٹ دی جاتی ہے۔

پُرفریب تخیل

میں ایوان کو بتانا چاہتا ہوں کہ ٹنڈن جی کا یہ انداز نظر ایک "پُرفریب تخیل" کا پردہ فاش کرتا ہے۔ جس کا مقصد ایوان

کے ممبروں کو دھوکہ دینا اور ان کے ذہنوں میں تعصب پیدا کرنا ہے۔

مسٹر ٹنڈن نے احتجاج کیا کہ "پُر فریب تخیل" کی اصطلاح نامناسب ہے اس کو استعمال نہ کرنا چاہیے۔

مولانا نے فرمایا کہ جن اداروں کو گرانٹ دی جارہی ہے ان کا نام لینے میں ٹنڈن جی کا منشا سوائے اس کے کچھ نہ تھا۔

چند ممبروں نے سوال کیا کہ "پُر فریب تخیل" کے کیا معنی ہیں۔ ڈپٹی اسپیکر نے کہا کہ ممبروں کو مولانا کی تقریر میں مداخلت نہ کرنی چاہیے۔

"پُر فریب"

مولانا نے فرمایا کہ یہ لفظ غیر پارلیمانی نہیں ہے ایوان کے مباحث میں یہ لفظ اکثر استعمال ہوتا ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی ممبر کسی نقطۂ نظر سے سیدھے اور صاف طریقے کے بجائے گھما پھرا کر "پُر فریب" طریقہ سے پیش کر رہا ہے مسٹر الگو رائے شاستری نے کہا کہ وزیر تعلیم نے جو "پُر فریب" کا لفظ استعمال کیا ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ گویا ٹنڈن جی کا نقطۂ نظر دھوکہ بازی پر مبنی ہے۔ ایک اور صاحب نے اعتراض کیا کہ مولانا کو یہ نہ کہنا چاہیے کہ مسٹر ٹنڈن کا طرز عمل دیانت دارانہ نہیں۔

ڈپٹی اسپیکر نے کہا کہ مولانا نے جو لفظ استعمال کیا اس میں کوئی بُری بات ٹنڈن جی سے منسوب نہیں کی گئی اور اگر ایسا سمجھا جاتا ہے تو مولانا اس کو واپس لیتے ہیں۔

ہندوستانی پرچارنی سبھا

مولانا نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ وار دھا کی ہندوستانی پرچارنی سبھا کو اس وقت مہاتما گاندھی نے قائم کیا تھا جب وہ مسٹر ٹنڈن کے ہندی ساہتیہ سمیلن سے الگ ہو گئے تھے ڈاکٹر راجندر پرشاد اس سبھا کے صدر بنائے گئے تھے اور اب بھی صدر ہیں انھوں نے کہا کہ اس سبھا کو مہاتما گاندھی کی یاد تازہ رکھنے کے لیے زندہ رہنا چاہیے اسی وجہ سے حکومت نے سبھا کی امداد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

مولانا نے فرمایا کہ عملاً یہ سبھا ہندی ہی کے لیے کام کر رہی ہے۔ لیکن میں ایوان کو توجہ دلاتا ہوں کہ کس طرح ٹنڈن جی نے "ہندوستانی" کے لفظ پر زور دے کر بتانے کی

کوشش کی ہے کہ وزارت تعلیم کا رجحان ہندوستانی کی طرف ہے نہ کہ ہندی کی طرف۔

شبلی اکاڈمی

مولانا نے فرمایا کہ اس اکاڈمی کو بھی ۶۰ ہزار روپے دینے پر اعتراض کیا گیا ہے۔ اکیڈمی سے مہاتما گاندھی کا بھی تعلق تھا۔ یہ ادارہ وہ لوگ چلا رہے ہیں جو ہمیشہ کانگریس کے ساتھ رہے ہیں اور جنھوں نے ہماری آزادی کی جنگ میں بڑا حصہ لیا ہے۔ ۸ مہینے ہوئے جب پنڈت نہرو نے وزارت فینانس اور وزارت تعلیم کو لکھا تھا کہ اس ادارہ کی کچھ مدد کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس کو یکمشت ۶۰ ہزار روپیہ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس فیصلہ میں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا تھا کہ اگر یہ ادارہ بند ہو گیا تو پاکستان میں کہا جائے گا کہ ہندوستان کسی ایسے ادارے کو زندہ رکھنا نہیں چاہتا۔ ایوان کو سوچنا چاہیے کہ وزارت نے ایک ایسے ادارے کی امداد کر کے کونسا جرم کیا ہے۔

مسٹر ٹنڈن کے لیے اس بات کا سمجھنا بہت دشوار ہو گیا اور وہ شکایت کرنے لگے کہ وزارت تعلیم اردو کے اداروں کی مدد کر رہی ہے۔ کیا اب ہمارے دل اتنے تنگ ہو گئے ہیں کہ ہم ۶۰ ہزار روپیہ کی گرانٹ بھی ایک ایسے ادارے کے لیے برداشت نہیں کر سکتے جو اچھا کام کر رہا ہے؟

اُردو کسی مذہب کی زبان نہیں

اردو کسی مذہب کی زبان نہیں وہ مسلمانوں ہندوؤں عیسائیوں سب کی زبان ہے۔ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ وہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے تو ہندوستان میں چار کروڑ سے زیادہ مسلمان بستے ہیں۔ آواز اٹھائی جاتی ہے کہ وزارت اردو زبان کی مدد کر کے "اسلامی کلچر" کی تائید کر رہی ہے۔ کونسا اسلامی کلچر ہے جس کا تعلق اردو سے ہے؟ اگر تاریخ کی کوئی کتاب اردو میں لکھی جاتی ہے تو کیا یہ "اسلامی کلچر" کا پرچار ہے؟

علاقائی زبانوں سے بیر

اس قسم کا رجحان ہندی سے محبت ظاہر نہیں کرتا بلکہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ بعض لوگ علاقائی زبانوں کی ترقی کے مخالف ہیں۔ میں ہندی کے پریمیوں سے کہوں گا کہ اپنا سر اونچا رکھو لیکن دوسروں

کی ترقی کو اس خواہش کے ساتھ روک کر ہٹانے کی کوشش نہ کرو کہ وہ تمہارے سامنے بالشتیے نظر آئیں۔

تنگ دلی

شمالی ہندوستان میں کوئی بھی ہندی کا مخالف نہیں لیکن ہندی کی ترقی میں خاص رکاوٹ نام نہاد ہندی پریمیوں کی تنگ دلی ہے۔ وزیر تعلیم نے بتایا کہ گذشتہ سال جب تامل زبان کے لیے ایک گرانٹ دینے کی ایک تجویز زیر غور تھی۔ تب بھی بہت شور مچایا گیا تھا۔ اس وقت بھی یہی جذبہ تھا کہ ہندی کے سوا کیوں کسی زبان کی امداد نہ کی جائے۔ یہی جذبہ ہندی کی ترقی کو روک رہا ہے۔

میٹھی باتیں

مولانا کی آواز شدید احساس سے کانپ رہی تھی جب انھوں نے کہا کہ "میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ میں میٹھی میٹھی باتوں کا قائل نہیں جن سے دوسروں کو خوش کروں یا گول گول باتیں کروں۔ میرے دل میں اب کوئی خواہش باقی نہیں۔ میں نے اپنی زندگی کا دستور العمل ۴۶ سال پہلے بنایا تھا اور میری زندگی کا مقصد ملک کی آزادی حاصل کرنا تھا اور سنہ ۱۹۰۶ء میں میری عمر ۱۸ یا ۱۹ سال کی تھی جب بنگال کی قومی تحریک میں شریک ہوا تھا اس دن سے آج تک تمام دنیا کے سامنے میری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب رہی ہے۔ میرے دل میں اب کوئی تمنا نہیں ہے میری زندگی کا بہترین حصہ گزر چکا کچھ باقی ہے اور میں نہیں جانتا کہ کب وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ پھر کوئی شخص کیا چاہے جبکہ اس کی کوئی خواہش باقی ہی نہ رہی ہو؟

"بے پناہ"

میں اب بے پناہ ہو گیا ہوں۔ اب "بے پناہ" کا مطلب سمجھے (تھوڑے وقفہ کے بعد) نہیں آپ نہیں سمجھے اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کا ایسا وجود جس کو کوئی تلوار نہیں کاٹ سکتی ـــــ ایسا وجود جس کے اندر کوئی خواہش اور اس خواہش کی لائی ہوئی کوئی کمزوری پوشیدہ نہیں۔

ملک کی تقسیم

اس کے بعد مولانا آزاد نے مسلم لیگ کے دو قومی نظریہ اور ہندوستان پر اس نظریہ کے مضر اثر کا ذکر کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ مسلم لیگ ہی تقسیم کی ذمہ دار ہے۔ مسٹر ٹنڈن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ "ایسے

ہی خیالات والے لوگ، تھے جنھوں نے تقسیم کرائی۔ یہ اس لیے کہ جو دل تنگ ہوتا ہے اس میں کسی دوسری چیز کے لیے جگہ نہیں ہوتی۔ قدرتاً جو لوگ اہل ملک کے درمیان تفریق پیدا کرنے پر تلے ہوئے تھے انھوں نے تنگ دلی سے فائدہ اٹھایا۔ ایوان کو معلوم ہے کہ میں نے ملک کے اتحاد پر اس حملہ کا کس طرح مقابلہ کیا تھا۔ میں ایوان کو وہ انقلاب بھی یاد دلاتا ہوں جو میں نے لاکھوں مسلمانوں میں پیدا کیا۔

تنگ دلی نہ دبا سکا

لیکن میں اس تنگ دلی کو خواہ ہندوؤں کی ہو یا مسلمانوں کی نہ روک سکا لیکن یہ "ہندو تفکر" تنگ نظری کی ایک مثال ہے جو ہندوستان کو نقصان پہنچائے گا۔ اگر اس کو ذرا بھی بڑھنے کا موقع دیا گیا۔

وزیر تعلیم نے فرمایا کہ جب مسٹر ٹنڈن حکومت کی امداد کے متعلق شبلی اکیڈمی اور ہندوستانی پرچار سبھا کا ذکر کرتے ہیں تو وہ اس بات کا ذکر نہیں کرتے کہ ہندی ساہتیہ سمیلن کو گذشتہ پانچ سال سے چالیس ہزار روپیہ سالانہ امداد مل رہی ہے۔ اور یہ بھی نہیں بتلاتے کہ ناگری پرچارنی سبھا کو بھی گرانٹ دی گئی ہے۔ انھوں نے اس بات کا ذکر اس وقت کیا جب انھیں دو دفعہ یاد دلایا گیا۔

سیٹھ گووند داس کو جواب دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ سیٹھ صاحب نے کہا کہ وہ انگریزی اور اردو کو میکالے کا پیدا کیا ہوا بچہ سمجھتے ہیں۔ (شرم شرم کے نعرے) سیٹھ صاحب غصہ میں کچھ کہنے کھڑے ہوئے لیکن ایوان کے شور و غل میں کسی نے نہیں سنا۔ مولانا نے فرمایا کہ سیٹھ صاحب یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وزارت نے سائنس کی غیر ملکی اصطلاحات کو اپنانے کا فیصلہ کیوں کیا۔ لیکن یہ فیصلہ وزارت کا نہیں بلکہ یونیورسٹی کمیشن کا ہے" اب میں سیٹھ صاحب سے پوچھتا ہوں کہ اصطلاحات کے بارے میں سائنس کے اور تعلیم کے ماہرین کی رائے مانوں یا سیٹھ صاحب کی جنھوں نے اپنی عمر میں چند منٹ بھی سائنس کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ تقریر کے خاتمہ پر ایوان نے زور زور سے تالیاں بجا کر مولانا کو خراج تحسین ادا کیا۔" (ہماری زبان یکم اپریل ۱۹۵۴ء)

اس مختصر سے عرصے میں انجمن نے علمی اور ادبی کتابیں بھی شائع کیں۔ قاضی صاحب کے

عہد کا سب سے اہم علمی کارنامہ اردو ہندی لغت کی تدوین ہے جسے انھوں نے احمق پھپھوندوی سے مرتب کرایا تھا۔ مسلسل پانچ سال کی عرق ریزی محنت اور کثیر رقم خرچ کر کے انجمن نے دس ہزار الفاظ کی ایک اردو ہندی ڈکشنری تیار کرائی۔ اردو کے لفظوں کا تلفظ رومن رسم الخط میں بھی دیا گیا ہے تاکہ لفظوں کے صحیح تلفظ سے ہندی اور اردو دونوں زبانیں جاننے والے واقف ہوسکیں۔ یہ ڈکشنری محمد مصطفیٰ خاں مداح کی مرتب کردہ ہے۔ مداح صاحب ہندی اور سنسکرت کے عالم اور اردو کے ممتاز شاعر تھے۔ انجمن میں ان کا تقرر اسی کام کے لیے قاضی عبدالغفار مرحوم نے دو سو روپے ماہوار پر کیا تھا۔ مگر ڈکشنری کے سرورق پر مداح صاحب کا نام نہیں ہے۔

میری ملازمت کا سلسلہ قاضی صاحب ہی کے زمانے میں شروع ہوا تھا۔ مداح صاحب میرے کمرے ہی میں بیٹھتے تھے۔ بڑے فراخ دل اور دلآویز شخصیت کے مالک تھے۔ ڈکشنری کی تیاری کے سلسلے میں ان کے لیے ہر طرح کی آسانیاں پہنچائیں۔ رہنے کے لیے آفتاب منزل کے ایک گوشے میں انتظام کرایا۔ قاضی صاحب بھی آفتاب منزل کے دوسرے حصے میں رہتے تھے۔

انجمن ترقی اردو ہند کی از سر نو شیرازہ بندی کی طرف توجہ دینے کے بعد انجمن کے علمی کاموں کی طرف قاضی صاحب متوجہ ہوئے سب سے پہلی کتاب آصف علی کی "پرچھائیں" نہایت عمدہ کاغذ پر ٹائپ میں چھپوائی۔ یہ کتاب بمبئی کے کیو پریس میں طبع ہوئی تھی۔ مہاتما گاندھی نے راشٹر بھاشا کے سوال پر جو تقریریں کی تھیں وہ تقسیم ہند سے پہلے مختلف اخباروں میں چھپی تھیں ان سب کو قاضی عبدالغفار مرحوم نے جمع کر کے مرتب کیا۔ تقسیم ہند کے بعد جب گاندھی جی کے خیالات نظر انداز کیے جانے لگے تو قاضی صاحب نے ان کی تقریروں کی اشاعت کو شدت سے محسوس کیا اور اسے "مشترکہ زبان" کے نام سے انجمن سے شائع کیا۔ گاندھی جی کے عقائد اور نظریات اسلام اور ہندو دھرم کے متعلق ان کی تحریروں کو چاہے وہ جس حالت میں تھیں" ان سب کو مرتب کر کے قاضی صاحب نے "مذہب اور دھرم" کے نام سے انجمن سے شائع کیا۔ ان دونوں کتابوں پر قاضی صاحب نے اپنا نام نہیں دیا۔ یہ ۹۶ صفحات کی نہایت قیمتی اور جذبۂ عمل پیدا کرنے والی کتاب کو مرتب کر کے قاضی صاحب نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے بڑا کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ صالحہ عابد حسین کی "یادگار حالی"، قاضی عبدالغفار کی "حیات اجمل"، پنڈت کشن پرشاد کول کے مضامین کا مجموعہ "ادبی اور قومی تذکرے"، پروفیسر ابو محمد سالم کی

"کچھ زر کی بابت" ظفر حسین خاں کی "انواع فلسفہ" ڈاکٹر جعفر حسن کی "اطلاقی سماجیات" مبارز الدین رفعت کی "اسلامی فن تعمیر اور" ایک مشرقی کتب خانہ" مولوی نور الرحمٰن کی "حیات سرسید" پروفیسر ولی الرحمٰن کی "نفسیات افواہ" پروفیسر مختار الدین احمد کی "احوال غالب اور "نقدِ غالب" کی منظوری قاضی صاحب کے زمانے میں ہوگئی تھی۔ مگر یہ سرور صاحب کے عہد میں شائع ہوئیں۔ سردار جعفری کی ترقی پسند ادب نجم الدین شکیب کی "کاروانِ معیشت" مولوی ابرار حسین فاروقی کی "مرقع افغان" ڈاکٹر راجندر پرشاد کی کتاب "باپو کے قدموں میں" اس کا اردو ترجمہ ابرار حسین فاروقی مرحوم نے کیا تھا مگر مترجم کی حیثیت سے کتاب پر نام نہیں دیا گیا۔ کتاب انجمن نے ٹائپ میں شائع کی تھی اردو کے ممتاز شاعروں کے انتخابات کی اشاعت کا سلسلہ بھی قاضی صاحب نے شروع کیا تھا۔ سکندر علی وجد، مخدوم محی الدین اور مجروح سلطان پوری کے انتخابات ٹائپ میں پہلی بار انجمن نے شائع کیے۔ مجروح کے انتخاب کا نام غزل رکھا تھا اور اس پر قاضی صاحب نے پیش لفظ بھی لکھا تھا جس کی ابتدا مجروح کے اس شعر سے کی تھی اور یہ شعر ان کو بہت پسند تھا اکثر محفلوں میں بھی اس شعر کو پڑھتے تھے!

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اس طرح تیس کے قریب علمی، ادبی اور تنقیدی کتابیں اپنے زمانے میں انجمن سے شائع کیں اور اسی ۶ سال کے عرصے میں اردو کے مسایل بھی حل کرانے کی کوششیں جاری رکھیں اور اردو تحریک کے مسئلے کو حل کرنے کا نیا موڑ بھی انھوں نے ہی دیا۔ اس مختصر سے عرصے میں قاضی صاحب مسلسل بیمار رہے مگر انجمن کے کاموں کی طرف سے بے خبر نہیں رہے۔ حکومت ہند اور اردو مخالف حضرات سے بھی ٹکر لیتے رہے اور اردو کی حمایت آخر دم تک کرتے رہے۔ ۱۷ جنوری ۱۹۵۶ء کو پونے تین بجے سہ پہر میں مجھے ایک خط لکھوا رہے تھے کہ اچانک دل کا شدید دورہ پڑا اور ان کی روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔

"پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ"

آخر میں یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے ادب سے لگاؤ قاضی عبد الغفار مرحوم ہی کے زمانے میں پیدا ہوا۔ میں ان کی تحریروں کا مطالعہ غور اور پابندی سے کرتا۔ ان کے خطوط اور مضامین جمع کرنے کا شوق ان ہی سے حاصل کیا مگر باوجود احتیاط کے یہ سب ضائع ہوگئے۔

ابوالفیض سحر

قاضی عبدالغفار اور ہماری زبان کے اداریے

اردو ادب کی تاریخ میں صحافت کی باقاعدہ ابتدا، اور اس کے عہد و ارتقاء کی تاریخی رفتار معاصر رویّوں اور رجحانات کا جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے اور اس کے تواتر و تسلسل کی ایک واضح تصویر بھی پیش کی جا سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اردو صحافت میں اداریہ نگاری کے ابتدائی نقوش کا سراغ لگایا جا سکے۔ مگر اس کے خد و خال کی صورت پذیری اور پھر اس کی قامت طرازی، بالیدگی اور فروغِ حسن میں جن تشکیلی عناصر اور ترکیبی و تخلیقی اجزا کا ذمہ دارانہ کردار رہا ہے، ان کی ماہیت ان کے مزاج اور ان کے فکری و فنی سیاق و سباق کا صحیح اور مکمل تجزیہ کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے محض طویل عرصے کے گذر جانے کے وجہ سے چھائی ہوئی گہری ملگجی دھند کی بنا پر نہیں بلکہ خود اس کی مبہم شروعات پھر وسعتِ سیاق اور اسلوب کی رنگا رنگی کے سبب الجھے ہوئے تانے بانے کی باطنی پیچیدگی کے باعث۔

اداریہ نگاری، کالم نگاری ہی کی طرح اردو صحافت کی بھی ایک توانا اور جاندار روایت ہے مگر یہ بعض صورتوں میں بہت مقبول، پسندیدہ اور نہایت موثر محسوس ہوتی ہے تو بیشتر مثالوں میں محض ایک فرضِ کفایہ کی حیثیت رکھتی ہے یا خانہ پری کی نوعیت۔ بہر حال اس بات کی متعلق پر مبنی تفسیر اور سچی تفصیل بھی شاید آسان نہیں کہ اردو میں اداریہ نگاری کا تصور کب اور کیسے آیا اور یہ روایت، تجربے اور تشکیل کے کن مقامات و مدارج سے گذر کر آج کے عہد کے معیار سے روشناس ہو سکی ہے ظاہر ہے اس میدان میں ہی اکتساب نور اور اثر پذیری کا سرچشمہ یقیناً کوئی ایک نہیں،

جب ہم قاضی عبدالغفار کے "ہماری زبان" کے اداریوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ قاضی صاحب نے سکریٹری کی حیثیت سے بھی اپنے فرض منصبی کا پورا پورا حق ادا کیا ہے

اور بہ حسن وخوبی ادا کیا ہے۔ غلط نہ ہوگا اگر یہ کہوں کہ اردو صحافت میں بہت زور دار ضرورت سے زیادہ بیبا کانہ اداریہ نگاری کی بھی روایت ملی ہے مگر قاضی صاحب نے ایک پسندیدہ معیار اور معقولیت مقصدیت اور معروضیت پر مبنی مثال قائم کی ہے جسے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

اودھ پنچ کے اداریئے اپنے عہد کے پسندیدہ اداریوں میں سے تھے۔ زمیندار میں مولانا ظفر علی خاں نے دلگداز میں عبدالحلیم شرر نے ہمدرد میں مولانا محمد علی جوہر نے اور تہذیب الاخلاق میں سرسید احمد خاں نے ایسے اداریے لکھے کہ ان کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ نگار میں نیاز فتح پوری، شاعر میں اعجاز صدیقی نے بھی اچھے اداریے لکھے معارف اور برہان جیسے جرائد کے اداریے بھی اس سلسلہ میں قابل ذکر ہیں خاص کر مولانا سلیمان ندوی اور مولانا ابوالسلام آزاد کے اداریوں نے جو حیات افروز کرشمے دکھائے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ہماری زبان کے قاضی عبدالغفار ساتھ ہی صدق جدید کے مولانا عبدالماجد دریابادی اور اسی طرح الجمعیۃ کے مولانا فارقلیط، ان دردمند دانشور اور صاحب نظر و بصیرت ذی علم اہل قلم کے قافلے میں شامل ہیں جنھوں نے حقیقی معنوں میں خدمت لوح و قلم کو دل و جان اور عقیدے اور ایمان سے اپنی زندگی کا نصب العین اور مقصد حیات بنالیا تھا۔ انہیں مدیران نے نہایت مدیرانہ انداز میں اداریہ نگاری کی روایت کو بھی اپنے خون جگر سے سینچ کر برگزیدگی کے ساتھ ساتھ ایک پر وقار فن اور ایک اثر آفریں روایت کا درجہ عطا کیا اور اردو صحافت کے ماتھے پر نئے چاند ستارے سجا دئے جن میں آئین جواں مردی کے جواہر حق گوئی اور بیباکی کے انداز قلندرانہ بھی اپنی جولانیوں کے تیور اور بصیرتوں کے چراغوں کے ساتھ ہمیشہ تابندہ اور ضوفشاں رہیں گے۔

چلتے چلتے یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اداریہ نگاری اب دیگر زبانوں کی طرح اردو میں بھی ایک مستقل اور کالم بالذات فن اور ایک صنف کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ تاہم یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ جس طرح ہر نظم ہر غزل یا ہر ناول یا ہر افسانے کو فن کا درجہ نہیں دیا جاسکتا اسی طرح ایڈیٹر کی نگارشات کو خواہ وہ حقیقی مدیر ہو کہ غیر حقیقی، مثالی یا معیاری اداریہ نگاری کے نمونے قرار نہیں دیا جاسکتا۔ پرانی مثالیں اپنی جگہ ہیں ہی، ادھر حال ہی میں انگریزی میں میشنل ہیرالڈ کے مشہور ایڈیٹر مسٹر ڈی۔ کے راما راؤ کے ایڈیٹوریلس کے مجموعے

اور پھر وزیر آغا کے اداریوں کے مجموعے My Pen my Sword پہلا ورق کی اشاعت کے بعد اداریہ نگاری کی مسلّمہ حیثیت کو مزید تقویت ملی ہے۔

آیئے اداریہ نگاری کے اس پس منظر میں قاضی عبدالغفار اور ہماری زبان کے اداریوں پر نظر ڈالیں۔

برصغیر کی تقسیم ہماری تاریخ کا ایک ایسا زبردست المیہ ہے جسے ہم قیامت صغرا سے ہی تعبیر کر سکتے ہیں۔ جب زندگی کے کم و بیش سبھی شعبوں میں ہلاکت خیزیوں کا دور تھا تو پھر انجمن ترقی اردو کیسے محفوظ رہ سکتی تھی چنانچہ اس کا بھی وہی حشر ہوا جس کی ان دنوں توقع تھی۔ ملک کی تقسیم اور پھر بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ہجرت جیسے جان لیوا حادثات کے بعد انجمن کو پھر سے آراستہ کرنا اس میں نئی جان ڈالنا اور نئی روح پھونکنا کوئی آسان کام نہ تھا اور نہ یہ کسی کم سواد کے بس کی بات تھی۔ درحقیقت یہ کام گویا سیماب نفسی کے صفات اور مجاہد کے حوصلے، استقامت، استقلال اور زبردست ایثار و قربانی کا طلب گار تھا۔ ایسے حالات میں مولانا ابوالکلام آزاد کی مدد سے، انجمن کا دفتر ۱۹۴۹ء کو علی گڑھ منتقل ہوا اور ۱۹۵۰ء سے قاضی عبدالغفار اس کے سکریٹری اور ہماری زبان کے ایڈیٹر منتخب ہوئے یہ جہاں ایک اعلیٰ اعزاز تھا وہیں ایک کڑی آزمائش اور سخت امتحان بھی تھا مگر قاضی عبدالغفار نے اپنی مقدس دیوانگی متانت، سنجیدگی، دردمندی اردو اور اردو تحریک اور اردو تہذیب سے والہانہ محبت و وابستگی اور مثالی خلوص و ایثار سے کام لیتے ہوئے، اپنی انتظامی اور علمی و ادبی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انجمن ترقی اردو کو از سر نو منظم کیا اور اردو تحریک کی انتہائی نامساعد حالات میں بھی بڑی ہوش مندی سے قیادت کی اور ملک گیر پیمانے پر عام کیا عزم و عمل کی استقامت کے ساتھ اردو کے مقدمے کو اونچی سے اونچی سطح پر بھی پورے اعتماد اور انہماک اور بیباکی سے پیش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ہندوستان کی جمہوری زندگی کی بے مثل دستخطی مہم اور ۲۲ لاکھ دستخطوں پر مشتمل عظیم عرضداشت جو تاریخ انگلستان کے Great Magna Charta سے کسی طرح کم نہ تھی اور جو ۱۵ فروری ۱۹۵۴ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین کی قیادت میں اس وقت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمت میں پیش کی گئی تھی قاضی عبدالغفار ہی کے تدبر کا کارنامہ تھی۔ اس عظیم

جد وجہد میں ان کے اداریوں نے بھی بڑا موثر رول ادا کیا جیسا کہ کہا جاتا ہے اخباروں میں خاص کر کسی تحریک سے وابستہ جریدوں کے اداریے ہی سب سے زیادہ اہم ہوتے ہیں دیگر شمولات تو بعض اوقات زیب داستان کی باتوں کا درجہ رکھتے ہیں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۶ء تک ہماری زبان کی ادارت قاضی عبدالغفار نے اسی شان سے کی۔ جناب حبیب خاں صاحب نے جنھیں عینی شاہد بھی کہا جا سکتا ہے ایک ملاقات میں بتایا کہ لوگ قاضی عبدالغفار کے اداریوں کو پڑھنے کے لیے لوگ بے چین رہتے تھے اور ملک بھر میں ہماری زبان کی اشاعت کا انتظار رہتا تھا۔ یہ بات کسی بھی رسالے اور اس رسالے کے ایڈیٹر کے لیے یقیناً خود اعزاز کی بات ہے۔ اور یہی ایک اچھے اور پختہ کار صحافی کی شان بھی ہے اور پہچان بھی۔

''ہماری زبان کی ادارت سے پہلے حیدرآباد میں قیام کے دوران 'پیام' جیسے بلند پایہ اخبار کی ادارت کے سلسلہ میں حق بات پر اڑنا اور غلط اور ہٹ دھرمانہ امور اور ناعاقبت اندیش باتوں کی مذمت کرنا، قاضی صاحب کا شیوہ و شعار تھا۔ ایسی جرأت اور بے باکی وہ بھی ایسے حالات میں جب کہ حکومت کی چٹان اور عوام کی ایک کثیر تعداد کی فصیل مقابل ہو، بلاشبہ بڑی جی داری کا کام تھا بڑے ظرف کی بات تھی۔ مگر قاضی صاحب نے یہ کیا کیونکہ انھیں اپنی سوجھ بوجھ اور اپنی فکر پر پورا اعتماد تھا۔ یہی حریت پسندی بے باکی اور حق گوئی اور استقامت، ہماری زبان کے اداریوں میں بھی درآئی کیونکہ اس وقت تک یہ قاضی صاحب کے قلم، ان کی زبان، ان کی فکر اور ان کی ذات کا حصہ بن چکی تھی۔

اردو تحریک اور اردو کا مقدمہ دونوں جب شدید حالات سے دوچار تھے تو ہماری زبان کی تشکیل میں اردو کے حصہ کے عنوان سے ۱۵ اپریل ۱۹۵۵ء کے ہماری زبان کا قاضی صاحب نے جو اداریہ لکھا تھا وہ اردو کے مقدمے کی وکالت کا ہی یقینی بلکہ بلند پایہ اداریے کا بھی نمونہ ہے جس میں اپنے مدعا کا گہرا وقوف وادراک ہے اور ایقان بھی۔ میرے خیال میں جب تک یہ دو باتیں نہ ہوں اداریہ نگاری کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''جمہوریہ ہند میں اردو زبان کی دو حیثیتیں ہیں۔

اردو ہندوستان کے کئی کروڑ انسانوں کی مادری زبان اور تہذیبی زبان ہے۔

اور ہندوستانی زبان کے تمام تر علاقے میں ثانوی زبان کی حیثیت سے رائج ہے۔
لیکن اس کی ایک دوسری قومی حیثیت بھی ہے جس کی طرف عام طور پر نظر
نہیں جاتی۔ اس کی یہ دوسری حیثیت اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب ہم اردو
کو ہندی کا ایک اسلوب تسلیم نہ کریں بلکہ اردو، ہندی دونوں کو بنیادی طور پر ہندوستانی
کے دو اسلوب قرار دیں۔"

اداریہ کا یہ حصہ اردو کے تحقیقی مسئلے کو دانشورانہ سطح پر فراست اور ذہانت سے پیش کرنے کا ایسا ہی طریقہ ہے جیسے یہ کہنا کہ اردو بولنے والے ہندوستان کی ایک قابل لحاظ لسانی اقلیت یعنی بلکہ دوسری بڑی لسانی اکثریت ہیں۔ اسی اداریہ کا اگلا حصہ ملاحظہ ہو۔

"ہندوستانی کا ہندی اسلوب تاریخی اعتبار سے بہت بعد کے ارتقا کا مظہر ہے۔
اس کے پس پشت سنسکرت کا احیاء ہے جو کسی حد تک مناسب اور کافی حد تک
غیر مناسب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سنسکرت ہندوستان کی آریائی زبانوں
کی قبلہ گاہ ہے اور ہندوستان کی آریائی زبانوں کو بہت کچھ اس کا سہارا لینا
چاہیے لیکن جب سنسکرت پرستی کا نتیجہ یہ نکلے کہ خود ہندی زبان مسخ ہونے لگے تو
یہ تحریک نہ صرف ہندوستانی علاقے کے غیر ہندی باشندوں کے لیے خطرناک بن
جاتی ہے بلکہ خود ہندی بولنے والوں کے لیے عبرت کا سامان ہو جاتی ہے۔"

اداریہ نگاری کے دوران اداریوں میں زیر بحث آنے والے موضوع و مدعا پر اتقان اعتماد اور اس کے گہرے وقوف و ادراک کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پہ قدرت اور پیرائے اظہار میں بصیرت فراست اور ذہانت کی بات اوپر آچکی ہے۔ ان بنیادی اجزا کے علاوہ اداریے اپنے اسلوب و آہنگ کی وجہ سے بھی مقبول یا نامقبول پسندیدہ یا ناپسندیدہ، موثر یا غیر موثر ہوتے ہیں۔ ان میں خیالات کی شفافیت کے ساتھ پر اثر انداز بیان بھی چاہیے کہ بات دلوں میں گھر کر جائے ذہنوں پر نقش چھوڑ دے قارئین سے ہم کلامی اور رفی طبیعت کے اس اسلوب تحریر میں لب و لہجے کے سر پر بھی وقار سنجیدگی اور متانت کی دستار فضیلت ہونی چاہیے۔ ان امور کو ایک طرح سے صحافتی اخلاقیات بھی کہا جا سکتا ہے۔ اسی عنوان سے اور اسی موضوع سے

متعلق قاضی صاحب نے یکم اپریل ۱۹۵۵ء کے ہماری زبان کے اداریہ میں لکھا ہے۔

"جن اخباروں کا مقام بلند ہوتا ہے اور جو ذمہ دار اخبار سمجھے جاتے ہیں اگر ذہنی تعصب یا تنگ نظری کی وجہ سے کوئی مخالفانہ تنقید کریں تو اس پر ہمیں تعجب نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ یہ رنگ تو ہماری صحافت میں عام ہے۔ لیکن جب کوئی بڑا اخبار ایسی تنقید کرے جو حقیقت حال کے متعلق ناواقفیت اور جہل پر مبنی ہو تب یقیناً ہم حیران ہوتے ہیں جس تحریک کو آپ غلطی سے شورش کہتے ہیں اس میں کسی قسم کا تصنع نہ تھا درحقیقت ہمارے علم میں شورش کا ہلکا سا اشارہ بھی نہ تھا۔ نہ کوئی نفرت تھی نہ پبلک مظاہرے ہم نے بالکل خاموشی سے اپنا کام لیا اور حقیقت تو یہ کہ ہم خود اپنی تعریف کرتے ہیں کہ اس تحریک کو اس طرح چلایا گیا کہ ہم ہر قسم کے سیاسی اور فرقہ وارانہ جھگڑوں کے امکانات سے بچ کر نکل گئے۔ اگر آپ نے غور سے ہماری یادداشت کو پڑھا ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ آپ زیادہ موزوں نقطہ نظر اختیار کرتے دو سو برس سے یہ زبان ملک کی مشترکہ تہذیب کا نشان رہی ہے۔ اس طویل زمانے میں اس نے اپنے خزانے میں اس قدر کثیر لٹریچر اور روایات جمع کر لیں کہ وہ قدرتاً ان لوگوں کو عزیز ہے جو اس زبان کو اپنی مادری زبان کہتے ہیں کیا یہ قرین انصاف ہے کہ ایسے لوگوں کو جو دستور کے کھلے ہوئے اصولوں سے اپنے حقوق کی حفاظت چاہتے ہیں عام شورش پسندوں کا نام دیا جائے۔"

انجمن ترقی اردو ہند اور اردو تحریک ایک دوسرے کے لازم و ملزوم تھیں اور ہیں بھی۔ انجمن کے قیام کی بنیاد بھی یہی ہے اور دائرہ کار بھی یہی۔ سلسلہ بھی یہی منزل بھی یہی۔ اسی لیے اس انجمن کے سکریٹری اور اس انجمن کے ترجمان 'ہماری زبان' کے ایڈیٹر قاضی عبدالغفار، اس میدان کے سپاہی بھی تھے اور سپہ سالار بھی۔ اس وقت اردو کو اترپردیش کی دوسری سرکاری زبان بنانے کے مسئلے پر انھوں نے جو اداریے لکھے تھے ان میں سے ایک کا اقتباس پیش کرنا چاہوں گا کہ آپ بھی دیکھیں کہ کس حوصلے اور کس سلیقے سے انھوں نے اپنی بات کہی تھی۔

"دو سال ہوئے جب مدھیہ پردیش کی حکومت نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہاں دوسرکاری

زبانیں یعنی ہندی اور مرہٹی بیک وقت تسلیم کی جائیں گی۔ اب یہ خبر آئی ہے کہ پنجاب میں بھی یہ فیصلہ کیا جا رہا ہے کہ وہاں ہندی اور پنجابی دو سرکاری زبانیں تسلیم کی جائیں۔

مگر اتر پردیش میں بیک وقت دو سرکاری زبانوں یا سرکاری زبان کے ساتھ علاقائی زبان کا ماننا گناہِ کبیرہ ہے۔ منجملہ بہت عذرات کے ایک عذر بھی نہایت سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے کہ اس صورت میں حکومت کے اخراجات بڑھ جائیں گے اور نظم و نسق میں انتشار پیدا ہوگا سوال یہ ہے کہ اگر مدھیہ پردیش اور پنجاب میں بیک وقت دو سرکاری زبانوں کے حکومت پر مالی بار پڑنے کا خطرہ اور نظم و نسق میں انتشار کا اندیشہ پیدا نہیں ہوتا تو یہ کیا بات ہے کہ اتر پردیش میں سب سے زیادہ خطرے محسوس کیے جاتے ہیں۔ کیا اردو کے علاقائی زبان تسلیم کیے جانے یا مرہٹی اور پنجابی کو سرکاری حیثیت دیئے میں کوئی ایسا بڑا فرق ہے اتر پردیش میں تو کسی طرح اردو کا علاقائی زبان ہونا گوارا نہیں لیکن دوسری ریاستوں میں بیک وقت دو زبانیں سرکاری تسلیم کی جاتی ہیں۔ یہ باریک فرق اگر ہماری زبان میں آجائے تو اتر پردیش میں ہندی زبان کے حامیوں کی تنگ نظری کے متعلق ہماری بصیرت میں بہت اضافہ کر دے گا۔ یہ امید بے جا نہیں کہ محترم صدر جمہوریہ بھی اس صورت حال پر غور فرمانے کے بعد ہماری حزنِ داشت کے متعلق اپنے احکام نافذ فرمائیں گے۔"

ہماری حمیت اور غیرت قومی کو کس طرح جھنجھوڑا جاتا ہے یہ سبھی جانتے ہیں کہ بہار جیسی ریاست میں اس انصاف طلبی کا کیا حشر ہوا لیکن خوشی کی بات ہے کہ اب بہار اور اتر پردیش اس اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل گیا ہے۔ یہ اسی عزم مستحکم اور جہد مسلسل کا ثمر ہے۔ اس کا سلسلہ مجاہدین کی نئی نسل سے بھی جڑا ہوا ہے

قاضی عبدالغفار نے پیام کے اداریوں اور سرراہ کے کالم میں یا پھر ہماری زبان کے اداریوں اور ہلکے پھلکے اشارے میں جو مباحث اٹھائے یا جن مسائل کے حل بتلائے ان اور

کی نشاندہی کی وہ بڑی حد تک سچ ثابت ہوئیں۔ یہ بات ان کی فراست ہی کی نہیں بلکہ بصارت کی بھی دلیل ہے۔

۱۵ راگست ۱۹۵۴ء کے اداریے میں اردو کی نصابی کتابوں کے مسئلے سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"بیسک اسکولوں کا نیا نصاب درسی کتابوں کے آرڈر جولائی میں پاس کرائے گئے تھے۔ اور نئی بیسک ریڈروں کے ہندی ایڈیشن اس وقت بازاروں میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

لیکن ترجمے کی مجبوری اور لیتھو چھپائی کی وجہ سے اردو کتابیں ابھی تک بازار میں نہیں آسکی ہیں امید تھی کہ یہ کتابیں بھی جلد ہی دستیاب ہوسکیں گی۔ لیکن اردو پڑھنے والے بچوں کو دقت سے بچانے کے لیے عام اطلاع کے لیے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ بیسک نصابی کتابوں کے ۱۹۵۳ء کے اردو ایڈیشن ریاست کے پرائمری اسکولوں میں اس سال میں استعمال کیے جا سکتے ہیں اور جو کمی رہ جائے گی وہ نئی کتابوں کے بازار میں چھپ کر آجانے کے بعد پوری ہو جائے گی۔"

اس سوجھ بوجھ کا آج بھی اطلاق ہو سکتا ہے اور نصابی کتابوں کی کمی یا عدم دستیابی کے مسائل کو اس انداز فکر اور طریق عمل سے خوش اسلوبی کے ساتھ حل کیا جا سکتا ہے۔

یکم فروری ۱۹۵۴ء کے ہماری زبان کا اداریہ اہل قلم کی مالی امداد سے متعلق تھا اور یہ اس وقت کی بات ہے جب اردو اکیڈمیوں کا کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا تھا مگر آج اردو کے دانشوروں نے اس مسئلے کو اسی جذبے اور اس شدت سے محسوس کیا اور انعامات و اعزازات وغیرہ کے عنوانات سے اہل قلم کی مالی امداد کی راہیں نکالیں۔ بہر حال آج سے ۳۶ برس پہلے قاضی صاحب نے اس مسئلے کو کس تیکھے انداز سے اٹھایا تھا ملاحظہ فرمائیں۔

"ہماری قومی زندگی میں یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا گہرا تعلق قومی ترقی سے ہے۔ اس لیے کہ ادیبوں اور ان کے ادب کے ذریعے سے قوموں اور ملکوں کی ترقی میں جو مدد ملتی ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اس

افسوسناک حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے ملک میں تنگ دست ادیبوں کو جن کی وجہ معاش ہی ان کا قلم ہے ناشروں کی نفع اندوزی کا اس قدر شکار بنایا جاتا رہا ہے کہ آخر ان کے ادب کا معیار گر جاتا ہے اور وہ پراگندہ روزی ہو کر نہ کافی وقت دے سکتے ہیں نہ کافی محنت کر سکتے ہیں اور سستا مال سستے داموں فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جیسی کہ پنڈت نہرو کی عادت ہے۔ ان کی نظر حقائق تک جاتی ہے اور وہ سچی بات صاف طور پر کہتے ہیں لیکن جس ملک میں مہاتما گاندھی جیسا انسان قتل کیا جا سکتا ہے وہاں اگر قومی مسائل میں جواہر لال نہرو کی آواز بے اثر رہے گی تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

قاضی صاحب ایک بلند پایہ ادیب صحافی اور دانشور ہونے کے علاوہ بہ حیثیت انسان بھی نہایت نیک دل نیک طبیعت فرد تھے۔ ان کی نگارشات کے نکار خانے ہیں ان کی جامع صفات شخصیت بھی آج جلوہ سامانی ہے۔ جہاں انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے پیروی میں مدبرانہ انداز سے قومی سطح کے بڑے بڑے مسائل پر اداریے لکھے وہیں سماج اور افراد کے تزکیہ نفس اور تہذیب نگاری اور اخلاق و آداب شناسی پر سرسید کی اصلاحی تحریک کے زیر اثر تبصرے پیش کئے۔ ۱۵ جنوری ۱۹۵۴ء کی ہماری زبان کی اشاعت میں مشاعرے کے عنوان سے نئی نسلوں کی کردار سازی کی دردمندی میں ڈوب کر ایک خاص اداریہ تھا۔

"مشاعروں کی ایسی ہی اور بھی چند قسمیں ہیں۔ بعض مشاعرے ان کمزوریوں میں اس قدر زیادہ مبتلا ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعے زبان کی نشر و اشاعت کا جو مقصد ہے وہ بالکل ہی فنا ہو جاتا ہے آداب محفل اور خوش مذاقی کا تو کوئی سوال ہی نہیں بلکہ ماتم تو اس بدمذاقی کا ہے جس کے مظاہرے مشاعروں میں خصوصاً ہمارے نوجوانوں کی طرف سے کئے جاتے ہیں مشکل ہی سے کوئی محفل ایسی ہوتی ہے جہاں نوجوانوں کا اجتماع ہو اور اس بدمذاقی کا مظاہرہ نہ ہو۔ ضبط و نظم کی اس کمی اور آداب صحبت کی اس خلاف ورزی سے ایک بات تو یہ بالکل واضح ہو جاتی ہے وہ یہ کہ ہمارے نوجوانوں کو مذاق سخن یا زبان کی محبت ان محفلوں میں

نہیں لاتی بلکہ صرف تفریح و تفنن کا ایک ادبی تخیّل ہوتا ہے جو انہیں بالکل اسی طرح مشاعرے میں لاتا ہے جس طرح سینما یا تھیٹر میں لے جاتا ہے

اگرچہ بات میں بظاہر تلخی ہے مگر تنے کی حقیقت کو دیکھنے کی نظر سے دیکھا جائے تو اس کے در پردہ جو دردمندی ہے وہی تعمیر اور اصلاح کی تڑپ کا سب سے زیادہ روشن پہلو ہے۔

علامہ کیفی مرحوم، انجمن سے کس خلوص کس محبت اور کس ایثار نفسی کے جذبے اور احساس ذمہ داری سے وابستہ رہے اس کا اندازہ اس اداریہ سے بھی ہو جاتا ہے جو قاضی صاحب نے علامہ کیفی کی رحلت پر ۱۵ نومبر تا یکم دسمبر ۱۹۵۵ء کی ہماری زبان میں لکھا تھا۔ پنڈت آنند نرائن ملا، کرنل بشیر حسین زیدی قبلہ مالک رام، جناب حیات اللہ انصاری اور محترم یونس سلیم صاحب جیسے دانشوران دردمند کی انجمن سے وابستگی کے حوالے سے یہ بات اور بھی معنی آفریں اور آج بھی اثر انگیز معلوم ہوتی ہے۔ قاضی عبدالغفار کے مذکورہ ادارتی نوٹ سے ایک اقتباس ترتیب کے ایک چھوٹے سے ردوبدل کے ساتھ پیش کرتے ہوئے اپنی بات مکمل کروں گا۔

"علامہ کیفی مرحوم ۹۱ - ۹۲ سال اس دنیا میں رہ کر رخصت ہوئے آخری زمانے میں وہ بہت ضعیف ہو گئے تھے لیکن اس ضعف کا کوئی اثر ان کے ذہنی اور دماغی قویٰ پر نہ تھا۔ وفات سے چند ماہ پہلے تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ جسمانی ضعف کے باوجود انجمن کے جلسوں میں شرکت کرنے کے لیے علی گڑھ نہ آئے ہوں بارہا ایسا ہوا کہ میں نے ان کو بہ اصرار لکھا کہ وہ تشریف نہ لائیں لیکن تاریخ مقررہ پر ایک دو ہمراہی ان کو ٹرین سے اتارتے تھے اور میرے گھر پہنچا دیتے تھے۔ انتقال سے تقریباً دو ماہ پہلے میں ان کی مزاج پرسی کے لیے غازی آباد گیا۔ اس وقت بھی ان کی دماغی صحت ایسی تھی کہ اردو کے مسائل پر اور انجمن کے معاملات پر جس کے وہ نائب صدر تھے ایک گھنٹے تک بات چیت کرتے رہے لیکن ان کے جسمانی ضعف کو دیکھ کر میں نے محسوس کر لیا کہ اب وہ چراغ سحری ہیں اور کسی دن بھی باد خزاں کا ایک جھونکا آئے گا اور اس برگِ خزاں دیدہ کو اس کی شاخ سے جدا کر کے اڑائے جائے گا۔"

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری

قاضی عبدالغفار کی تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ

اردو کے مایہ ناز ادیب، صحافی اور سوانح نگار قاضی عبدالغفار (۱۸۸۸ - ۱۹۵۶ء) بیسویں صدی کے اہم نثر نگاروں میں سے تھے۔ آپ جامع الصفات شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی۔ عملی زندگی کا آغاز سرکاری ملازمت سے ہوا۔ مختلف قومی تحریکات سے وابستہ رہے اسی لیے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور صحافت کا آزاد پیشہ اختیار کیا۔ پہلے رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کے اخبار "ہمدرد" سے متعلق ہوئے۔ اس کے بعد اپنا ذاتی اخبار "جمہور" جاری کیا۔ اس کے ذریعہ آپ نے حکومتِ وقت کے مظالم اور اس کی ہندوستان دشمن حکمت عملیوں کے خلاف آواز بلند کی۔ حکومت اس تنقید کو برداشت نہ کرسکی اور اخبار ضبط کرکے قاضی صاحب کو نظر بند کر دیا۔ رہائی کے بعد آپ نے روزنامہ "صباح" جاری کیا۔ وہ بھی زیادہ عرصہ نہ چل سکا اور وہ بھی حکومت کے جبر و استبداد کا شکار ہو گیا۔ ۱۹۳۵ء میں حیدرآباد سے روزنامہ "پیام" جاری کیا۔ قاضی صاحب نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں عملی اور نظری دونوں حیثیتوں سے حصہ لیا اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ آپ حکیم اجمل خاں صاحب اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری جیسے صف اوّل کے رہنماؤں کے معتمدِ خاص رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی آپ کو قرب حاصل رہا اور ان کے نظریات اور کردار سے آپ بے حد متاثر ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں آپ نے خلافت وفد کے سکریٹری کی حیثیت سے انگلستان اور دیگر مغربی ممالک کا دورہ کیا جس کی یادگار آپ کا سفر نامہ "نقش فرنگ" ہے۔

قاضی صاحب نے اپنی زندگی پرورش لوح وقلم کے لیے وقف کردی تھی۔ سیاست کے ساتھ ادبی سرگرمیوں میں آپ ہمیشہ مصروف رہے۔ یہی سبب ہے کہ آپ کی تصانیف کی تعداد ایک درجن سے متجاوز ہے۔ اس کے علاوہ مختلف اخباروں اور رسالوں میں جو مضامین شائع ہوئے ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچی ہے۔ قاضی صاحب شاعر بھی تھے۔ یہ دوسری بات کہ اُن کا کلام شائع نہیں ہوا۔ اس طرف آپ نے سنجیدگی سے توجہ بھی نہیں کی، ورنہ ایک کامیاب نثر نگار ہونے کے ساتھ آپ ایک اچھے شاعر بھی ہوتے۔ آپ کی تصانیف کے موضوعات خاصے متنوع ہیں۔ ان میں افسانوی ادب بھی ہے۔ سوانح بھی اور سفرنامہ بھی۔ ان میں طبعزاد تصانیف بھی ہیں اور ترجمے بھی۔ نفسیات اور سیاسیات آپ کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ چنانچہ آپ کی تمام کتابوں میں ان دونوں کی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے۔

قاضی صاحب عملی طور پر کسی ادبی تحریک سے وابستہ نہیں ہوئے۔ لیکن زبان و بیان اور موضوع کے لحاظ سے آپ کا شمار رومانوی نثر نگاروں اور ترقی پسند ادیبوں میں ہوتا ہے۔ آپ کی تمام تصنیفات تالیفات اور تراجم کو ہم مندرجہ ذیل موضوعات میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) افسانوی ادب (۲) سوانح (۳) سفرنامے (۴) متفرقات

افسانوی ادب:

۱۔ **لیلیٰ کے خطوط:** امرتسر۔ آزاد بک ڈپو ۱۹۳۴ ۲۲۲ص

(بار دوم) حیدرآباد، عبدالحق اکیڈیمی ۱۹۴۴ ۲۲۲ص

ابتدا میں یہ خطوط ماہنامہ نیرنگ خیال لاہور میں ۱۹۳۰ سے ۱۹۳۳ تک بالاقساط شائع ہوئے۔ ۱۹۳۴ میں کتابی شکل میں منظر عام پر آئے۔ اِن خطوط کی مجموعی تعداد باون (۵۲) ہے۔ یہ فرضی خطوط ہیں۔ اصلاً یہ ناول ہے جس میں ایک طوائف کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس کو بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور ہر حصہ کا عنوان "کتاب" متعین کیا گیا ہے۔ ان کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ پہلی کتاب: خط ۱ تا ۲۳ ص ۱۱ تا ۱۱۴

۲۔ دوسری کتاب: خط ۲۴ تا ۲۹ ص ۱۱۷ تا ۱۰۶

۳۔ تیسری کتاب ؛ خط ۳۰ تا ۵۲ ص ۱۲۹ تا ۲۲۲

لیلیٰ کے خطوط کے موضوع اور مطالب کا تعارف کراتے ہوئے قاضی صاحب مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"یہ صفحات اپنی شرح خود ہیں۔ ایک چھوٹا سا آئینہ ہے جو ہندوستان کے نام نہاد مصلحین قوم اور مذہبی رہنماؤں کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اس میں عورت کے متعلق اپنی غفلت شعاریوں کا مکروہ چہرہ دیکھ سکیں۔

مجھ پر ظلم ہوگا اگر ان صفحات کو ناول یا افسانہ سمجھ کر پڑھا گیا حقیقت یہ ہے کہ اس کاغذی پیرہن میں خراب آباد ہندوستان کی نسوانی زندگی کے چند نقوش پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر اس بدنصیب ملک میں کچھ لوگ ان نقوش کے معنی سمجھ سکیں تو سمجھ لیں اور یہ بھی سمجھ لیں کہ جس وقت تک ہندوستان کی عورت کے ساتھ پورا انصاف نہ کیا جائے گا، سیاسی آزادی اور قومی ترقی کا ادعا محض حرف غلط رہے گا۔"

"لیلیٰ کے خطوط" کی تینوں کتابیں دراصل لیلیٰ کی زندگی کی تین منزلیں ہیں۔ یہ تینوں منزلیں زندگی کی اہم حقیقتوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ اگر ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ یہ محض ایک طوائف کی داستان نہیں ہے بلکہ عمومی طور پر ہر عورت کی مختلف ذہنی کیفیتوں کی ترجمانی اور احساسات و جذبات کا نفسیاتی مطالعہ ہے۔ اور جیسا کہ دیباچہ میں خود قاضی صاحب نے واضح کیا ہے:

"لیلیٰ کے قلم سے جو خطوط لکھوائے گئے ہیں اُن کا یہ مجموعہ نہ انشاء پردازی کی مشق ہے، نہ زورِ قلم کا مظاہرہ، بلکہ ان خطوط میں جو دیکھ سکتے ہوں، ان کے لیے لیلیٰ کا تبسم ایک فوارۂ خون، اس کی بذلہ سنجی ایک فریاد اور اس کی ظرافت ایک دکھی پکار ہے! اس کی شوخیوں میں اس کے دل کا درد مستور ہے، اس کی شرارتوں میں اس کی جراحتیں پوشیدہ ہیں۔ لیلیٰ کی زندگی کا فلسفہ اس قدر نفرت انگیز نہیں جس قدر درد انگیز ہے! وہ ہنس ہنس کر اپنے زخموں سے کھیلتی ہے جو اس کے وجودِ معنوی پر ناسور بن کر رہ گئے ہیں۔ اپنی مختصر داستان میں وہ اپنی لاکھوں بدنصیب بہنوں کی روئداد زندگی بیان کرتی ہے جو اس ملک میں مردوں کی نفس پرستی پر قربان کی جاتی ہیں۔ لیلیٰ کی

زندگی کا ہر نقش فریادی ہے۔"

قاضی صاحب نے ایک طوائف کے جذبات اور اس کی مختلف اور متضاد کیفیات کی بڑی حسین اور حقیقت پسندانہ عکاسی کی ہے۔ قاضی صاحب کا تمام تر زور اس بات پر ہے کہ صنف نازک بنیادی طور پر باحیا اور پاک باز ہوتی ہے اور یہ مردوں کی ہوس پرستی ہے جو اُسے غلط راستہ پر چلنے کو مجبور کرتی ہے۔ انھیں معاشرے کے اُس طبقہ سے دلی ہمدردی ہے جس کو معاشرہ دُھتکار چکا ہے اور معززین و اشراف کی محفلوں میں جس کا تذکرہ تک گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ قاضی صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اِس کے کردار کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ قاری کو اس سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس کو مظلوم و مجبور سمجھنے لگتا ہے۔ اور یہی اس کے مصنف کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

لیلیٰ کے خطوط کو ادبی حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور ناقدین نے اسے اردو کے نثری ادب میں ایک قیمتی اضافہ قرار دیا۔ پروفیسر آل احمد سرور نے ان خطوط کو انشائے لطیف کا چمن بتایا اور ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے "انھیں انشا پردازی، سحر طرازی، دردمندی، گداز، جمالیاتی احساس اور طنزیہ اسلوب کا بہترین نمونہ" قرار دیا۔ اور عزیز احمد کی رائے ہے کہ:

> قاضی عبدالغفار کا "لیلیٰ کے خطوط" پہلا ترقی پسند ناول ہے۔ ناول کا اطلاق اس کتاب پر ذرا مشکل ہی سے ہوتا ہے جو انشا پردازی، پرانے معنوں میں سے قصے کا کام لیتی ہے۔ قاضی صاحب نے ناول کی اُس نوع کی پیروی کی ہے جو اٹھارہویں صدی میں فرانس اور انگلستان میں بہت مقبول تھی اور "خطوط کا ناول" کہلاتی تھی۔"[1]

روزنامچہ یا مجنوں کی ڈائری : لاہور، دارالاشاعت پنجاب ۱۹۳۴ء ۱۵۶ ص یہ ڈائری ۱۸ فروری ۱۹۲۹ء سے شروع ہوتی ہے اور ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ کو ختم ہوتی ہے۔ اس روزنامچہ کا سلسلہ قاضی صاحب کی اس سے پہلی تصنیف "لیلیٰ کے خطوط" سے ملتا ہے۔ اِس کو ہم اُس کا تتمہ یا

---

[1] ترقی پسند ادب۔ دہلی، چمن بک ڈپو۔ ب ت، ص ۱۱۵

ضمیمہ بھی کہہ سکتے ہیں لیلیٰ کے خطوط کا مقصد طبقۂ نسواں کے ایک گروہ کی زندگی کی عکاسی کرنا اور اس کے سفرِ زندگی کی مختلف منزلوں میں اس کی صحیح جانب رہنمائی کرنا ہے، تو اس روزنامچہ کا مقصد نوجوان طالب علموں کے طرزِ زندگی، اندازِ فکر اور عمل میں اصلاح کرنا ہے۔ قاضی صاحب نے "شرح کلام" کے عنوان سے اس کا جو مقدمہ تحریر کیا ہے اُس میں اِس تصنیف کے مقصد کی وضاحت بڑے حسین انداز میں کی ہے۔ لکھتے ہیں :

"جس زمانے میں لیلیٰ کے خطوط شائع ہو رہے تھے اور پڑھنے والے دلچسپی کے ساتھ اس کو پڑھ رہے تھے، میرے اکثر احباب نے مجھے اس امر پر متنبہ کرنا ضروری سمجھا کہ لیلیٰ کا طرزِ بیان بہت بے حجاب ہے اور اعتدال کی حد سے گزرا ہوا ہے بعض نے تو یہ بھی کہا کہ لیلیٰ کی یہ حرکت کہ وہ مذہب اور انسانیت کے بہترین مسلمات کے ساتھ کھیلتی ہے اور شوخیاں کرتی ہے، قطعاً ناروا ہے۔

اگر آپ ان اوراق کو پڑھتے وقت بین السطور بھی دیکھتے جائیں تو آپ بہ آسانی معلوم کر سکیں گے کہ باوجود اس بغاوت کے جس کا علم یہ بائی بلند کئے ہوئے ہے کبھی کبھی جوہر اصلی کی ایک جھلک اس کی زندگی میں نظر آتی ہے جس طرح شب کی تاریکی میں اور جنگل کے کسی تاریک کونے میں ایک کرمک شب چراغ کی چمک۔"

دراصل قاضی صاحب اپنے عہد میں رائج نظام تعلیم سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس تعلیم سے نوجوانوں کے کردار کی تعمیر نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ بے مقصدی اور بے راہ روی کی جانب لے جاتی ہے اس لیے نوجوانوں میں اخلاقی اور مذہبی اقدار کا جو فقدان ہے اس کی بنیادی ذمہ داری مروجہ نظام تعلیم پر ہے۔ فرماتے ہیں :

"صحیح تربیت کے بغیر ایک ایسی تعلیم جو مشرق و مغرب کے بہت سے علوم کا ایک نامکمل اور غیر مرتب مرکب ہو، ایسے نوجوان پیدا کرتی ہے جو عقل اور مذہب دونوں سے برگشتہ ہو کر زندگی کا مقصد صرف اتنا جانتے ہیں کہ آدمی جذبات کی لگام ڈھیلی چھوڑ دیں اور جوانی کے گرم خون کو اور بھی زیادہ گرم ہو کر دوڑنے دیں . . . . . سب کچھ اس تعلیم سے حاصل ہوتا ہے ماسوائے علم کے! . . . قصور کس کا ہے؟

کسی کا ہو۔ مگر اِن غریب نوجوانوں کا تو یقیناً نہیں ہے جن کو کالجوں میں اس طرح پیسا، گھولا اور چھانا جاتا ہے کہ جب وہ کالجوں اور اسکولوں سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں تو اُن کو آنکھوں سے نظر نہیں آتا، دماغ معطّل ہوتے ہیں اور کمر ٹیڑھی! پھر وہ دونوں طرف سے ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ مذہب والے اُن کو ملعون و مردود کہہ کر دُھتکارتے ہیں اور دنیا والے اُن کو دو وقت کی روٹی کھانے نہیں دیتے۔ ۔ ۔ ۔"

ادبی حلقوں میں "مجنوں کی ڈائری" کی کچھ زیادہ پذیرائی نہیں ہوئی۔ دراصل جس زمانے میں قاضی صاحب نے "لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" لکھی اُس زمانے میں ہمارے معاشرے پر موجودہ تہذیب کی چھاپ زیادہ گہری نہیں ہوئی تھی، مشرقیت اور قدامت پرستی کا اثر اُس پر غالب تھا۔ اُس ماحول میں اس قسم کی تحریریں لکھنا اور پھر ان کی تشہیر کرنا بڑی معیوب بات تصوّر کی جاتی تھی۔ قاضی صاحب نے پہلے لیلیٰ کے خطوط اور پھر اس سے متصل ہی مجنوں کی ڈائری شائع کر کے اس عہد کے مزاج کے خلاف کام کیا۔ اور خواہ اُن کا مقصد کتنا ہی اصلاحی کیوں نہ رہا ہو، انھوں نے اُس طبقہ کو اپنا موضوع بنایا جس کو معاشرہ نفرت اور حقارت کے سوا کچھ اور دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ لہذا لیلیٰ کے خطوط شائع ہوتے پر لوگ چوکنا ہوئے اور اس کے مصنف کو بھی متنبہ کیا۔ انھوں نے اس کے بے حجابانہ انداز پر زیرِ لب تنقید بھی کی۔ مجنوں کی ڈائری کے منظرِ عام پر آتے ہی یہ زیرِ لب تنقید برملا تنقیص میں بدل گئی۔ قاضی کی اس جراُت کو سنجیدہ حلقوں نے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ چنانچہ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

وہ لوگ جن سے ہماری بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں معصیت کا علاج مسکرات سے کرنے لگے ہیں۔ ابھی ابھی قاضی عبدالغفار صاحب (صاحبِ نقشِ فرنگ) کی دو تصانیف نظر سے گذریں۔ لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری نقشِ فرنگ کے مطالعہ کے بعد میں قاضی صاحب کی شخصیت اور ادب طرازی دونوں کا معترف ہو گیا تھا۔ لیلیٰ کے خطوط دیکھ کر ادب طرازی کا اب بھی قائل ہوں۔ لیکن مجنوں کی ڈائری پڑھنے کے بعد بے اختیار آہ نکلی کہ ع

از قبیلۂ مجنوں کسے نماند

قاضی صاحب نے بھی نوجوانوں کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا ہے جس کی اُن کی سیرت و شخصیت سے توقع تھی۔ ؎

ہاں اہل طلب کون سُنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا ہی نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

یہ تو کوئی ذمہ دارانہ طریقہ کار نہیں ہے۔ نوجوانوں کو جوانی دیوانی' کا سبق پڑھانا سہل ضرور ہے لیکن قطعاً 'نافرجام' ہے۔ یہی چیز عبرت خیز اور مضحکہ انگیز بھی ہو جاتی ہے جب یہ سبق ہم بوڑھے پڑھانے لگتے ہیں۔[1]

عجیب: لاہور ۔ دارالاشاعت پنجاب [ب ت] ۱۶۰ص

دہلی ۔ اردو مرکز [ب ت] ۱۱۲ص

'عجیب' کے کسی بھی ایڈیشن پر سال اشاعت درج نہیں ہے لیکن قراین یہ بتاتے ہیں کہ یہ ۱۹۳۵ کے بعد شائع ہوئی اس لیے کہ دارالاشاعت والے ایڈیشن کے آخری صفحات پر لیلیٰ کے خطوط مجنوں کی ڈائری اور اُس نے کہا' کے اشتہارات دیے ہوئے ہیں۔ ان میں سے لیلیٰ کے خطوط ۱۹۳۴ میں مجنوں کی ڈائری بھی ۱۹۳۴ میں اور اس نے کہا' ۱۹۳۵ میں شائع ہوئی تھی اس طرح 'عجیب' ۱۹۳۵ کے بعد کی تصنیف قرار پاتی ہے۔

'عجیب' میں چھ مختلف عجیب و غریب قصے بیان کئے گئے ہیں۔ ان کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

(۱) کھٹیا (۲) پرچھائیں (۳) کباڑی کی کوٹھری
(۴) شاہ جمال (۵) رویائے صادقہ (۶) چاہ نخشب

یہ قصے کسی نہ کسی طرح حقیقت پر مبنی ہیں اور قاضی صاحب کے ساتھ پیش آچکے ہیں۔ ان کو افسانوی رنگ دے کر تخیل کی رنگ آمیزی کر دی گئی ہے۔ اس طرح یہ واقعات نیم حقیقت اور نیم افسانہ بن جاتے ہیں۔ ان کہانیوں میں متحیر العقول اور مافوق الفطرت واقعات بیان کئے گئے ہیں اور قاضی صاحب کے اس دعویٰ کے علی الرغم کہ وہ توہمات پر اعتقاد نہیں رکھتے' ان واقعات سے بڑی

---

[1] نگار (ماہنامہ) لکھنؤ۔ جلد ۳۸۔ شمارہ ۱ (جولائی) ۱۹۴۰ء۔ ص ۲۵

حدتک متاثر ہوئے اور مادہ پرست ذہنیت کے باوجود اِن کرامات کا انھیں قایل ہونا ہی پڑا۔ ان قصّوں میں ہم آپ بیتی کے عناصر بھی تلاش کر سکتے ہیں۔ پہلے قصے 'کھشیما' کے شروع میں اپنے معتقدات کی وضاحت کرتے ہوئے قاضی صاحب لکھتے ہیں :

"میں روحانیت، کرامات اور معجزوں کا قایل نہیں۔ مادیت اور دہریت کی طرف جھکا ہوا ہوں۔ والد میری موجودگی میں کبھی کبھی اپنے ہم عمر دوستوں کو اس قسم کے قصے سنایا کرتے تھے تو میں بیٹھا ہوا اُن کی بے وقوفی پر دل ہی دل میں ہنسا کرتا تھا۔"

اسی طرح دوسری کہانی 'پرچھائیں' کے ابتدائی حصہ میں وہ لکھتے ہیں :

"مشرب رندانہ، مزاج محرور، طبیعت آزاد، عقاید لامذہبی کی طرف مایل اور پیشہ اخبار نویسی۔ جنگ یورپ شروع ہو چکی تھی، میرا اخبار بمبئی سے شائع ہوتا تھا اور اس زمانے میں بہت مقبول تھا۔ حکومت کی ٹیڑھی نظریں مجھ پر پڑ رہی تھیں۔ میں بھی چھیڑنے سے باز نہ آتا تھا اور کچھ نہیں تو میدان جنگ کی خبروں پر سرخیاں ایسی رکھتا تھا جیسے سانپ بچھو کے ڈنک . . . ."

اِن تمام معتقدات کے باوجود قاضی صاحب کو اِن عجیب و غریب واقعات میں کسی حد تک حقیقت نظر آئی۔ ان پر انھیں یقین اس وجہ سے آیا کہ یہ کسی دوسرے شخص کے سنائے ہوئے قصے نہیں ہیں بلکہ وہ واقعات ہیں جن سے خود قاضی صاحب دوچار ہوئے۔ ان کہانیوں میں سب سے پہلی کہانی 'کھشیما' کے عنوان سے ہے۔ اس میں عجیب قسم کے لوگوں کے حیرت انگیز کارناموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور ان سے ایسے واقعات کے سرزد ہونے کا ذکر ہے جن کا عام انسانوں کے ہاتھوں عمل میں آنا ناقابل یقین ہے۔ ان کی عادات ایک عام انسان سے یکسر مختلف ہیں۔ مثلاً ایک بزرگ ایسے ہیں جن کو زہریلے سانپ کا بڑا شوق تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اُن کے کاٹے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی ٹوپی میں بڑے بڑے سگر مچھ بھی رکھا کرتے تھے اور وہ بھی انھیں کسی طرح بھی نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔ ان کو یہ ملکہ بھی حاصل تھا کہ وہ پانی میں غوطہ لگا کر بغیر جال بچھائے مچھلیاں نکال لیا کرتے تھے اور ایک ایک بار میں اتنی مچھلیاں پکڑ لیا کرتے تھے کہ بڑے سے بڑے جال میں بھی وہ نہیں آسکتی تھیں۔ ان کے علاوہ اسی نوع کے دوسرے قصے بھی بیان کئے

گئے ہیں جو عام انسان کی عقل میں نہیں آ سکتے ۔

دوسری کہانی 'پرچھائیں' کے عنوان سے ہے ۔ اس میں قاضی صاحب اپنے قاری کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے کراتے ہیں جو بیک وقت کئی کئی جگہ نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود کوئی ان سے ملاقات نہیں کر سکتا ۔

تیسری کہانی 'کباڑ کی کوٹھری' ہے ۔ اس میں قاری کی ملاقات ایک ایسی روح سے کرائی جاتی ہے جو ایک طویل عرصہ سے اس ویران کباڑ کی کوٹھری کو اپنا مسکن بنائے ہوئے تھی ۔ ایک مدت کے بعد اس کوٹھری کو منہدم کرکے اس کی جگہ ایک کمرہ تعمیر کیا جاتا ہے ۔ لوگ اس میں رہنے لگتے ہیں ۔ لیکن وہ روح پھر بھی کمرہ کا پیچھا نہیں چھوڑتی ۔ وہ مسلسل احتجاج کرتی اور مکینوں کو پریشان کرتی رہتی ہے ۔ مگر مکین اس پر کوئی توجہ نہیں دیتے ۔ آخر کار وہ خود ہار مان لیتی ہے اور تنگ آکر خاموشی اختیار کر لیتی ہے ۔

'شاہ جمال' ایک ایسے مجذوب کی کہانی ہے جو اپنے جوان بیٹے کی مسلسل علالت اور اس کے دماغی اختلال سے تنگ آکر ایسی حرکتیں کرنے لگتا ہے جس سے وہ خود بھی نیم پاگل معلوم ہونے لگتا ہے ۔ اس کے بعد قدرت کا یہ کرشمہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جیسے ہی باپ نے مجنونانہ حرکتیں شروع کیں بیٹا صحت یاب ہونے لگا ۔ شاہ جمال پر جب دیوانہ پن طاری ہو جاتا ہے تو اُن سے اس قسم کی حرکتیں سرزد ہونے لگتی ہیں جیسی کھیٹا والے بزرگ سے سرزد ہوا کرتی تھیں ۔ 'رویائے صادقہ' بھی ایک مجذوب کی داستان ہے ۔ ان کے متعلق بھی عجیب و غریب واقعات مشہور ہیں ۔ وہ خواب دیکھا کرتے تھے اور ان سے جو تعبیر لیتے تھے وہ ہمیشہ سچ ہوتی تھی ۔ اسی لیے وہ پیشن گوئی بھی کرنے لگے تھے جو اکثر صحیح ثابت ہوتی تھی ۔ ان کے علاقہ کے لوگ بڑی تعداد میں ان سے فیض یاب ہونے لگے تھے ۔ وہ ان سے اپنے مستقبل کا حال دریافت کرتے اور جو کچھ وہ بتا دیا کرتے تھے' لوگ اس پر یقین کر لیا کرتے تھے ۔

اس مجموعے کی چھٹی اور آخری کہانی 'چاہ نخشب' کے عنوان سے ہے ۔ یہ ایک ایسے سپاہی کا روزنامچہ ہے جس نے بہت سے مقامات کی سیر کی ہے ۔ ان میں عراق' ایران' روس' نہر سوئز پناما' ٹوکیو' کابل' ہرات' سمرقند' بخارا' ماسکو وغیرہ جیسے دور دراز کے اور ایک دوسرے سے

مختلف مقامات شامل ہیں۔ اسی سیاحت کے دوران اس کا گذر چاہ نخشب میں بھی ہوتا ہے۔
جہاں کی دنیا ہی سب سے نرالی ہے۔ اس کی تفصیل خود سیاح کی زبان سے سنیے :

"وہاں جو لوگ بستے ہیں وہ جسم اور گوشت پوست نہیں رکھتے ۔ ارواح ہیں ۔ خالص اور مصفا ۔ میرے لیے وہ مناظر عجیب تھے جو میں نے دیکھے ۔ مکانات ۔ ایسے کہ معلوم نہیں کس چیز سے بنائے گئے تھے ۔ اینٹ، پتھر، بلور، کچھ بھی نہیں، لیکن ایک دھندلی شکل ان کی تھی جیسے دھواں! محرابیں اور ستون اور دروازے، شہ نشین، دالان، حجرے ۔ سب کی وہی صورت تھی جیسی ہمارے تمہارے مکانوں کی ۔ لیکن ان کی دیواروں کو انگلی لگائی گئی تو گویا بھاپ یا دھوئیں یا کہر کی چادر کو چھو لیا ۔ قطعاً غیر محسوس۔ ! وہاں کے باشندوں کی حالت یہ کہ آواز کے سوا کچھ نہ تھا ۔ جسم کی ساری پابندیوں سے آزاد ! ۔ دن اور رات کا امتیاز کچھ نہ تھا، وہی ایک روشنی ہر وقت موجود تھی ۔ وقت کا حساب بھی کچھ نہ تھا ۔ روشنی کا منبع بھی مستور تھا یا ناپید تھا !"

عجیب کی ہر کہانی اپنے اندر مقصدیت اور معنویت رکھتی ہے۔ اپنی نوعیت اور موضوعات کے اعتبار سے یہ اردو ادب میں اچھوتی اور انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو میں اس نوع کی تحریریں اس سے قبل شاذ ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس میں قاضی صاحب کا مخصوص اسلوب جس میں طنز کے تیر و نشتر اور مزاح کے حسین و دلکش مرقعوں کا بہترین امتزاج ہے، اپنے پورے بانکپن کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے سلیس اور سادہ جملے رومانی نثر کی اچھی مثالیں پیش کرتے ہیں۔

تین پیسے کی چھوکری: لاہور، مکتبہ اردو ۱۹۳۴ء
دہلی، مکتبہ شاہراہ ۱۹۵۹ء

اگرچہ یہ پہلی بار ۱۹۳۷ میں کتابی شکل میں منظر عام پر آئی، اس کا تخلیقی عمل اصلاً اس سے کافی پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اس میں ۱۹۱۸ کی بھی کچھ تحریریں شامل ہیں۔ اس میں مندرجہ ذیل کہانیاں شامل ہیں:

۱۔ تین پیسے کی چھوکری (الف) ۲۔ تین پیسے کی چھوکری (ب)
۳۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہے ۴۔ تین ۵ قسمیں۔
۶۔ دیوتاؤں کا صدقہ ۷۔ ڈپٹی صاحب کا کتا۔ ۸۔ سراغ رساں
۹۔ سزائے موت ۱۰۔ گھوڑا۔ ٹیگور کا ایک تخیل۔
۱۱۔ نتیجہ برا ہے۔ ۱۲۔ قرب۔ گالزوردی کا ایک عکس۔ ۱۳۔ میں اکیلا ہوں۔

یہ تمام تحریریں بظاہر کہانی کے فارم میں ہیں لیکن اصل میں ان میں سے بیشتر انشائیے ہیں اور ادب لطیف کا اچھا نمونہ تصور کیے جاتے ہیں۔ یہ منظم اور مربوط تحریریں نہیں ہیں بلکہ مختلف موضوعات پر مختلف نوع کے ادب پارے ہیں۔ خود قاضی صاحب نے انھیں اوراق پریشاں بتایا ہے۔ اس کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

"یہ جو کچھ ہے منظم افسانہ نگاری نہیں ہے۔ بلکہ ایک انتشار ہے۔ معتوب! ناقد اور مبصر سے زیادہ میں اپنے حال سے واقف ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ میں سب کچھ لکھ سکتا ہوں سوائے افسانے کے! بحیثیت ایک ادیب کے میرا قلم فن کے ہر پہلو پر حاوی ہے سوائے ادبیات کے! اس آغازِ کلام کے بعد خاتمہ کلام جو کچھ ہوگا وہ ظاہر ہے!

اہلِ ذوق سے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ افسانے اُن کے قابل نہیں ہیں۔۔۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ یہ اوراقِ پریشاں صرف اُن اصحاب کے پڑھنے کے قابل ہیں اور اُن ہی سے میں اِن اوراق کو منسوب کرتا ہوں جو میری طرح افسانہ لکھ نہ سکتے ہوں مگر لکھتے ضرور ہوں! اور اس قسم کے میرے ساتھی بہت ہیں!"

قاضی صاحب نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز کو اس دیباچہ میں بھی برقرار رکھا ہے۔

اس مجموعے کی پہلی کہانی تین پیسے کی چھوکری ہے۔ اس میں اہل بصیرت کے لیے بڑی عبرتیں پوشیدہ ہیں۔ یہ ایک معمولی لڑکی کی داستان ہے جو محض اپنے حسن اور جوانی کے بل پر بے شمار افراد کے دلوں پر حکمرانی کرتی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ ملکِ بائی زنطہ کے نوجوان شہزادے کو اپنے دام فریب میں پھانس لیتی ہے اور اس کی ملکہ بن کر اُس کے دل پر حکمرانی کرنے کے ساتھ پورے ملک پر بھی

کو بگاڑنے کا سبب بنتے ہیں اور قوم کے جس طبقہ کو سب سے صحت مند رجحانات کا حامی اور کردار کا مضبوط ہونا چاہیے، اگر اس میں ہی نفسیاتی بیمار پیدا ہونے لگیں تو ان سے پوری قوم اور ملک کا مستقبل معرضِ خطرہ میں پڑ جائے گا۔

فریب: انگریزی کے مشہور ادیب، ناول نگار اور ڈراما نویس جان گالزورردی کی ایک کہانی سے ماخوذ۔ قاضی صاحب نیشنلسٹ خیالات کے انسان تھے۔ اسی کے ساتھ وہ قومی یکجہتی کے بھی علم بردار تھے۔ اس کا اظہار انھوں نے مختلف اوقات میں اور مختلف انداز میں کیا ہے۔ وہ حکیم اجمل خاں صاحب، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کے بہت قریب رہے۔ ان کے نظریات سے متاثر ہوئے۔ اُدھر گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد نے انھیں بے حد متاثر کیا۔ ان بزرگوں نے انھیں احترامِ آدمیت کا سبق پڑھایا۔ 'فریب' کا مرکزی خیال بھی یہی ہے۔ انسان کے دل میں دوسرے انسان کے لیے جو تعصب ہوتا ہے اور ایک قوم کے افراد دوسری قوم کے افراد کے لیے جو بغض و عناد رکھتے ہیں وہ سب دھوکا اور فریب ہے۔ اس کا حقیقت اور اصلیت سے دور کا بھی علاقہ نہیں۔ اس کی بیخ کنی جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی ملک و قوم کے حق میں بہتر ہوگا۔ ہمارے معاشرہ کا المیہ یہ ہے کہ انتہائی مہذب اور تعلیم یافتہ حضرات بھی اس تعصب اور تنگ نظری کا شکار نظر آتے ہیں۔ ان تمام حقائق سے 'فریب' میں بڑی کامیابی سے پردہ اُٹھایا ہے۔

'میں اکیلا ہوں' اس مجموعے کی آخری کہانی ہے۔ اس میں ایک ایسے انسان کی نفسیات کا مطالعہ کیا گیا ہے جو اس بھری پُری دنیا میں خود کو تن تنہا اور بے یار و مددگار محسوس کرتا ہے۔ ایسے لوگ نفسیاتی طور پر کمزور ہوتے ہیں۔ لیکن اپنی اس کمزوری کو وہ اپنی 'انا' میں چھپائے رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سوسائٹی میں خود کو اجنبی اور MISFIT محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ تنہائیوں کی غار میں چلے جاتے ہیں۔ اس کہانی کا مرکزی خیال تو بہت اچھا ہے لیکن اس کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے قاضی صاحب نے اس کی تخلیق پر کوئی خاص محنت نہیں کی، نہ ہی ویسی توجہ سے اسے سنوارا اور نکھارا ہے۔ اس لیے اس کردار سے جو تاثر وہ دینا چاہتے ہیں اس میں وہ بہت زیادہ کامیاب بھی نہیں ہوئے ہیں۔

ببول کا درخت: حیدرآباد، اردو اکیڈمی ب ت

یہ انگریزی مصنف جان گالزورردی (John Gals Worthy) کی نوبل انعام یافتہ ناول The Apply Treet کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ پہلی بار اردو اکیڈمی حیدرآباد سے اور دوسری بار ۱۹۳۹ء میں کریمی پریس لاہور سے شائع ہوئی۔

گالزورردی انگلستان میں بیسویں صدی کے اہم مصنفوں میں ہے۔ اس کا اصل میدان اصلاح معاشرہ ہے۔ اس نے اپنے ناولوں اور ڈراموں کے ذریعہ انگلستان کے سماجی انقلاب میں اہم رول ادا کیا۔ اس کی تحریروں میں لطیف طنز بھی ملتا ہے لیکن اس میں تنقید سے زیادہ ہمدردی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اسے عام انسان سے جو ہمدردی ہے اس کی جھلک اس کی تقریباً ہر تحریر میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کے یہاں فکر و احساس کی صداقت ہے، طبقاتی نظام کے خلاف اعلان جنگ ہے جدید و قدیم تمدن کی کشمکش ہے اور سماجی انتشار کا تذکرہ ہے اور ان کے اصلاح کی کوششیں ہیں۔ یہ وہ موضوعات ہیں جو قاضی عبدالغفار کو بہت عزیز تھے۔ 'دی ایپل ٹری' میں گالزورردی کا فن اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے۔ ان ہی خصوصیات کی بنا پر قاضی صاحب نے اسے ترجمے کے لیے منتخب کیا۔ یہ ترجمہ پہلے نیرنگ خیال میں قسطوار شائع ہوا۔ بعد میں کتابی شکل میں آیا۔

یہ بھی عجیب حسن اتفاق ہے کہ اسی کتاب کا ترجمہ وشوامترا عادل نے بھی کیا اور اس کا نام بھی انھوں نے 'سیب کا درخت' ہی رکھا۔ اسے ۱۹۴۹ء میں کتب پبلشرز بمبئی نے شائع کیا لیکن یہ کچھ زیادہ مقبول نہیں ہوا۔

سوانح

آثارِ جمال الدین افغانی: دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۴۰ء ۴۴۲ ص

مندرجات۔ (۱) خاندان اور تاریخ و مقام ولادت ۔ ص ۱ ۔ ۲۴

(۲) دورِ اوّل۔ ص ۲۵ ۔ ۵۶ (۳) دورِ ثانی۔ ص ۵۷ ۔ ۱۵۵

(۴) دورِ ثالث و آخر ص ۱۵۹ ۔ ۴۰۹ (۵) کتابیات و اشاریہ وغیرہ ص ۴۱۱ ۔ ۴۴۲

جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ ۔ ۱۸۹۷) گذشتہ صدی کے اُن سیاسی رہنماؤں میں سے ہیں جنھوں نے مغربی استبداد سے مسلم ممالک کو آزاد کرانے کے لیے تمام عمر جدوجہد کی اور اس کے

لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیا۔ وہ صحیح معنی میں مرد مجاہد تھے۔ انھوں نے دنیا میں اسلام کی بالادستی قائم کرنے اور مسلمانوں کے وقار کو بحال کرنے کی مسلسل کوشش کی۔ انھوں نے مسلمانوں میں بھی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور انھیں ماضی سے چپٹے رہنے کے بجائے جدید علوم حاصل کرنے اور عصر حاضر کے تقاضوں کو سمجھنے اور انھیں پورا کرنے کی تلقین کی۔ بقول مسٹر بینٹ:

"جمال الدین کی ذہانت اور جدت یہ تھی کہ انھوں نے اسلامی ممالک میں مغربی خیالات رکھنے والوں کی ذہنیت کی اصلاح کرنے کی کوشش کی اور اس امر کی تلقین و تبلیغ کی کہ اسلام کی موجودہ حالت پر نظر ثانی کی جائے اور بجائے ماضی سے لپٹے رہنے کے جدید علوم کے ساتھ پرانی تہذیب کے بدلنے کی تحریک کو آگے بڑھایا جائے۔"[1]

جمال الدین افغانی کے بارے میں حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا اصل وطن کیا ہے۔ ان کے سوانح نگاروں میں اس کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اُن کا تعلق ایران سے بھی تھا اور افغانستان سے بھی۔ ان کی شخصیت اتنی عظیم تھی کہ دونوں ملکوں کے باشندے انھیں اپنا بنانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ قاضی صاحب نے اس مسئلہ پر تفصیلی اور تحقیقی گفتگو کی ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے عربی، فارسی اور انگریزی کے دستیاب ماخذ کی ورق گردانی کی اور ان سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن کسی حتمی نتیجہ پر پہنچنے میں وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ انھوں نے صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ جمال الدین افغانی النسل تھے۔

دورِ اوّل: اسے قاضی صاحب نے 'دورِ انتظار' سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی حیثیت اصل موضوع کے پس منظر کی سی ہے۔ اس میں زیادہ زور اُس عہد کے افغانستان کے سیاسی حالات اور مختلف تحریکات پر ہے۔ اسی کے ساتھ ان حالات اور نظریات کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے جو افغانی کی زندگی اور افکار پر اثر انداز ہوئے۔

دورِ ثانی: کتاب کا یہ باب تقریباً ایک سو صفحات کو محیط ہے۔ اس میں جس عہد کا بیان ہے وہ ان کی عملی زندگی اور سیاسی سرگرمیوں کے عروج کا زمانہ ہے۔ اپنی تحریکات کے سلسلہ میں انھوں

---

[1] بحوالہ: آثار جمال الدین افغانی۔ ص ۸۳

نے مختلف ممالک کے دورے کیے اور وہاں کے عوام میں سیاسی اور مذہبی بیداری پیدا کی۔ ان ممالک میں مصر، ترکی اور ہندوستان وغیرہ شامل ہیں اُس زمانے میں یہ ممالک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور یہاں کے عوام ذہنی طور پر اتنے پست ہو چکے تھے کہ آزادی کی تحریک چلاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ افغانی نے ان ممالک کے دوروں میں عوام میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے ساتھ اُن میں آزادی کی لگن بھی پیدا کی۔ قاضی صاحب نے ان تمام واقعات کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے اور ان سے مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ بھی لیا ہے۔

دورِ ثالث و آخر : یہ حصہ بقیہ تمام حصوں سے زیادہ طویل اور مفصل ہے۔ یہ تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس زمانے میں ان کی سرگرمیاں نقطۂ عروج پر پہنچ کر فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھیں۔ اس دوران انھوں نے کثرت سے اسفار کیے۔ اور پوری دنیا میں اپنے پیغام کو عام کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس مرحلے پر انھوں نے جن مقامات کے دورے کیے ان میں ہندوستان، ایران، عراق، ترکی، انگلستان، فرانس، روس وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ قاضی صاحب نے ان ممالک میں افغانی کی سرگرمیوں کا تذکرہ ہی نہیں کیا بلکہ وہاں کی سیاسی صورت حال پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس کے تناظر میں جمال الدین افغانی کی مساعی کا جائزہ لیا ہے۔ اس بات کے مطالعے سے قاضی صاحب کی وسعتِ معلومات کا قایل ہونا پڑتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جمال الدین افغانی پر اردو، فارسی اور انگریزی میں جتنا بھی مواد ملتا ہے اُس میں آثارِ جمال الدین افغانی کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ قاضی صاحب نے بڑی کامیابی سے اس کتاب کی تالیف کی ہے، اور بڑی عمدگی و غیر جانبدارانہ انداز میں افغانی کے کارناموں کا جائزہ لیا ہے اور ان کی معاصر سیاسی تحریکوں پر سیر حاصل تبصرہ بھی لیا ہے۔

آثارِ ابوالکلام۔ ایک نفسیاتی مطالعہ : بمبئی نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلی کیشن ۱۹۴۹ء ۳۲۶ ص

(طبع ثانی بعد ترمیم و اضافہ)، دہلی، آزاد کتاب، ۱۹۵۸ء ۲۴۲ ص

یہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ - ۱۹۵۸) کا نفسیاتی مطالعہ ہے۔ اس نوع کے مطالعہ کے لیے چونکہ سوانحی حالات کا تذکرہ ناگزیر ہوتا ہے اس لیے ضمناً یا پس منظر کے طور پر مولانا

کے حالات زندگی بھی جستہ جستہ بیان کر دیے گئے ہیں۔

قاضی صاحب ابتداً مولانا آزاد سے کچھ زیادہ قرب حاصل نہ کرسکے اس لیے انھیں مولانا کی ہمہ گیر شخصیت کے اندر جھانکنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد دہلی میں جو قیامت صغریٰ گزری، اُس دوران قاضی صاحب کو مولانا کے ساتھ زندگی گزارنے کا موقع مِلا اور کافی عرصہ تک وہ مولانا کے خلوت و جلوت کے ہم جلیس رہے۔ اس زمانے میں انھیں مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے، انھیں پرکھنے اور انھیں سمجھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے مولانا کی نفسیات کا بڑے ہی قریب سے مطالعہ کیا اور اس کے نتیجہ میں وہ مولانا سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان پر ضخیم کتاب لکھ ڈالی۔ قاضی صاحب کو سب سے زیادہ مشکل اسی کتاب کو لکھنے میں پیش آئی اِس لیے کہ مولانا پر قلم اٹھانا آسان کام نہیں ہے۔ مولانا کی عظمت کا نقش قاضی صاحب کے دل و دماغ پر اتنا گہرا تھا کہ ان پر لکھنے کے لیے انھیں بڑی کاوش کرنی پڑی۔ اس کا اعتراف خود قاضی صاحب نے اس کے دیباچے میں کیا ہے جس کا عنوان انھوں نے "کچھ اندیشہ، کچھ حقیقت" متعین کیا ہے لکھتے ہیں:

"کتنا مشکل کام ہے کسی بڑی شخصیت کا صحیح اندازہ کرنا اور اس سے بھی زیادہ مشکل ہے اُس اندیشہ کو دل سے نکالنا کہ کہیں ہم غلط اندازہ تو نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے جب ان اوراق کو لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو اس تردّد کو دل سے نہ نکال سکا۔ اِس تردّد کا اثر میری تحریر میں موجود ہے اور اِن اوراق کا مسودہ لکھ لینے کے بعد بھی میں نے کتنی دفعہ سوچا کہ اسے میز کی دراز ہی میں پڑا رہنے دوں! یہ لکھت لکھوائی تو تھی اس شوق نے کہ دیکھوں اس مشکل موضوع پر کچھ لکھا بھی جاسکتا ہے یا نہیں۔ لیکن اب جو لکھ چکا تو مجھے معلوم نہیں کہ کتنا میں نے درست لکھا، اور کتنا نادرست۔ ایسے لوگ جو مولانا سے کم و بیش واقف ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں، خدا جانے کیا کہیں گے، جب وہ میری اس جسارت کا مطالعہ کریں گے۔"

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد جو ہولناک واقعات پیش آئے، اُن سے ہر شخص واقف ہے۔ اس زمانے میں قاضی صاحب حیدرآباد سے ترک سکونت کر کے دہلی آئے اور جب کہیں قیام و طعام کی سبیل نظر نہ آئی تو مولانا آزاد کی رہائش گاہ پر پناہ لی۔ اور ۱۹۴۹ء تک وہ مولانا کے ساتھ ہی مقیم

رہے۔ اس دوران انھیں مولانا کی شخصیت کو سمجھنے اور ہر پہلو سے جانچنے اور پرکھنے کا نادر موقع ملا۔ کچھ اندیشہ کچھ حقیقت میں اس کی تفصیل بتاتے ہوئے قاضی صاحب لکھتے ہیں :

"آخر ۱۹۴۷ء میں سرزمین دہلی پر ایک قیامت برپا تھی میں حیدرآباد کی سکونت ترک کرکے یہاں آیا اس وقت سے آج تک زیادہ تر وقت حضرت مولانا کی مہمان نوازی سے مستفید ہونے میں گذرا۔ ۱۹۔ اکبر روڈ گویا میرا گھر بن گیا۔ اب مولانا کی ذات اور بھی زیادہ مرکز نظر ہوگئی۔ ان کی خاموش خلوت اور سنجیدہ جلوت (خلوت زیادہ اور جلوت کم) ہا نظر کے سامنے رہنے لگی۔ ہندوستان اور حیدرآباد نے افکار کو بہت منتشر کردیا تھا۔ اب ۱۹۔ اکبر روڈ کی خاموشی میں ان افکار کو از سر نو سمیٹنے کا موقع ملا۔ خیالات کی پھر شیرازہ بندی شروع ہوئی۔ لیلیٰ کے خطوط کے بعد ادبی کاوشوں کا راستہ بہت کچھ بدل گیا تھا اور پھر آثار جمال الدین افغانی کے بعد تو قلم نے اپنا رخ بالکل ہی بدل دیا۔ افغانی کو دیکھا نہ تھا، مگر ڈھونڈا تھا اور تھوڑا بہت پایا بھی تھا۔ لیکن اب کچھ ویسی ہی ایک جنس عزیز اپنے وطن میں بھی نظر سے دور نہ تھی۔ اس کے علمی مطالعہ کی تو مجھ میں نہ اہلیت تھی، نہ ہمت۔ البتہ نفسیاتی مطالعہ کا میدان میرے لیے کچھ ایسا تنگ بھی نہ تھا۔ گزشتہ ڈیڑھ سال کی خاموشی میں بہت کچھ دیکھتا رہا۔ سنتا رہا اور سوچتا رہا۔ وقتاً فوقتاً طبیعت پر مولانا کی سیرت کے کچھ نفسیاتی نقوش بیٹھتے رہے اور پھر گزشتہ چند ماہ کا دفعتاً ایسا ملا کہ میں نے کہا ع

آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی !

اس تناظر میں قاضی صاحب نے اپنے مشاہدہ اور مطالعہ کو ترتیب دیا اور مولانا کی شخصیت ان کے افکار اور سرگرمیوں کا بڑے معروضی انداز میں تجزیہ کیا ہے۔

'آثار ابوالکلام آزاد' کو قاضی صاحب نے بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ کا عنوان 'نقش اول' اور دوسرے کا 'نقش ثانی' متعین کیا ہے۔

نقش اول : اس حصہ میں اصلاً مولانا کی سیاسی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے لیکن چونکہ ان کے سلسلہ میں سوانحی واقعات کا بیان ناگزیر ہوتا ہے اس لیے ربط و تسلسل قائم کرنے کے لیے انھوں نے

مولانا کے اجداد، خاندان، ولادت، ابتدائی تعلیم اور دیگر اہم واقعات بھی بیان کیے ہیں۔ مولانا کی ولادت کا ذکر بڑے شاعرانہ انداز میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"۱۸۸۸ء کے ماہ ستمبر کا ایک دن تھا۔ شہر مکہ کے باب السلام کے جوار میں مولانا شیخ محمد خیرالدین دہلوی کا بلند اقبال بیٹا پیدا ہوا۔"

مولانا کی تعلیم کے بارے میں قاضی صاحب نے ارشاد کیا ہے کہ اس کی تکمیل جامعۂ ازہر میں ہوئی۔ اس کے متعلق وہ اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں :

"ان کی ذہنی نشو و نما میں اگر ان کی طالب علمانہ زندگی بھی کسی حد تک معاون ہوئی تو وہ غالباً جامعۂ ازہر کی علمی صحبتوں کا نتیجہ ہوگا جہاں اُس زمانے میں جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہٗ کے نقوشِ قدم سے علماء اور طلبا، وسیع النظری اور اجتہاد صالح کی ایک نئی روشنی حاصل کر رہے تھے۔"

اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مولانا آزاد نے جامعۂ ازہر میں تعلیم حاصل نہیں کی خود مولانا نے India Wins Freedom میں اس کی تردید کردی ہے۔ لیکن جس زمانہ میں قاضی صاحب نے آثارِ ابوالکلام لکھی اُس زمانے میں یہی خیال عام تھا کہ مولانا نے جامعۂ ازہر میں تعلیم حاصل کی۔

یہ سب واقعات قاضی صاحب نے محض سلسلۂ کلام قائم کرنے کے لیے بیان کیے ہیں۔ اصل حصہ ۱۹۰۳ء سے شروع ہوتا ہے جب مولانا نے 'لسان الصدق' جاری کیا اور انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے جلسے میں پہلی بار شرکت فرمائی۔ اس کے بعد تمام تر اُن کی سیاسی سرگرمیوں کا تذکرہ ہے۔ یہاں قاضی صاحب نے بے جا طول کلامی سے حتی الامکان اجتناب کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھیں اس حصہ میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے اور وہ جلد از جلد اصل موضوع کی طرف چلے جانا چاہتے ہیں جس سے انھوں نے نقشِ ثانی میں بحث کی ہے۔ اس حصہ کو غیر ضروری طوالت سے بچا کر ہی قاضی صاحب اس میں دلچسپی برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

نقشِ ثانی : کتاب کا اصل حصہ یہی ہے۔ اس میں مولانا کی شخصیت کے نفسیاتی پہلو کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور ان کی سیاسی سرگرمیوں سے صرفِ نظر کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت خود قاضی صاحب

نے فرمادی ہے کہ نقش ثانی میں مولانا کی زندگی کے جس پہلو سے گفتگو کی گئی ہے وہ سیاسی سرگرمیوں کی آلودگی سے یکسر پاک ہے۔ قاضی صاحب کے خیال میں مولانا کی شخصیت کا یہ پہلو زیادہ دلکش اور زیادہ دلنواز ہے۔ قاضی صاحب کو اس بات کا اعتراف ہے کہ مولانا ایک انسان ہیں، فرشتہ نہیں۔ لہٰذا وہ خامیوں اور انسانی کمزوریوں سے منزہ اور مبرا نہیں لیکن ان کا یہ کمال ہے کہ یہ کمزوریاں بھی ان کی دلنواز شخصیت میں جذب ہو کر حسین اور پرکشش بن گئی ہیں۔ فرماتے ہیں:

"مولانا اگر فرشتہ ہوتے تو ان کی سوانح حیات بہت ہی مختصر ہوتی۔ دو لفظوں میں اسے ختم کر دیتا۔ لیکن وہ انسان ہیں اور انسان کے تمام کمالات اور اکثر کمزوریوں کو ساتھ لائے ہیں۔

ان کی بے پناہ انفرادیت میں ان کی انسانی کمزوریاں بھی ان کا کمال بن گئی ہیں۔"

اس حصہ میں قاضی صاحب نے مولانا کی تحریروں کے اقتباسات زیادہ پیش کیے ہیں اور ان کی مدد سے ان کی نفسیات کو سمجھنے اور واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان تحریروں میں سب سے زیادہ اقتباسات 'غبار خاطر' سے لیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے مولانا کی نفسیات کا مطالعہ کرنے میں غبار خاطر ہی سب سے زیادہ مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ مجموعی طور پر قاضی صاحب نے یہ تاثر پیش کیا ہے کہ مولانا کی انفرادیت عوام کی نفسیات سے اس قدر بلند ہے کہ عام انسان کی اس تک رسائی ممکن نہیں۔

حیاتِ اجمل: علی گڈھ۔ انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۵۰ء ۵۳۲ + ۱۶ ص

یہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے صف اول رہنما، دہلی کی گنگا جمنی تہذیب کے بہترین نمائندے مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب (۱۸۶۳ - ۱۹۲۷) کے سوانح حیات ہیں۔ حکیم صاحب انڈین نیشنل کانگریس کے رہنماؤں میں اعلیٰ اور ممتاز مقام رکھتے تھے۔ آپ نے 1921 میں کانگریس کے ۳۶ ویں سالانہ اجلاس منعقدہ احمد آباد کی صدارت بھی فرمائی تھی۔ اس وقت تک ملک کے ممتاز رہنماؤں میں گاندھی جی، نیتاجی سبھاش چندر بوس، پنڈت موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، ڈاکٹر راجندر پرشاد، سردار پٹیل وغیرہ میں سے کسی کو بھی یہ اعزاز نصیب نہیں ہوا تھا۔ گاندھی جی اپنے بڑے بھائی کی طرح حکیم صاحب کا ادب و احترام کرتے تھے۔

قاضی صاحب نے حکیم صاحب کی شخصیت اور ان کے گوناگوں کارناموں کو بڑی محنت اور

جانفشانی سے قلم بند کیا ہے۔ قاضی صاحب نے ایک طویل عرصہ تک حکیم صاحب کے ساتھ کام کیا ہے۔ اس لیے انھیں حکیم صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اس لیے حکیم صاحب کے سوانح لکھنے کے لیے غالباً قاضی صاحب سے زیادہ موزوں کوئی اور شخص نہیں ہوسکتا تھا۔

زیرِ نظر تالیف میں قاضی صاحب نے حکیم صاحب کے سوانحی حالات بیان کرنے کے ساتھ ان کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ بھی کیا ہے اور ان کے سیاسی کارناموں کو اس عہد کے تاریخی و سیاسی پس منظر میں پیش کیا ہے تاکہ حکیم صاحب کے کارناموں، بالخصوص سیاسی بصیرت کا صحیح تناظر میں تعین کیا جا سکے۔ کتاب کے مقدمے میں خود قاضی صاحب نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔ لکھتے ہیں:

"اس کتاب کی ترتیب میں، جو سوانح بھی ہے اور ایک حد تک ہندوستان کے ایک دور کی سیاسی تاریخ بھی، میں نے تاریخی واقعات کے چوکھٹے میں حکیم صاحب کی تصویر اس طرح لگائی ہے کہ جو کوئی ان کی زندگی کے حالات پڑھے۔ وہ اس زمانے کے سیاسی ماحول سے بھی واقف ہوتا جائے۔ یہ دور مہاتما گاندھی کی قیادت کا دور تھا جس میں مہاتما جی کے حلقہ میں ملک کے جانباز فدائیوں کا ایک نورتن جمع ہو گیا تھا۔ اس نورتن میں سوائے حضرت مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کے اب کوئی باقی نہیں ہے۔ اگر اس زمانے کے ان تمام لیڈروں کی سوانح حیات مرتب ہو جائے جو مہاتما جی کے ساتھ کام کر رہے تھے، تو وہی تحریک آزادی کی تاریخ ہوگی اب قیادت کے اس نئے دور کا بڑا المیہ یہ ہے کہ گزرے ہوئے دور کی روایات کی حفاظت کرنے والا بھی سوائے پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور مہاتما جی کے دو چار اور ساتھیوں کے کوئی نظر نہیں آتا۔ آزادی کی صبح کا آفتاب کتنا دھندلا ہے!!"

مکمل کتاب کو مصنف نے سہولت کی خاطر حسبِ ذیل دس حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) تاریخی پس منظر (۲) نمودِ صبح (۳) دورِ اوّل (۴) دورِ ثانی
(۵) دورِ ثالث (۶) نصف النہار (۷) دورِ آخر (۸) سفر کی آخری منزل

(۹) آخری شام (۱۰) حکیم صاحب ایک انسان کی حیثیت سے۔

تاریخی پس منظر میں قدیم زمانے سے لے کر موجودہ عہد تک دہلی کی سیاسی تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے اور پھر اسی تسلسل میں حکیم صاحب کے مورثِ اعلیٰ کے ہندوستان میں آمد کا تذکرہ ہے۔ فرماتے ہیں:

"ملا علی خاں اور خاندان شریفی کے مورثِ اعلیٰ بابر کے ساتھ ۱۵۲۶ء کے لگ بھگ ہندوستان آئے۔ اس حقیقت پر سب سے بڑی سند حکیم محمد اعظم خاں کی ایک تحریر ہے جو اُن کے قلم سے ایک خاندانی کتاب کے مسودہ میں ہمیں ملی ہے۔"

اس حصہ کی زبان اور اسلوب بیان پر افسانوی انداز حاوی ہے۔ یہ اسلوب سوانح جیسے سنجیدہ موضوع کے مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اسی لیے ناقدینِ ادب نے اس کو ہدفِ تنقید بنایا ہے

نمودِ صبح: حیات اجمل کے اس دوسرے حصہ میں حکیم صاحب کی ولادت اور ان کی ابتدائی زندگی کے حالات اور ان کی تعلیم و تربیت کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ لیکن اس حصہ کو انھوں نے سرسری طور پر لکھا ہے اور کوئی توجہ صرف نہیں کی ہے۔ اس کی حیثیت تو اصل موضوع کے پس منظر کی سی ہے۔

دورِ اوّل: اس باب میں حکیم صاحب کی مختلف الجہات مصروفیتوں کا تذکرہ ہے اور ان کی طبیہ کالج کے قیام سے متعلق جدوجہد نیز سیاسی سرگرمیوں کی تفصیلات ہیں۔ حکیم صاحب کے نواب حامد علی خاں صاحب والی رامپور سے خصوصی مراسم تھے۔ حکیم صاحب نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ ریاست رامپور سے وابستہ رہ کر گذارا اور زندگی کا چراغ بھی رامپور ہی میں گُل ہوا۔ قاضی صاحب نے اسی لیے حکیم صاحب کے رامپور سے روابط پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور بہت سے ایسے واقعات بیان کیے ہیں جن کا علم سوائے قاضی صاحب کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ اُس عہد کے اہم سیاسی واقعات مثلاً قیام مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی کی تحریک، شملہ وفد، شورش بنگالہ اور انگریز حکومت کے خلاف کانگریس کی تحریکات وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔ یہ تمام واقعات نہ صرف حکیم صاحب کی بلکہ پوری قوم کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

دورِ ثانی: یہ دور ۱۹۱۰ء کے لگ بھگ شروع ہوتا ہے اور ۱۹۱۸ تک جاری رہتا ہے۔

سیاسی طور پر ہندوستان کے لیے یہ دور بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس زمانے میں ملک کے سیاسی حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے۔ مسلم لیگ کا قیام عمل میں آچکا تھا اور رفتہ رفتہ اسے استحکام حاصل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اُس نے فرقہ وارانہ رُخ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسی لیے کانگریس سے اس کے اختلافات شدید ہوتے جا رہے تھے۔ ۱۹۱۶ میں میثاق لکھنؤ بھی اس خلیج کو پاٹنے میں ناکام رہا تھا۔ اس کے اس رویے کے سبب قوم پرور مسلمان بدظن ہو کر اس سے علیحدگی اختیار کرنے لگے تھے۔ حکیم اجمل خاں صاحب بھی ابتدأ مسلم لیگ کے ہمنواؤں میں تھے لیکن جیسے جیسے انھیں یہ احساس ہوتا گیا کہ وہ تنگ نظری اختیار کرتی جا رہی ہے تو دیگر مسلم رہنماؤں کی طرح حکیم صاحب نے بھی خود کو مسلم لیگ سے علیحدہ کر لیا۔ دراصل فرقہ وارانہ سیاست حکیم صاحب کے مزاج سے کسی طرح بھی میل نہیں کھاتی تھی۔ آپ نے تادم زیست فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں بے حد عزت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ قاضی صاحب نے اِن تمام حالات پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے حکیم صاحب کے سیاسی رویے میں تبدیلی کا جائزہ لیتے ہوئے درست لکھا ہے:

"۱۹۱۰ کے اجمل خاں ۱۹۱۸ میں اپنی ابتدائی منزل سے بہت دور نکل چکے تھے۔ اور وہی اجمل خاں جو ۱۹۱۰ میں علماء کو حکومت کی تائید کا مشورہ دے رہے تھے، ۱۹۲۰ء میں جماعت علماء کو قومی جنگ میں شریک ہو کر حکومت کا مقابلہ کرنے کی دعوت دینے لگے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حکیم صاحب ہی وہ شخص تھے جنھوں نے جنگ آزادی میں علماء کی جماعت کو شریک کرایا۔ اس کا آغاز وفاداری سرکار سے ہوا اور انجام تلقین بغاوت سے! اس انقلاب میں بڑا حصہ خود حکومت کے طرز عمل کا تھا جس سے حکیم صاحب جیسے صحیح احساس رکھنے والے صلح نہ کر سکتے تھے۔"

مذکورہ بالا اقتباس کا یہ حصہ کہ "اس میں کوئی شک نہیں کہ حکیم صاحب ہی وہ شخص تھے جنھوں نے جنگ آزادی میں علماء کی جماعت کو شریک کرایا" تاریخی اعتبار سے درست نہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حکیم صاحب کے سیاسی افق پر نمودار ہونے سے بہت پہلے ہی علماء آزادی کی لڑائی شروع کر چکے تھے۔ اس کے ثبوت میں تحریک دیوبند کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

دورِ ثالث : اس باب کا سب سے زیادہ افادی پہلو یہ ہے کہ اس میں عالمی سیاست کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور ان تمام واقعات اور تحریکات کے پس منظر میں ہندوستان کی سیاسی صورت حال پر روشنی ڈالی گئی ہے اور پھر اس بین الاقوامی نیز ملکی سیاست کے تناظر میں حکیم صاحب کی سرگرمیوں پر تبصرہ کر کے ان کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے۔ اس بات کی ابتداء ہی اس تجزیے سے ہوئی ہے:

"۱۹۱۲ میں نہ صرف حکیم صاحب کی زندگی بلکہ تمام دنیا کا نیا دور شروع ہو رہا تھا۔ مغربی تہذیب و سیاست کے بارود خانے میں پہلی چنگاری گرنے ہی والی تھی کہ ۱۹۱۱ میں افریقہ میں اٹلی کی قزاقی نے مسلمانان عالم کو ایک سخت جھٹکا دیا اور خوابیدہ قوتیں کچھ کچھ بیدار ہونے لگیں۔ بے محل نہ ہوگا اگر مختصر الفاظ میں اس بیداری کا تاریخی پس منظر پیش کر دیا جائے۔ وہی پس منظر حکیم صاحب کی زندگی کا ہے اور سامراج کے خلاف ۱۹۱۲ سے شروع ہوا۔"

اس کے بعد عرب دنیا اور مسلم ممالک کے سیاسی حالات، تحریکات، ان کی زبوں حالی اور ان پر یورپ کے تسلط کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس ضمن میں محمد بن عبدالوہاب کی وہابی تحریک وسطی ایشیا میں فرقہ نقشبندی کی تحریک، ترکی کی جنگ کریمیا، الجزائر پر فرانس کا تسلط، مصر پر برطانیہ کی بالادستی، چین اور ترکستان میں عام لوگوں کی بے چینی، ۱۹۰۴ء میں جاپان کی شکستِ فاش، ایران پر روس اور برطانیہ کا غلبہ (۱۹۱۱ء)، مغربی و ایشیائی ممالک میں سیاسی قلع بازیاں اور مسلم ممالک کو غصب کرنے کی ان ممالک کی کوششیں، ان تمام واقعات و حادثات کا مختصر لیکن جامع بیان اس حصہ کے ابتدائی چار صفحات میں کیا گیا ہے۔ اہل مغرب کی ان فریب کاریوں اور غاصبانہ عزائم کا تجزیہ کرتے ہوئے قاضی صاحب نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ ان واقعات سے نہ صرف ہندوستان کے مسلمان متفکر تھے بلکہ ہندو بھی فکر مند تھے،

"اس لیے کہ وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ مشرقی ممالک پر سامراجی اقوام کے اقتدار کا پہلے سے زیادہ قایم ہونا ہندوستان کی زنجیروں کو زیادہ مضبوط کر دے گا۔"

نصف النہار : قاضی صاحب نے گزشتہ کسی باب میں زمانے کا تعین نہیں کیا ہے اور یہ قاری پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ خود اس کا تعین کریں۔ لیکن اس باب کو انھوں نے واضح طور پر ۱۹۱۸

سے ۱۹۲۴ کے واقعات تک محدود رکھا ہے ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب عالمی سطح پر تباہی مچی ہوئی تھی ہندوستان بھی خود کو ان اثرات سے محفوظ نہیں رکھ پا رہا تھا پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کا یہی زمانہ ہے۔ ادھر ہندوستان میں نت نئی تحریکیں جنم لے رہی تھیں اور ان کو دبانے اور کچلنے کے لیے حکومت نے ظلم اور ستم کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اسی کے ساتھ ملک میں فرقہ وارانہ صورت حال بھی تشویشناک ہو گئی تھی ۔ ان حالات میں حکیم صاحب کی شخصیت کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اس لیے کہ آپ کو ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کا مکمل اعتماد حاصل تھا۔ قاضی صاحب کا فرمانا ہے کہ اس زمانے میں حکیم صاحب دہلی کے بے تاج کے بادشاہ بنے ہوئے تھے ۔ اس دور کو ہم حکیم صاحب کی زندگی کا سنہری دور کہہ سکتے ہیں ۔

دورِ آخر : یہ باب ۱۹۲۵ کے حالات کے جائزے سے شروع ہوتا ہے اور ۱۹۲۷ میں حکیم صاحب کی وفات تک کے واقعات کو محیط ہے ۔ اس زمانہ میں حکیم صاحب کی زیادہ تر کوششیں ہندو مسلم اتحاد پر مرکوز رہیں لیکن حالات اتنے زیادہ ناگفتہ بہ ہو چکے تھے کہ باوجود انتہائی کوشش کے حکیم صاحب کو اپنے مشن میں کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی ۔ اس باب کے شروع میں ایک ذیلی عنوان ' ایک پرچھائیں ' قائم کر کے قاضی صاحب نے حکیم صاحب کی نفسیات کا تجزیہ کیا ہے ۔ اس میں ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے میں ناکامی کا جائزہ لیتے ہوئے قاضی صاحب لکھتے ہیں :

> " ۱۹۲۴ء کا آخری مہینہ دہلی کے قرب و جوار میں سیلاب زدہ لوگوں کی خدمت میں صرف ہوا ۔ اس سے فراغت ملی تو حکیم صاحب پھر اس پرچھائیں کے پیچھے دوڑنے لگے جو اُن کی زندگی کا سہارا تھی ۔ جہاں بھی وہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوئی ذرا سی حرکت دیکھ لیتے تھے ، بے اختیار اسی سمت میں چل پڑتے تھے ۔ لیکن ۱۹۲۵ کے آغاز میں ہندوستان کی متحدہ قومیت کا جسد بے جان اب مسیح الملک کی مسیحائی کا بھی اہل باقی نہ رہا تھا ۔ . . . ملک کے انتشار کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف تو خود کانگریس کے اندر سوراجیوں اور تارکینِ موالات کی کشمکش باقی تھی اور دوسری طرف کونسلوں میں سوراجیوں اور حکومت کے درمیان رسہ کشی ہو رہی تھی ۔ "

ان حالات سے حکیم صاحب بہت دل برداشتہ رہے ۔ اور بقول قاضی صاحب :

"دسمبر میں بمقام گوہاٹی کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا لیکن حکیم صاحب اپنی طبیعت کی افسردگی اور صحت کی خرابی کی وجہ سے اس میں شریک نہ ہو سکے تاہم انھوں نے ایک پیغام بھیج دیا جس میں پھر ایک دفعہ فرمایا کہ:

اگر کانگریس نے اسے ایک اہم مقصد سمجھ کر ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوئی راہِ عمل پیدا نہ کی تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ آپ کا سارا پروگرام خواہ وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، بیکار رہے گا۔

اُن کے دل کے ساز سے جس کے بہت سے تار ٹوٹ چکے تھے، وہی ایک آواز ہر دفعہ نکلتی تھی اور وہی ایک تخیل تھا جو مجروح ہو کر بھی زندہ تھا۔ ہندو مسلم اتحاد ان کی سیاسی زندگی کی ساری تفسیر تھی۔ یہی حاشیہ تھا اور یہی متن تھا لیکن جس وقت وہ کانگریس کو متنبہ کر رہے تھے کہ اگر ہندو مسلم اتحاد کی کوئی راہ پیدا نہ کی تو سارا پروگرام بیکار رہے گا۔ اُسی زمانے میں ہندو مسلم نفاق کا بدترین نتیجہ دہلی میں پیدا ہونے والا تھا یعنی ۲۳ دسمبر کو سوامی شردھانند قتل کر دیے گئے اور مذہبی جنون کی قربان گاہ پر ان کی جان قربان ہو گئی۔

حکیم صاحب اس واقعہ سے بے حد متاثر تھے ۔ ۔ ۔ بلاشبہ ان کی نظر میں اس سے بدتر واقعہ کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ اور ہندو مسلم نااتفاقی کا یہ وہ ثمر تلخ تھا جس کی تلخی اجمل خاں سے زیادہ کسی شخص نے محسوس نہ کی ہو گی۔"

۱۹۲۱ میں خلافت کے مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لیے حکومتِ برطانیہ کی دعوت پر ہندوستان سے ایک وفد انگلستان گیا تھا۔ اس وفد میں حکیم صاحب بھی شامل تھے۔ اور قاضی صاحب بھی بحیثیت سکریٹری اس وفد کے ساتھ گئے تھے۔ قاضی صاحب نے اس باب میں وفد کے دورے کا بھی ذکر کیا ہے اور حکیم صاحب کے روزنامچے سے طویل اقتباسات پیش کیے ہیں۔

سفر کی آخری منزل میں حکیم صاحب کی زندگی کے آخری سال کے احوال اور ان کی سیاسی مصروفیتوں کا تذکرہ ہے۔ قاضی صاحب کا خیال ہے کہ اس زمانے میں حکیم صاحب کو اپنی ناکامیوں کا احساس ہو گیا تھا اس لیے ان پر مایوسیوں کے بادل چھانے لگے تھے۔ انھیں اپنی

زندگی کا سب سے بڑا جھٹکا اُس وقت لگا جب وہ اپنی شدید خواہش اور مسلسل کوششوں کے باوجود ہندو مسلم اتحاد کو قایم نہ کر سکے۔ ۲۹ ردسمبر ۱۹۲۷ کو حکیم صاحب کا انتقال ہوا۔ اس کا تذکرہ قاضی صاحب نے بڑے جذباتی انداز میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"۲۹ ردسمبر کی صبح کو ۲ بجکر ۱۵ منٹ پر یہ بلند اقبال مسافر اپنی منزلِ حقیقی پر پہنچا اور دنیا کا یہ اولوالعزم قیدی زندگی کی تمام کلفتوں، آنسوؤں اور آہوں سے آزاد ہوکر اُس لازوال سکون مطلق میں تحلیل ہو گیا جہاں زندگی دایم اور لافانی ہے۔"

آخری شام: یہ صرف پانچ صفحات پر مشتمل ایک مختصر سا باب ہے۔ اس میں حکیم صاحب کے سفرِ حیات کے آخری دن کے چند واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ اس دن حکیم صاحب رامپور میں تھے۔ قاضی صاحب تمام دن اُن کے ساتھ رہے۔ شب میں ہی ان کو ٹھیک ٹھاک اور صحت مند چھوڑ کر آئے۔ لیکن چند ہی گھنٹہ بعد اچانک انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اُس دن کے واقعات بیان کرنے میں قاضی صاحب بڑے جذباتی ہو گئے ہیں اور یہ ایک بالکل فطری بات ہے۔

حکیم صاحب ایک انسان کی حیثیت سے: اس عنوان کے تحت قاضی صاحب نے اپنے ممدوح کی شخصیت کے داخلی اور معنوی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور بحیثیت مجموعی ان کے کردار کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیا ہے۔ اس تجزیے کی مدد سے قاضی صاحب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حکیم صاحب کے اندر ایک بہترین انسان کی تمام صفات موجود تھیں۔ لکھتے ہیں:

"مبالغہ آمیز مدّاحی سے قطع نظر ان کے اخلاق و فضایل کی فہرست بہت طویل ہے۔ کاغذ پر جو تصویریں کھینچی جاتی ہیں وہ عموماً ظاہری اعمال کی تصویریں ہوتی ہیں۔ روح کا عکس ان میں نظر نہیں آتا۔ آنکھوں نے اجمل خاں کو دیکھا، دل نے پہچانا مگر قلم اُن کی روحانیت کا خاکہ کھینچنے سے معذور رہا۔ اپنی معذوری کے اس اظہار کے بعد سوائے اس کے کیا کہوں کہ یہ داستان مکمل تو کیا، کافی بھی نہیں ہے۔

اجمل خاں کی روحانی اور اخلاقی زندگی کے بہت سے پرتو تھے جن کو اصطلاحی زبان میں ضبطِ نفس، استغنا، وسعتِ قلب، متانت، دردمندی، اخلاقی عظمت، فراست، عزتِ نفس، صبر و تحمل، خودداری، دماغی ہمہ گیری، محبت،

ہمدردی اور شگفتہ مزاجی سے تعبیر کر سکتے ہیں لیکن یہ اور ایسی ہی ہزاروں اصطلاحیں اجمل خاں کی نفسیات کی تشریح کے لیے ناکافی ہیں "

'حیات اجمل' کو اردو سوانحی ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ناقدینِ ادب نے اسے ایک کامیاب سوانح قرار دیا ہے۔ فراہمی مواد، حسنِ ترتیب اور طرزِ ادا نے عام لوگوں کو بے حد متاثر کیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا تھا:

"حکیم صاحب نئے ہندوستان کے بانیوں میں سے ہیں۔ وہ ایک بے مثال طبیب بے نظیر انسان اور ایک قابلِ قدر سیاسی رہنما تھے۔ ان کے یہاں ایک رچی ہوئی مشرقیت اور ہندوستان کے مشترک تمدن نے ان کے مزاج میں ایک نفاست شائستگی اور لطافت پیدا کر دی تھی . . . . قاضی صاحب نے 'حیات اجمل' لکھ کر اردو ادب کی بڑی خدمت کی ہے اور ایک قابلِ قدر کارنامے کا اس میں اضافہ کیا ہے . . . . حکیم اجمل خاں جیسے محب وطن، طبیب، سیاسی رہنما

اور قومی کارکن کی سوانح عمری میں اس دور کے ہندوستان کی جو تصویر جھلکتی ہے، اس سے کوئی سوانح نگار چشم پوشی نہیں کرسکتا . . . . . . وقت کی ہر اہم کروٹ کا جائزہ لیا ہے۔ اس طرح کتاب میں اتنا تاریخی مواد مل جاتا ہے کہ اس دور کی ذہنی زندگی کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے . . . . انھوں نے ایک دلکش اور دل نشین نقش تو تعمیر کر دیا مگر حکیم صاحب کی انسانیت اور انوکھے پن کو خاطر خواہ اجاگر نہ کر سکے۔" [1]

سفرنامے :

نقشِ فرنگ : یعنی اقصائے مغرب کی سیر کے دلآویز تاثرات۔ لاہور، دارالاشاعت پنجاب۔ ۱۹۲۴ - ۴۴۴ ص

---

[1] اردو ادب (سہ ماہی) جلد ۲ شمارہ ۲ (اپریل) ۱۹۵۲ء ص ۱۴۴

"دیارِ فرنگ کی سیاحت اور مدبرینِ مغرب کے ساتھ تبادلۂ خیالات: چند دلکش اشارات"

قاضی صاحب کی ادبی سرگرمیوں کا میدان رومانوی نثر اور سوانح نگاری ہے۔ سفرنامے ترتیب دینا اُن کا اصل میدان نہیں تاہم 'نقشِ فرنگ' لکھ کر انھوں نے اردو کے نثری ادب میں ایک اہم اضافہ کیا ہے۔

۱۹۲۱ء میں حکومتِ برطانیہ کی دعوت پر ہندوستان کا ایک وفد انگلستان گیا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد خلافتِ ترکی کے مسئلہ پر وہاں کے اربابِ اقتدار سے گفت وشنید کرنا اور اس مسئلہ کا قابلِ قبول حل تلاش کرنا تھا۔ یہ وفد سات افراد پر مشتمل تھا:

۱۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری ۲۔ حکیم اجمل خاں ۳۔ سیٹھ چھوٹانی۔

۴۔ ہز ہائی نس پرنس آغاخاں ۵۔ سید حسن امام ۶۔ مشیر حسین قدوائی۔

اور حکیم اجمل خاں صاحب کے ایما پر قاضی عبدالغفار بحیثیت سکریٹری وفد۔

اور جیسا کہ اُس وقت عام طور پر قیاس کیا جاتا تھا کہ وفد کو انگلستان میں کوئی کامیابی نہیں ملی کیونکہ حکومتِ برطانیہ اپنے موقف پر سختی سے قائم رہی اور کسی قسم کی رعایت دینے پر آمادہ نہیں ہوئی لہٰذا وفد کو مایوس ہونے اور کفِ افسوس ملنے کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ تاہم اس سے ادبی دنیا کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس کے طفیل ایک عمدہ سفرنامہ معرضِ وجود میں آگیا جس سے یورپ کے نہ صرف سیاسی حالات بلکہ وہاں کی معاشرت، مذہبی خیالات اور ہندوستان و ایشیا سے متعلق وہاں کے طبقۂ امرا، دانشوروں اور سیاسی رہنماؤں کے خیالات اور نظریات کا براہِ راست علم ہوجاتا ہے۔ یہ وفد ۴ فروری ۱۹۲۱ کو لندن پہنچا اور تقریباً ڈھائی ماہ بعد ۳۰ اپریل ۱۹۲۱ کو واپس ہوا۔ ہندوستان واپس آکر قاضی صاحب نے احباب کی فرمائش پر اس سفرنامے کو قلم بند کیا۔ اس کی 'تمہید کلام' میں اس ترتیب وتالیف کے محرکات پر اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالتے ہوئے قاضی صاحب لکھتے ہیں:

"جب میں ہندوستان سے روانہ ہوا تھا تو دوستوں نے چلتے چلتے تاکید کردی تھی کہ جو کچھ دیکھوں، قلم بند کرتا جاؤں۔ اور احباب کے لیے کوئی سوغات نہ لاؤں، تو کم از کم ایک سفرنامہ تو مرتب ہوجائے۔ مگر اس تین ماہ میں چند صفحات سے

زیادہ کچھ نہ لکھ سکا . . . . . اب جو لکھنے بیٹھا ہوں تو اس مسودہ کی ایک ایک سطر کٹھن ہے۔ دماغ میں اس سفر کے متعلق شاید چند ہی اجزائے پریشاں محفوظ ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں کہ ان کی شیرازہ بندی کر دوں۔"

قاضی صاحب نے اس سفر کے مشاہدات بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیے ہیں۔ ان کی تحریر میں محاکاتی انداز ہے جس کی وجہ سے مطالعہ کے دوران یہ محسوس ہوتا ہے گویا ہم خود اُس مقام کی سیر کر رہے ہیں۔

نقش فرنگ بڑی حد تک دوسرے سفر ناموں سے مختلف ہے۔ اس میں مطالعہ اور مشاہدہ کم اور قاضی صاحب کے تاثرات زیادہ ہیں۔ لندن کے علاوہ قاضی صاحب نے پیرس، روم، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کا بھی دورہ کیا تھا۔ اس طرح یہ سفر نامہ محض انگلستان کا نہیں بلکہ پورے اقصائے مغرب کے سیر کی داستان ہے۔ اس دوران وہاں کے ارباب اقتدار، دانشوران اور مدبرین سے قاضی صاحب اور وفد کے دیگر اراکین کی مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی اس کی تفصیل بھی ہے۔ اس طرح ہندوستان کے بارے بالخصوص اور دیگر ایشیائی ممالک کے بارے بالعموم یورپ کے اہل دانش کے خیالات کا بالتفصیل علم ہو جاتا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید نے صحیح لکھا ہے:

"قاضی صاحب کا سفر نامہ نقش فرنگ اقصائے مغرب کی سیر، دیار فرنگ کی سیاحت اور مغرب کے مدبرین سے تبادلۂ خیالات کی تفصیل پیش کرتا ہے اور اس میں نظر افروزی کم اور عبرت انگیزی زیادہ ہے۔ ۱۹۲۱ء میں برطانوی حکومت نے تحریک خلافت اور مسایل مشرقیہ کے بارے میں مشورے کے لیے سرکاری طور پر ہندوستان سے تحریک خلافت کے رہنماؤں کا ایک وفد طلب کیا تھا۔ قاضی عبدالغفار اس وفد میں شامل تھے۔

قاضی صاحب نے مغربی زندگی کی عملی صورت کو مشرقی تصور کے مطابق دیکھنے اور اپنی مرصع زبان میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ سفر نامہ ایسی معلومات کا پشتارہ نظر نہیں آتا جو سفری کمپنیاں اپنے مسافروں کی رہنمائی کے لیے مرتب

کرتی ہیں۔ قاضی صاحب نے لفظی نقاشی کرنے کے بجائے اس سفرنامے میں اپنے احساسات کو وفورِ استعجاب سے قلم بند کیا ہے۔ چنانچہ یہ سفرنامہ نہ صرف قدیم روایت سے انحراف کرتا ہے، بلکہ ایک ایسا سنگ میل ہے جو اردو سفرنامے کو نئی جہت سے آشنا کرتا ہے۔

وفدِ خلافت کو گول میز کانفرنس سے ناکامی اور نامرادی کے سوا اور کچھ نہ ملا۔ مایوسی کا یہ تاثر قاضی صاحب کے سفرنامے کے اولین حصے پر بری طرح چھایا ہوا ہے۔ بعض مقامات پر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کے داخل کی مایوسی گرد و پیش کے پورے منظر کو دھندلا اور آلودہ کر رہی ہے اور یہ سفرنامہ آنسوؤں کے دھارے کو بمشکل روک رہا ہے۔

'نقشِ فرنگ' ایک رومانی ادیب کا سفرنامہ ہے۔ یہ لیلیٰ کے خطوط سے پہلے کی تصنیف ہے لیکن وہ تخلیقی رومانیت جو لیلیٰ کے خطوط کا قیمتی عنصر ہے، اس سفرنامے میں بھی مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔" [1]

متفرقات:

اُس نے کہا:	لاہور،	دارالاشاعت پنجاب	۱۹۳۵
	لاہور،	دارالاشاعت پنجاب	ب ات
	لاہور،	اردو اکیڈمی	۱۹۴۳ ۱۲۸ ص

یہ عربی کے مشہور مصنف خلیل جبران کی تالیف 'النبی' کا آزاد ترجمہ ہے۔ اس کا انگریزی میں بھی The prophet کے عنوان سے ترجمہ ہو چکا ہے۔ قاضی صاحب عربی زبان سے زیادہ واقف نہ تھے اس لیے گمان غالب یہ ہے کہ اس کا بنیادی خیال انھوں نے انگریزی ترجمہ سے اخذ کیا ہے۔

قاضی صاحب کا اسلوب خلیل جبران کے اسلوب سے بہت مماثلت رکھتا ہے۔

---

[1] اردو میں سفرنامہ۔ لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۱۹۸۷ء

دونوں کے یہاں چھوٹے چھوٹے جملے، مختصر پیراگراف، بیچ بیچ میں طویل ملاماتِ فصل، ہلکی پھلکی، سلیس رواں اور شگفتہ زبان بڑی مماثلت رکھتے ہیں۔ یہ ان دونوں کی تحریروں کی منفرد اور دل کش خصوصیات ہیں۔ "النبی" میں بھی خلیل جبران کا یہ منفرد اسلوب نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔
اس میں جن موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے، ان کے بین السطور مصنف کا جو مقصد ہے اور اس مقصد کو اس نے جس حسین اسلوب میں ادا کیا ہے، اُس نے قاضی صاحب کو بے حد متاثر کیا ۔انھوں نے اس پیغام کو عام کرنے کے لیے اُتنے ہی حسین انداز میں اسے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ سوال و جواب کی شکل میں ہے۔ اس میں لوگ حضرت مسیح علیہ السلام سے سوالات کرتے ہیں اور وہ ان کا تفصیلی جواب دیتے ہیں۔ یہ سوالات انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ہیں اور عقل و دانش، داد و دہش، اچھائی و برائی، عیش و آرام، خوشی و غم، مسرت و شادمانی، محبت و نفرت کی ماہیت اور اس کے ثمرات، متاہلانہ زندگی، اولاد، جرم و سزا، انصاف، قانون، غلامی و آزادی، گفتار و کردار، تعلیم و تربیت، درس و تدریس، حسن و جمال، مذہب اور فلسفۂ اخلاق وغیرہ جیسے اہم اور بنیادی موضوعات کو محیط ہیں۔ حضرت مسیحؑ نے ان تمام پہلوؤں پر اظہار خیال کر کے سوال کرنے والوں کے لیے مکمل تسکین کا سامان فراہم کیا ہے۔
ترجمہ کی زبان انتہائی سادہ، دلکش اور رواں ہے۔ اس بناء پر ناقدین نے اسے ادب لطیف میں اعلیٰ مقام پانے کا مستحق قرار دیا ہے۔ قاضی صاحب نے اس کے ذریعہ یہ حقیقت بھی روشن کر دی ہے کہ انشائے لطیف محض تفننِ طبع اور وقت گذاری کا وسیلہ ہی نہیں بلکہ افادیت اور مقصدیت شامل ہو جانے پر یہ اصلاح کا ایک موثر ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ اپنی بات کو واضح کرنے اور اسلوب کو موثر بنانے کی خاطر جگہ جگہ تمثیلوں سے بھی کام لیا ہے اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کہدی ہیں۔ مثال کے طور پر چند مثالیں ملاحظہ ہوں :
محنت کے بارے میں حضرت مسیح فرماتے ہیں :

"جب تم محنت کرتے ہو تو بانسری بن جاتے ہو ـــــ جس سے قلب سے نکلی ہوئی ساعت شماری کی آواز ایک لازوال موسیقی بن کر حیاتِ انسانی پر چھا جاتی ہے۔"

اسی طرح غم اور مسرت کے باہمی رشتہ کے متعلق وہ فرماتے ہیں:

" کیا وہ پیالہ جو تمھاری شراب سے لبریز ہے، وہی پیالہ ہے جو کمھار کے آوے میں جلایا گیا تھا۔ اور کیا وہ بانسری کا نغمہ تمھاری روح کو سکون دیتا ہے، بانس کا ٹکڑا نہیں ہے جس کا مغز چاقو سے کھود کر نکالا گیا تھا اور جس کا سینہ چھری سے کریدا گیا تھا۔"

اسی طرح ایک جگہ موت کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

" تم راہ بھی ہو اور راہ رو بھی ہو۔

اور جب اس جلوس میں سے کوئی شخص ٹھوکر کھا کر گرتا ہے تو وہ دوسروں کو اسی طرح خطرے سے آگاہ کر دیتا ہے جس طرح راستے میں پڑا ہوا پتھر ——— اور اگر اس گرنے والے کو اس کے تیز قدم ساتھی نہیں اٹھاتے اور گرا ہوا چھوڑ جاتے ہیں۔

تو وہ نادانستہ بعد کے آنے والوں کے لیے ایک سنگِ راہ چھوڑ جاتے ہیں۔"

جرم اور سزا کے بارے میں یہ حسین اقتباس اور ملاحظہ ہو:

" اور یہ سُن لو ——— خواہ میرے الفاظ تمھارے دلوں میں کتنے ہی گراں گزریں ——— کہ مقتول اپنے قتل کے جرم میں خود بھی شریک ہوتا ہے۔

اور جو کوئی لوٹا گیا ہے وہ خود بھی اپنی تباہی کے الزام سے بری نہیں ہے۔ پاکباز اور بے گناہ مجرم اور گناہ گار کے افعال کی ذمہ داری میں ضرور شریک ہیں۔ اور کوئی نیکوکار نہیں جس کے ہاتھ بدکاروں کی بدکاری سے ملوث اور آلودہ نہ ہوں۔

اسی طرح اکثر مجرم اُس شکار کا ہدف بنتا ہے جس کو وہ ایذا پہنچاتا ہے۔

اور اکثر وہی خطاوار جو سزا پاتا ہے جو بظاہر بے خطا ہوتا ہے اور معصوموں کی خطاؤں کا بوجھ بھی اٹھاتا ہے۔"

یہ ترجمے پہلے ماہنامہ 'نیرنگ خیال' میں بالاقساط شائع ہوا تھا۔ بعد میں کتابی شکل میں طبع ہوا۔ یہ کافی مقبول ہوا۔ اسی لیے جلد جلد اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔
